

ستمر نصیب



ملک صفدر حیات
(ریٹائرڈ ڈی ایس پی)

جرم و سزا اور تفتیش کی ناقابل فراموش کہانیاں
جو انسانی حرص و ہوس کا آئینہ ہیں

مستم الغیب

راوی ملک صفدر حیات (ریٹائرڈ ڈی ایس پی)
تحریر — حسام بٹ

مکتبہ التفتیش © سید سید
لکھنؤ، یو۔ پی۔ اے۔

اشاکسٹ



5	سیاہ کار
72	ہم چشم
135	برائے خلش
199	ستم نصیب

سیاہ کار:

بہت پرانی کہادت ہے۔ عورت چوہے سے ڈرتی ہے، چوہا مرغی سے۔ مرغی بلی سے اور بلی کتے سے۔ کتا مرد سے اور مرد عورت سے جب کہ عورت... چوہے سے۔ ڈرانے اور ڈرنے کا عمل کڑی درکڑی ایک زنجیر کی صورت جاری رہتا ہے۔ آج میں اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا جو واقعہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں یہ تمام کردار کسی نہ کسی شکل میں اس کا حصہ ہیں۔

ان دنوں میں ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے ایک دور دراز قصبے میں تعینات تھا۔ ایک روز میں اپنے کمرے میں بیٹھا روزمرہ کے امور نمٹا رہا تھا کہ مجھے بتایا گیا، کوئی فریادی عورت مجھ سے ملنے آئی تھی۔ میں نے اطلاع دینے والے کانسٹیبل سے پوچھا۔

”وہ عورت کون ہے اور کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتی ہے؟“

کانسٹیبل نے بتایا ”ملک صاحب! اس عورت کا نام عابدہ خانم ہے۔ نزدیکی گاؤں سے آئی ہے۔ اس کے ساتھ چودہ پندرہ سالہ ایک نوجوان لڑکا بھی ہے۔ وہ آپ کے پاس کسی کے خلاف رپورٹ درج کروانے آئی ہے۔ اس سے زیادہ اس نے کچھ نہیں بتایا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کانسٹیبل سے کہا ”تم ان دونوں کو اندر بھیج دو۔“

کانسٹیبل ”اچھا جی“ کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد عابدہ خانم نامی وہ عورت میرے سامنے موجود تھی۔ اس کی عمر پینتالیس چھیالیس سال کے قریب تھی۔ اس کے ساتھ جونیور جووان تھا اس کی عمر کے بارے میں کانسٹیبل کا اندازہ درست نظر آتا تھا۔ مذکورہ لڑکے کے سر پر کسی گھریلو کپڑے کی موٹی تازی پٹی بندھی ہوئی تھی۔

میں نے انہیں بیٹھنے کو کہا۔ وہ تھوڑی سی پچکپاہٹ کے ساتھ میری میز کے سامنے رکھی کرسیوں پر

بیٹھ گئے۔ میں نے سوالیہ نگاہ سے اس عورت کو دیکھا اور پوچھا۔

”عابدہ خانم! تم کس کے خلاف رپورٹ لکھوانے آئی ہو؟“

”وہ نامراد کوئی غیر نہیں، ہمارا اپنا رشتہ دار ہی ہے۔“ عابدہ نے زہریلے لہجے میں جواب دیا۔ ”صدیقہ“ میرے گھر والے کا بھانجا لگتا ہے تھا نے دار صاحب۔ اسی شیطان نے میرے امتیاز کو مارا ہے۔ اندرونی چوٹیں تو رہیں ایک طرف یہ دیکھیں ”اس نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے لڑکے کے سر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ”صدیقہ“ تو میرے بچے کا سر بھی بھاڑ دیا ہے۔ بڑی مشکل سے خون رکھا ہے۔ میں محمد صدیق عرف صدیقہ کے خلاف رپورٹ درج کروانے آئی ہوں۔“

اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے سوال کیا ”صدیقہ“ نے تمہارے بیٹے امتیاز کو کس بات پر مارا ہے؟“

جواب دینے کے بجائے عابدہ نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا ”تا“ تھا نے دار صاحب! آپ ہی بتائیں... سچ بولنا اور سچی بات سب کے سامنے کہنا کوئی جرم ہے؟“

میں نے کہا ”نہیں یہ کوئی جرم نہیں۔“

”یہی تو میں بھی کہتی ہوں۔“ وہ اتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی ”لیکن کوئی میری بات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ میرے لاڈلے بچے نے تو ایک سچی اور کھری بات کی تھی جس پر صدیقہ نے اس بے چارے کو بری طرح مارا اور سر بھاڑ دیا۔“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ”تھا نے دار صاحب! آپ رپورٹ درج کر کے صدیقہ کے خلاف فوراً کارروائی کریں۔“

عابدہ خانم جس گاؤں سے تعلق رکھتی تھی وہ میرے تھا نے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس کی باتوں سے میں نے یہ تو اندازہ لگا لیا تھا کہ ان کے بچہ کوئی باہمی خاندانی تنازع جھگڑے کا باعث ہو گا تاہم میں نے اس کے منہ سے حقیقت جاننا ضروری سمجھا اور پوچھا۔

”عابدہ! تم نے ابھی تک یہ تو بتایا ہی نہیں کہ تمہارے بیٹے نے ایسی کون سی کھری اور گستاخاں بات کہہ دی تھی جس پر اسے اپنے بھوپلی زادے مار کھائی پڑی؟“

بات ختم کر کے میں نے سوالیہ نگاہ سے عابدہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے امتیاز حسین کو بھی دیکھا۔ وہ جب سے آیا تھا خاموش بیٹھا تھا۔ اس نے ابھی تک ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا تھا۔ عابدہ خانم نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔

”تھا نے دار صاحب! بات یہ ہے کہ صدیقہ کی ماں آسیر کوئی اچھی عورت نہیں ہے۔“

اس کے لہجے میں اتنی بڑا اسراریت تھی کہ میں نے چونک کر پوچھا ”وہ کن معنوں میں اچھی عورت نہیں ہے؟“

”آسیرہ جادو ٹوٹنے کے چکروں میں پڑی رہتی ہے۔“ عابدہ نے بتایا۔

”پھر؟“ میں ہمدن گوش ہو گیا۔

وہ بولی ”آسیرہ“ نے پچھلے کئی ماہ سے ہماری زندگی اجیرن بنا دی ہے۔ وہ جادو ٹوٹنے کے مختلف ہتھ کنڈوں سے ہمیں پریشان کر رہی ہے۔ میری جوان جہان بیٹی چارپائی سے لگ گئی ہے۔ آسیرہ کی دشمنی کا اصل نشانہ تو میری بیٹی بتول ہی ہے۔ جادو کے اثرات نے اسے برے حال کو پہنچا دیا ہے۔ وہ ایک نامعلوم بیماری کا شکار ہو چکی ہے تھا نے دار صاحب! وہ ایک ٹھنڈی آدھ بھر کا خاموش ہو گئی۔

میں نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا ”آسیرہ کو آپ لوگوں سے کیا دشمنی ہے۔ وہ تمہاری بیٹی کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئی ہے؟“

اگرچہ مجھے اس کی جادو ٹوٹنے والی کہانی پر یقین نہیں آیا تھا تاہم اسی تناظر میں بات کرنا ضروری تھا۔ اس نے تھوک نچلتے کے بعد جواب دیا۔

”تھا نے دار صاحب! بات بہت چھوٹی سے تھی۔ آسیرہ اپنے بیٹے صدیقہ کی شادی بتول سے کرنا چاہتی تھی۔ اس شادی کے لیے بتول کا باپ منظور حسین بھی راضی ہو گیا تھا۔ لیکن میں کسی طرح تیار نہ ہوئی۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ میری بیٹی لاکھوں میں ایک ہے۔ صدیقہ اس کا پاسکو (پاسنگ) بھی نہیں ہے۔ وہ کسی بھی طرح میری حسین و جمیل بیٹی کے جوڑ کا نہیں ہو سکتا۔ دوسری اور سب سے اہم بات یہ کہ میں آسیرہ کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ وہ بہت جھگڑا لوار کمینہ فطرت عورت ہے۔ ہر وقت اسے سیدھے چکروں میں مصروف رہتی ہے۔ وہ میری ننانا (نند) ہے۔ مجھ سے زیادہ اسے کون جان سکتا ہے وہ تو میری بچی کا جینا عذاب کر دیتی۔“ ایک لمحے کو روک کر اس نے سانس درست کی اور بولی ”چنانچہ میں اپنی بات پر ڈٹی رہی۔ آخر کار میرا گھر والا بھی اس رشتے سے انکار پر تیار ہو گیا۔ جب آسیرہ کی سیدھی کوشش ناکام یاب ہو گئی تو اس نے الٹا راستہ اختیار کر لیا اور جادو کا سہارا لے کر اس نے میری بتول کو چارپائی سے لگا دیا ہے۔“

اس کی طویل وضاحت کے جواب میں میں نے استفسار کیا ”کیا آسیرہ بیگم بھی اسی گاؤں میں رہتی ہے جہاں سے تم آئی ہو؟“

اس نے اثبات میں جواب دیا ”ہاں جی وہیں رہتی ہے۔“

میں نے پوچھا ”تم نے بڑے دعوے سے بتایا ہے کہ تمہاری نند آسیہ جادوؤں کے چکر میں لگی ہوئی ہے اور تمہاری بیٹی بتول کی بیماری کا سبب بھی جادو ٹوٹا ہی ہے۔ کیا تمہارے پاس اپنے دعوے کا کوئی ثبوت بھی ہے؟“

”کس قسم کا ثبوت جی؟“ وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے کہا ”جادوؤں کا ثبوت؟“

”کئی ثبوت ہیں جی۔“ وہ ہر دھوکے لہجے میں بولی۔

”مثلاً؟“

اس نے میرے مثلاً کے جواب میں بتایا ”تھانے دار صاحب! جب ہم نے بتول کے رشتے سے چٹا انکار کر دیا اور آسہ یوس ہو کر چلی گئی تو اس کے چند روز بعد ہی بتول کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ رفتہ رفتہ اس کی بھوک پیاس اور نیند کم ہونے لگی۔ علاج معالجے سے اسے کوئی فائدہ نہ ہوا تو میں سمجھ گئی کہ بتول کی بیماری کوئی شے ہاتھ شامل ہے پھر مجھے اس کا ثبوت بھی مل گیا۔ ایک صبح ہم سو کر اٹھے تو گھر کے دہڑے (صحن) میں ایک جادو ہمارا پڑا تھا۔“

عابدہ نے اتنا کہہ کر ایسی نظر سے مجھ دیکھا جیسے اس نے کوئی سر بستہ راز منکشف کر دیا ہو۔ میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

”صحن میں کسی مرے ہوئے چوہے کا ملنا کس بات کا ثبوت ہے؟“

”کالا جادو۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

میں نے کہا ”میں نے سنا ہے کہ اس قسم کے کاموں کے لیے کالی بی بی یا الو وغیرہ کو استعمال کیا جاتا ہے۔“

”جو ہا بھی بہت اہمیت رکھتا ہے تھانے دار صاحب!“ وہ عالمانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ میری جانب وہ اس انداز سے دیکھ رہی تھی جیسے اسے میرے تھانے دار ہونے پر افسوس ہو رہا ہے۔ اس کی داستان میں اتنے بے خبر شخص کو اس اہم عہدے پر نہیں ہونا چاہیے تھا جسے یہ بھی معلوم نہ ہو کہ جادوؤں کے عملیات میں جو ہا کیا اہمیت رکھتا ہے۔

میں نے کہا ”عابدہ! تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ صدیقانے کس بات پر تمہارے بیٹے کا سر پھاڑا ہے۔ تم جس سلسلے میں رپورٹ درج کروانے آئی ہو پہلے وہ کہانی تو مکمل کر لو!“

”میں اسی طرف آ رہی ہوں تھانے دار صاحب۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

بہ حالتِ مجبوری مجھے اس کی پوری بات سننا پڑی۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بتاتے گئی ”مردہ چوہے کو دیکھ کر میں یہ تو سمجھ گئی تھی کہ معاملہ کیا ہے۔ میرا شک فوراً آسیہ کی طرف گیا تھا کیوں کہ اس کے علاوہ ہمارا کوئی دشمن نہیں تھا۔ آئندہ چند روز بھی صبح دہڑے میں مردہ چوہا پڑا ملتا رہا پھر چند دنوں کے لیے یہ سلسلہ رک گیا۔ اس دوران میں بتول کی طبیعت ذرا سنبھل گئی تھی مگر اس بد قسمت کی مصیبت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ رکا ہوا سلسلہ پھر چل نکلا لیکن اس مرتبہ چوہے کی جگہ مرغی نے لے لی۔ آئے دن جب ہم صبح سو کر اٹھیں تو دہڑے میں ایک مردہ مرغی پڑی ملے۔ ہم کئی مردہ مرغیاں اٹھا کر گھر سے باہر پھینک چکے ہیں۔ تین دن پہلے مردہ مرغیوں کی جگہ ایک کالی بی بی مردہ حالت میں پڑی ملی ہے۔ اب آپ خود اندازہ لگا لیں یہ کالا جادو نہیں تو اور کیا ہے۔ ہم نے ایک عامل کامل سیانے کو بھی دکھایا ہے۔ اس نے پورے دھوکے سے کہا ہے کہ ہمارے گھر اور خصوصاً بتول پر سخت قسم کا سفلی عمل کیا گیا ہے۔“

میں نے پوچھا ”جس عامل کامل نے کالے جادو کا انکشاف کیا ہے اس کے پاس اس کا کوئی توڑ بھی ہوگا!“

”وہ کوشش کر رہا ہے۔“ عابدہ نے بتایا ”لیکن آسیہ نے بہت سخت قسم کا عمل کر دیا تھا اس لیے اس کے توڑ میں ذرا دقت پیش آرہی ہے۔“

اس سارے قصے کو میں نے تجزیاتی طور پر یوں لیا۔ اس گھر میں یا اس پاس کوئی کالی بی بی رہتی تھی جو چوہے اور مرغیاں وغیرہ کھاتی تھی جن کی ”لاشیں“ گاہے بگاہے عابدہ کے گھر کے صحن میں پائی جاتیں بالآخر ایک روز وہ کالی بی بی بھی اپنی طبعی عمر پوری کر کے چل بسی۔ عابدہ تو ہم پرستی میں واقعات کو غلط رنگ دے رہی تھی۔

میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے تسلی بخش لہجے میں کہا ”عابدہ خانم! سمجھو تمہاری مصیبت ختم ہو گئی۔ اب تمہاری بیٹی بتول بھی چنگی ہو جائے گی۔“

وہ بے یقینی سے مجھ دیکھتے ہوئے بولی ”تھانے دار صاحب! یہ سفلی عمل اتنی آسانی سے جان نہیں چھوڑتے۔ عامل بابا کہہ رہا تھا آگے چل کر اور مشکلات کا سامنا ہوگا۔“

میں سمجھ گیا ”وہ عامل کامل ان سادہ لوح لوگوں کو بے وقوف بنا کر اپنا دھند اچکا رہا تھا۔ میں نے کہا ”میں اس عامل سے ملوں گا۔ کیا نام ہے اس کا اور وہ رہتا کہاں ہے؟“

عابدہ نے بتایا ”عامل بابا کا نام ملنگ کا لیا ہے اور وہ ہمارے گاؤں ہی میں رہتا ہے۔ قبرستان

کے قریب اس کا آستانہ ہے۔ اس کے آستانہ کے نزدیک سے ریلوے لائن بھی گزرتی ہے؟“

میں نے ایسے ہی پوچھ لیا ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے“ آسیر نے اسی کا لیا ملنگ سے جادو ٹونا کروایا ہو؟“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی ”بالکل نہیں“ میں نے پوری طرح پتا لگا لیا ہے۔ آسیر کہیں اور سے سفلے کروا کر لائی ہے۔ اگر اس سلسلے میں ملنگ بابا کا ہاتھ ہوتا تو مجھے فوراً پتا چل جاتا۔ ملنگ بابا نے مجھے بتایا ہے کہ یہ اس سے بھی بڑے کسی عامل کامل کا کارنامہ ہے۔ جس کا تو ذکر کرتے ہوئے اس کی اپنی جان بھی جاسکتی ہے تاہم وہ اپنی ہی پوری کوشش کر رہا ہے۔“

مجھے یہ کہہ کر احمقانہ اور جاہلانہ سوچ پر افسوس بھی ہوا اور غصہ بھی آیا لیکن میں نے اپنے غصے کا اظہار کرنے کے بجائے قدر سے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

”تم بار بار احباب کو گول کر جاتی ہو جس کے سبب صدیقانے تمہارے بیٹے کو زخمی کیا ہے اور تم رپورٹ لکھوانے یہاں آتی ہو؟“

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی ”تھانے دار صاحب! آسیر کے کالے کرتوتوں نے ہمارے گھر میں مصیبتیں نازل کر دی ہیں۔ ہم بہت پریشان ہیں۔ آج کل ہم ایک مسلسل اذیت سے گزر رہے ہیں۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ اس موضوع پر آگئی ”کل کہیں امتیاز نے آسیر کے منہ پر جچی اور کھری بات کہہ دی تھی کہ وہ جادو گرئی ہے۔ نے کالے جادو کے زور پر ہمارے گھر کا سکون اور چین لوٹ لیا ہے۔ آسیر نے گھر جا کر اپنے بیٹے صدیق کو نہیں کیا۔ نکادہ امتیاز کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا اور جیسے ہی امتیاز اس کے ہاتھ لگا اس نے میرے گھر کو مارا پینٹا شروع کر دیا۔ صدیق طاقت ور اور عمر میں امتیاز سے بہت بڑا ہے۔ یہ بے چارہ مار کھاتا رہا اور سر پھڑوا کر گھر پس آ گیا۔“ اتنا کہہ کر وہ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے امتیاز حسین کی جانب بڑھی اور نے مخاطب کر کے ہوئے بولی ”تھانے دار صاحب! میں آپ کو دکھاتی ہوں۔ اس ظالم صدیقانے میرے بچے کے پر کیا کیا۔“

پھر وہ جلدی سے امتیاز کی پٹی کھولنے لگی۔

جب پٹی پوری طرح کھل گئی تو اس نے بیٹے کو میری جانب دھیرے سے دکھیل دیا ”جانتے رہا

تھانے دار صاحب کو اپنا سر تو دکھا۔“

میں نے امتیاز حسین کے سر کا یہ غور جائزہ لیا۔ واقعی اس کا سر ایک جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ زخم خاصا گہرا تھا تاہم اتنا بھی تشویش ناک نہیں تھا جتنی بڑی پٹی اس پر باندھی گئی تھی۔ شاید یہ واقعے میں شدت

پیدا کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔

سر کا معاملہ کروانے کے بعد امتیاز اپنی ماں کے پاس چلا گیا۔ وہ پٹی والا کپڑا دوبارہ اس کے سر پر لپیٹنے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئی۔

”تھانے دار صاحب! اب تو آپ نے اپنی آنکھوں سے میرے بیٹے کا زخمی سر دیکھ لیا ہے نا۔ ہمارے ساتھ آپ کو انصاف کرنا ہی پڑے گا۔ ہم تو پہلے ہی مصیبت کا شکار ہیں اور ہمارے ساتھ یہ سلوک بھی کیا جا رہا ہے۔“

”انصاف تو آپ لوگوں کو ضرور ملے گا۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا ”میں صدیق کو تھانے بلوا کر باز پرس کروں گا۔ انشاء اللہ آئندہ وہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔“

وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی ”آپ صدیق کو بھی بلوائیں اور اس کی ماں کو بھی۔ یہ ساری آگ اسی تیرہ تالشی کی لگائی ہوئی ہے۔ اسے بھی تو پتا چلے کالا جادو کروانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ تھانے دار صاحب! دونوں ماں بیٹے کو تھانے میں بند کر کے خوب چھترول کریں۔“

عابدہ کے لہجے میں اپنی نند آسیر کے لیے چھپی ہوئی نفرت کو میں واضح طور پر محسوس کر رہا تھا۔ وہ کسی بھی طریقے سے آسیر کو ذلیل و رسوا کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ میں نے اس کے جذبات کی طلب کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھو عابدہ! آسیر کے بیٹے صدیق عرف صدیقانے تمہارے بیٹے کے ساتھ مار پیٹ کی۔ میں صدیق کو تھانے بلوا کر اس سلسلے میں پوچھ گچھ کروں گا لیکن جہاں تک آسیر کو کسی قسم کی سزا دینے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں تمہیں مایوسی ہوگی۔“

وہ کیوں تھانے دار صاحب؟“

”وہ اس لیے کہ مجھے وہ قصور وار نظر نہیں آتی۔“

”سارے فساد کی جڑ تو وہی ہے تھانے دار صاحب۔“ عابدہ نے تیز لہجے میں کہا ”ایسی بد ذات

نے کالے جادو کے ذریعے میری بتول کو۔“

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا ”جادو ٹونے والا معاملہ مار پیٹ سے الگ ہی رکھو تو بہتر ہے۔ اگر تم صدیق والی مار پیٹ کے خلاف رپورٹ لکھوانا چاہتی ہوں تو ٹھیک ہے ورنہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“

وہ قطعیت سے بولی ”تھانے دار صاحب! اس ماریپیٹ کی نوبت بھی تو کسی وجہ ہی سے آئی ہے نا۔ آپ گندے عمل والے قہر کو نظر انداز کیوں کر رہے ہیں۔“

”مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے؟ یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔“ میں نے درشت لہجے میں کہا ”تم مجھے میرا کام سمجھانے کی کوشش نہ کرو۔“

وہ مایوسی سے منہ لٹکا کر میری جانب دیکھنے لگی۔

میں چند لمحوں تک اس کے معاملات پر غور کرتا رہا پھر فیصلہ کن لہجے میں کہا ”عابدہ خانم! اگر تم چاہتی ہو کہ میں مدد دیتا ہوں تو اس سے کچھ باز پرس کرو تو تم مجھے اس کے گھر کا پتہ وغیرہ سمجھا دو اور بے فکر ہو جاؤ۔ وہ انشاء اللہ آئندہ تمہارے بیٹے کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔“

اس کے انداز صاف جھلک رہا تھا کہ وہ میری تجویز سے مطمئن نہیں ہوتی تھی تاہم میرے حکم پر اس نے آسیریت کے گھر کا مکمل پتہ مجھے نوٹ کر دیا۔ وہ مکان عابدہ کے مکان سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ بس دونوں گھر ایک ہی گلی کا فاصلہ حامل تھا۔

وہ اٹھ کر جانے لگی تو میں نے کہا ”عابدہ! تمہارا گھر والا تھانے کیوں نہیں آیا تمہارے ساتھ رپورٹ لکھوانے؟“

اس نے براہ راست نہ بتایا اور جواب دیا ”اس نے آنے نہ آنے کی دو وجوہات ہیں۔ ایک وجہ جھوٹی اور ایک سچی ہے بلکہ یوں سمجھیں کہ درحقیقت وجہ الیہٰ ہے۔ دوسری جھوٹی بھی ہے وہی سچی بھی۔“

اس نے بڑے الجھاؤ والی بات کی تھی۔ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا ”یہ جھوٹ اور سچی کا کیا قصہ ہے؟“

اس نے بتایا ”امتیاز کا باپ منظور حسین اپنے ہی گھر میں کریمانہ کی دکان کرتا ہے۔ وہ اپنے دکان دار پر جھوٹ کر تھانے نہیں آنا چاہتا تھا اس لیے مجھے بھیج دیا۔ یہ تو بھولی جناب سچی وجہ ہے۔ دوسری وجہ جھوٹی اس طرح ہے کہ دکان دار نے نہ جھوٹنے کی بات اس نے ایک بہانے ایک آڑ کے طور پر کی ہے۔ دراصل وہ نہیں چاہتا کہ اپنے سگے بھانجے صدیق عرف صدیقہ کے خلاف رپورٹ لکھوانے آتا۔ اب تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے!“

پتا نہیں وہ مجھے کیا سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں تو صرف یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ اپنی تندہ کے خلاف دل میں بہت غصہ رکھتی تھی اور ہر صورت میں اسے کوئی سزا دلوانے کی متنی تھی۔ میں نے اس کا

دل رکھنے کی خاطر کہہ دیا۔

”تھیک ہے عابدہ خانم! میں تمہارا مسئلہ سمجھ گیا ہوں۔“

”مجھے امید ہے پھر آپ میری مدد بھی کریں گے!“ وہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے میں اس کی بات کی تک پہنچ گیا ہوں۔

میں نے کہا ”ضرور۔۔۔ ضرور۔۔۔“

اس نے مطمئن انداز میں دروازے کی جانب قدم بڑھا دیے۔

ایک فوری خیال کے تحت میں نے کہا ”ذرا ٹھہر جاؤ عابدہ!“

وہ ٹھہر گئی اور مڑ کر میری طرف سوالیہ نظر سے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا ”میں تمہارے ساتھ اپنے دو اہل کاروں کو بھی بھیج رہا ہوں جو صدیقہ کو پکڑ کر میرے پاس لائیں گے۔ میں دیکھتا ہوں وہ آخر بے کیا چیز!“

میرے ان الفاظ نے عابدہ کچھ مزید مطمئن کر دیا۔ میں نے دو ہوشیار قسم کے کانسٹیبلز کو اپنے کمرے میں بلایا پھر ساری بات سمجھانے کے بعد انہیں عابدہ خانم کے ہمراہ روانہ کر دیا۔

☆☆☆

صدیق عرف صدیقہ کی عمر لگ بھگ تیس سال تھی۔ وہ عام سی شکل کا مالک تھا۔ صحت بھی نہ تو بہت اچھی اور نہ گئی گزری تھی۔ اس کے بارے میں مختصر الفاظ استعمال کرتے ہوئے بس اتنا ہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ ایک عام سا انسان تھا۔ اس وقت صدیقہ میرے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ میرے بھیجے ہوئے کانسٹیبلز صرف ایک گھنٹے کے اندر اسے میرے پاس لے آئے تھے۔ اس کے ساتھ اس کا باپ محمد علی بھی آیا تھا۔ محمد علی ایک چھوٹا سا آدمی تھا۔ صدیقہ کاشت کاری میں باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا۔

میں نے مختصر ترین صورت میں محمد علی کو صدیقہ کے خلاف درج شکایت سے آگاہ کیا۔ جواب میں اس نے ہر چیز کا قصور وار عابدہ خانم کو ٹھہرا دیا۔ اس کے خیال میں عابدہ ایک فتنہ پرور عورت تھی۔ جادوؤں والی بات کو اس نے خود پر شدید اور افسوس ناک الزام قرار دیا اور اس سلسلے میں بھی عابدہ کے رویے کی مذمت کی۔

اس صورت حال کے بعد میں براہ راست صدیقہ کی جانب متوجہ ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ”صدیقہ! سچ بتاؤ، کل کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ تم نے کس بات پر امتیاز سے جھگڑا کیا اور اس کا سر پھاڑ ڈالا؟“

اس نے نگاہ اٹھا کر مجھے دیکھا اور بولا ”تھانے دار صاحب! ایک بات تو آپ یہ سمجھ لیں کہ امتیاز اور اس کی ماں اڈل درجے کے جھوٹے اور منکار ہیں۔ میری ماں نے ان کا بال بھی بانگا نہیں کیا مگر مامی (ممائی) عابدہ خواہ مخواہ اس پر جادو ٹوٹنے کا الزام لگاتی رہتی ہیں۔ کل صبح ماں کا امتیاز اور عابدہ مامی سے آمنا سامنا ہوا تو امتیاز نے جادو وغیرہ کے حوالے سے ماں کو بہت سخت باتیں سنا دیں۔ اس موقع پر مامی عابدہ کو چاہیے تھا کہ وہ بیٹے کو سرزنش کرتی مگر اس نے منع کرنے کے بجائے امتیاز کی سدا افزائی کی اور اس اخلاق سوز فعل میں وہ بیٹے کی ہاں میں ہاں ملائی رہی۔ وہاں ماں کی بہت سی باتیں سنیں۔ لیاں بھی موجود تھیں چنانچہ ماں کو بہت نفرت اٹھانا پڑی۔“

وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رک پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”ماں نے یہ ساری روداد گھر آ کر سنائی۔ میرے سنا تو مجھے بہت غصہ آیا۔ دنیا کا کوئی بھی بیٹا اپنی ماں کی بے عزتی یا رسوائی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ جیسے ہی امتیاز نظر آئے گا، میں اس سلسلے میں اس سے ضرور باز پرس کر اگا۔“ اپنے بیان میں ذرا توقف کر کے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا کہ جیسے وہ تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ اس کی بات کا یقین کر رہا ہوں یا نہیں۔

چند لمحات خاموش رہنے کے بعد دوبارہ گویا ہوا ”تھانے دار صاحب! کل شام سے ذرا پہلے امتیاز مجھے دکھائی دیا تو میں نے اس سے صبح ہونے، اس کا واقعہ کے بارے میں استفسار کیا۔ پہلے تو وہ صاف مکر گیا کہ اس نے ایسی کوئی خاص بات نہیں کی ہے مگر جب میں نے یہ کہا کہ میں ان عورتوں کو گواہی کے لیے اس کے سامنے لا سکتا ہوں جن کے سامنے اس نے میری ماں کو برا بھلا کہا تھا تو وہ ہتھے سے اکھڑ گیا اور انتہائی ڈھٹائی سے بولا ہاں میں نے وہ سب کہا تھا۔ تم جو بڑے بڑے ہو بگاڑ لو۔ اس کی بدتمیزی اور دیدہ دلیری کو دیکھ کر میں غصے میں آ گیا اور اسے برا بھلا کہنے لگا۔ نتیجے میں وہ مجھے گالیاں دینے لگا۔ میرا ہاتھ اٹھ گیا۔ اس قسم کی صورت حال میں یہ تو ہو ہی جاتا ہے۔ بوجہ انتہائی تنک بچنی تو میرا ایک دھکا لگنے سے وہ لڑکھڑاتے ہوئے پیچھے جا کر اور اس کا سر ایک سخت سے جا ٹکرا گیا جس کے باعث اسے شدید چوٹ آئی۔“ رک کر اس نے سانس درست کی اور سوالیہ انداز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔

”اب آپ ہی بتائیں تھانے دار صاحب! اس صورت حال میں میرا قصور ہے؟ میری جگہ اور کوئی بھی ہوتا تو کم و بیش یہی کرتا۔ بے بنیاد اور جھوٹے الزامات... اور وہ بھی ماں جیسی ہستی کے خلاف سن کر تو کسی کا دماغ بھی گھوم سکتا ہے!“

صدیق عرف صدیقہ کی پتاسن کر میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ اس بیان کی روشنی میں عابدہ خانم کی دروغ گوئی جھلکتی تھی۔ عابدہ کی شکایت صدیقہ کی کہانی سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ اس تناظر میں میں نے صدیقہ سے چند سوالات کیے۔

”تو کیا تم نے براہ راست امتیاز حسین کا سر نہیں پھاڑا تھا؟“

عابدہ نے مجھے یہی بتایا تھا کہ صدیقہ نے اس کے بیٹے کے سر کو نشانہ بنایا تھا۔ وہ میرے سوال کے جواب میں بولا ”نہیں جناب“ میں نے اس پر حملہ نہیں کیا تھا بلکہ ایک اتفاق کے تحت وہ نوک دار سخت چیز سے ٹکرایا تھا، یعنی اس کا سر ٹکر کے نتیجے میں زخمی ہوا تھا۔ خدا نخواستہ اس کو شدید زخمی کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔“

”اور یہ بھی بتاؤ کہ جب کل صبح امتیاز نے تمہاری ماں کے ساتھ بدکلامی کی تو اس وقت تمہاری ممانی عابدہ خانم بھی اس کے ساتھ تھی؟“

تھوڑی دیر پہلے صدیقہ نے جو کہانی سنائی تھی اس سے واضح تھا کہ کل صبح امتیاز اور اس کی ماں ساتھ ساتھ تھے مگر میں پھر بھی اس کی تصدیق چاہتا تھا کیوں کہ عابدہ نے اس سلسلے میں کھل کر بات نہیں کی تھی۔ اگر صدیقہ راست گوئی سے کام لے رہا تھا تو پھر عابدہ قصور وار نظر آتی تھی کیوں کہ اس موقع پر عابدہ پر لازم تھا کہ وہ بیٹے کو بدگوئی اور بکواس سے روکتی۔

صدیقہ نے حسب توقع جواب دیا۔ میں نے مزید چند سوالات کیے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ صدیقہ اینڈ فیملی خاصے معقول لوگ تھے۔ صدیقہ کے باپ محمد علی سے بھی تفصیلی بات ہوئی تاہم اس ساری گفتگو کے نتیجے میں میں نے انہیں یہی ہدایت کی کہ وہ ہر قسم کے فساد سے دور رہیں اور خواہ مخواہ عابدہ خانم سے الجھنے کی کوشش نہ کریں۔

انہوں نے میرے مشوروں پر عمل کرنے کا وعدہ کیا اور رخصت ہو گئے۔

اس واقعے کے چند روز بعد عابدہ خانم ایک مرتبہ پھر میرے سامنے موجود تھی۔ وہ خاصی گھبرائی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلا لیا اور پوچھا۔

”کیا ہوا عابدہ! کیا صدیقہ نے پھر تمہارے بیٹے کی پٹائی کر دی؟“

”صدیقہ کو گولی ماری جی۔“ وہ اضطرابی انداز میں بولی۔ ”میں تو اس کی ماں کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ اس بد بخت نے ہمیں تباہ کرنے پر کمر کس لی ہے۔“

”ایسا کیا کر دیا آسید بیگم نے؟“

”وہی جادو کا چکر“ وہ ہاتھ نہاتے ہوئے بولی ”وہ تو ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے لگ گئی ہے۔“

میری بچی کی طبیعت بھی خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی ہے۔ پتا ہے آپ کو آج کیا ہوا؟“

وہ بات کرتے ہوئے خود ہی اس طرف آگئی جس طرف میں اسے لانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس

کے سوال کے جواب میں میں نے پوچھا ”میں کچھ نہیں جانتا تم بتاؤ گی تو پتا چلے گا؟“

”ہاں میں بتاتی ہوں۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی ”آج صبح جب ہم سو کر اٹھے تو صحن

میں چار مرغیوں کی کئی ہوئی گردنیں یعنی سر پڑے ہوئے تھے۔ ہم نے انہیں اٹھانے کی کوشش نہیں

کی۔ وہ چاروں کے چاروں سر کالی مرغیوں کے ہیں۔ میں نے منظور حسین سے کہا کہ وہ گھر کا خیال

کے میں تھاے آ کر آپ کو اطلاع دیتی ہوں۔“

اس کی بات ختم ہوئی، میں نے کہا ”اور تمہارا خیال ہے کہ مرغیوں کی وہ چار منڈیاں کسی جادو

وغیرہ کے سلسلے کی کڑی ہیں جو آسیدہ بیگم تمہاری بیٹی اور گھر پر کر داری ہے؟“

”یہ صرف میرا خیال نہیں بلکہ مجھے پکا یقین ہے تمہارے دار صاحب۔“ وہ پُر وثوق انداز میں بولی

”یہ حرکت آسیدہ کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔“

میں نے پوچھا ”تم نے اس رے میں اپنے ملنگ کالا کو بتایا ہوگا جو تمہاری بیٹی بتول کا علاج

معالج بھی کر رہا ہے؟“

”ابھی ان سے بات نہیں ہوئی۔“ وہ صاف بولی۔ ”ہم لیتے ہیں۔“ بولی ”پہلے میں آپ کو

اطلاع دینے آئی ہوں۔ یہاں سے سیدھی ملنگ کالا کے آستانے رجاؤں کی لیکن انہیں تو پہلے ہی سب

کچھ معلوم تھا۔ وہ بہت کرنی والے ہیں۔ انہوں نے مجھے اس بارے میں پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔“

ملنگ کالا کی پیش گوئی کے بارے میں سن کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے اس سے پوچھا

”تمہارے اس ملنگ نے تمہیں کس سلسلے میں خبردار کیا تھا؟“

”نہوں نے کہا تھا۔“ عابدہ وضاحت کرتے ہوئے بولی ”ایک مرغی کے بعد دوسری، دو کے

بعد چار مرغیاں۔ اور یہ سلسلہ چلتا ہی رہے گا۔“

”پھر اس سے تم نے کیا نتیجہ اخذ کیا؟“

”یہی کہ آج کالی مرغیوں کے جو چار سر صحن میں پڑے پائے گئے ہیں وہ اسی جادوئی سلسلے کی

کڑی ہیں جو آسیدہ بیگم ہمارے خلاف کر داری ہیں۔“ وہ ٹھوس لہجے میں بولی ”ملنگ کالا بہت اپنے

ہوئے بزرگ ہیں۔ ان کی باتوں میں پوشیدہ رمز تک پہنچنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔“

میں نے چڑ کر کہا ”اگر وہ ملنگ کالا کوئی اتنی ہی اونچی چیز ہے تو پھر وہ تمہارے مسائل کو حل

کیوں نہیں کر دیتا۔ کیا اس کے پاس آسیدہ کے کرائے ہوئے سفلی عمل کا کوئی تو نہیں ہے؟“

”وہ تو ذکر کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔“ وہ اندھی عقیدت کے جذبات کو اپنے چہرے پر

سجاتے ہوئے بولی ”بتول انہی کے علاج میں ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اگر ہم ان کی باتوں پر عمل

کرتے ہے تو انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

میں اس قماش کے عاملین و کاملین سے خوب واقف تھا۔ وہ سادہ مزاج لوگوں کو بے وقوف بنا

کر اپنا اُلوسیدہا کرتے رہتے ہیں۔ یہی ان کی آمدنی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ ملنگ کالا بھی بتول کے

علاج کے سلسلے میں اپنی جہالت کا بھرپور مظاہرہ کر رہا تھا اور اپنی روزی روٹی کے چکر میں کالے جادو کی

کہانی گھڑی تھی۔ اس قسم کے جعل ساز مجبور اور مصیبت زدہ انسانوں کی کمزوریوں سے پورا پورا فائدہ

اٹھاتے ہیں۔ ان کے لیے ”عیار بنائیں“ کا ٹاکل مناسب و موزوں لگتا ہے۔

ملنگ کالا کو یقیناً یہ بات معلوم ہوگئی ہوگی کہ عابدہ خانم نے صدیقہ کے رشتے سے صاف انکار کر

دیا تھا۔ وہ اسی بات کو بنیاد بنا کر انہیں دو ہاتھوں سے لوٹ رہا ہوگا۔ یہ بات بعید از قیاس نہیں تھی کہ

ملنگ کالا ہی نے عابدہ کے ذہن میں بٹھایا ہو کہ اس کی ہند نے اس کی بیٹی بتول پر جادو ٹوٹا کر دیا ہے۔

اس قصہ کو ختم کرنے کے لیے میں نے عابدہ خانم سے پوچھا ”اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد

کر سکتا ہوں؟“

”جناب سیدھی سی بات ہے۔ آپ اس فتنہ پھیلانے والی عورت کے خلاف سخت قسم کی

کارروائی کریں۔ آسیدہ بیگم نے سفلی عملیات کے ذریعے ہمارے گھر کا چین و سکون برباد کر ڈالا ہے۔

اس کے لیے کوئی دردناک سزا ہونا چاہیے۔“

بات ختم کر کے عابدہ پر توقع نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ”دیکھو

عابدہ! اگر تم یہ خیال کرتی ہو کہ جادو ٹوٹنے کے حوالے سے میں تمہاری بات مانتے ہوئے آسیدہ بیگم پر

کوئی دباؤ ڈالوں گا تو اس خام خیال کو اپنے ذہن سے نکال دو۔“

میں نے ایک لمحے کا توقف کر کے اس کے چہرے پر اپنی بات کے رد عمل کو تلاش کیا۔ وہاں مجھے

ایسے اثرات نظر آئے جنہیں مایوس کن کہا جاسکتا تھا۔ میں نے اس کے کانوں کے کنارے جھاڑتے

ہوئے مزید کہا۔

”قانونی طور پر میں اس وقت تک کوئی سخت کارروائی نہیں کر سکتا جب تک مجھے دوسری پارٹی

کے خلاف کوئی ثبوت حاصل نہ ہو جائے۔ تم پہلے ایک دو مقامات پر غلط بیانی سے کام لے چکی ہو۔“
بھر میں نے اس دروغ گوئی کی نشان دہی کی اور کہا ”اس صورت حال میں میں آسیرہ بیگم کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔“

وہ بولی ”ثبوت میں آپ کو فراہم کرتی ہوں۔ آپ ابھی میرے ساتھ گھر چلیں۔ چار کالی مرغیوں کی کٹی ہوئی وہ خون آلود گردنیں ابھی تک ہمارے گھر کے صحن میں پڑی ہیں۔ آپ اپنی آنکھوں سے آسیرہ کے کالے کرتوتوں کا ثبوت دیکھ لیں۔“

عابدہ کی پیش کش نے میرے ذہن میں ایک اہم نکتہ اجاگر کر دیا۔ میں نے سوچا ممکن ہے وہ مگ کا لیا ہی اس قسم کی حرکتیں کر رہا ہو۔ یا کروار ہا ہو جس سے کالے جادو کا تاثر مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا تھا۔ کسی کے گھر کے صحن میں کوئی مرا ہوا چوہا یا مرغی کی کٹی ہوئی گردن پھینکنا ہرگز مشکل کام نہیں تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ عابدہ کا مکان کس لوکیشن اور پوزیشن میں تھا۔ یہی سب سوچتے ہوئے میں نے عابدہ سے کہا۔

”ٹھیک ہے، میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“

وہ خوش ہو گئی اور مسنونیت سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے خوالدار احمد خان کو اپنے پاس بلالیا اور اسے اپنے ساتھ عابدہ خانم کے گھر چلے کو کہا۔ وہ فوراً تیار ہو گیا۔ پھر تھوڑی سی دیر بعد ہم تینوں تھانے سے نکل رہے تھے۔

عابدہ خانم کا گاؤں تھانے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم دوں منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔ عابدہ کا گھر گاؤں کے ایک سرے پر واقع تھا۔ وہ گاؤں سے الگ تھلگ تو تھا تاہم وہ گاؤں کا کنارہ تھا۔ اس کے بعد کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ چند کھیتوں کے بعد ریلوے لائن گزرتی تھی۔ یہ ریلوے لائن مین روڈ کی نہیں تھی اور بہت کم مصروف رہتی تھی۔ اسی لائن کے کنارے گاؤں کا قبرستان بھی آباد تھا۔

عابدہ خانم کا گھر ایسی جگہ پر واقع تھا کہ اس گھر کے صحن میں باہر سے کوئی بھی شے یا سانی پھینکی جاسکتی تھی۔ گھر کی چار دیواری زیادہ اونچی نہیں تھی۔ صحن والے حصے کے دائیں بائیں والی دیواریں لگ بھگ پانچ فٹ بلند تھیں۔ وہ دس مرے پر مشتمل ایک عام سا گھر تھا۔ عقبی حصے میں دو کمرے پہلو بہ پہلو بنے ہوئے تھے جن کے آگے ایک طویل برآمدہ تھا پھر صحن شروع ہو جاتا تھا۔ وہ خاصا کشادہ صحن تھا۔ گھر کے سامنے والے حصے میں بھی دو کمرے نظر آ رہے تھے۔ ایک قدرے چھوٹا اور دوسرا بڑا۔ بڑا کمرہ بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ جب کہ چھوٹے کمرے میں عابدہ کے شوہر منظور حسین نے

کریانے کی دکان کھول رکھی تھی۔ گھر کا داخلی دروازہ اسی دکان اور بیٹھک کے درمیان واقع تھا۔ جو لوگ مرلوں کا حساب نہیں جانتے وہ اس مکان کے رقبے کو لگ بھگ ڈھائی سو گز تصور کر لیں۔

گھر کے صحن کے عین وسط میں نیم کا ایک سایہ دار درخت استادہ تھا۔ صحن کی شرقی دیوار کے ساتھ باورچی خانہ اور باتھ روم وغیرہ بنے ہوئے تھے جن کی چھتیں زیادہ اونچی نہیں تھیں تاہم وہ پانچ فٹی دیوار سے قدرے بلند تھیں۔

ہم گھر کے اندر پہنچ چکے تو عابدہ خانم ہمیں سیدھا اس مقام تک لے گئی جہاں اس کے بیان کے مطابق کٹی ہوئی سیاہ مرغیوں کے چار سر پڑے ہوئے تھے۔ یہ مقام نیم کے درخت سے تھوڑے سے فاصلے پر برآمدے کے نزدیک تھا۔ مذکورہ مقام کا مغربی دیوار سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ میرے ذہن میں چونکہ پہلے سے شک موجود تھا اس لیے فوری طور پر یہی خیال آیا کہ مرغیوں کے کلیفوں والے وہ چار سر مغربی دیوار کے اوپر سے گھر کے صحن میں پھینکے گئے ہوں گے۔ اس دیوار سے آگے آبادی نہیں تھی اور لگ بھگ پانچ سو گز آگے جا کر گاؤں کا قبرستان شروع ہو جاتا تھا۔

عابدہ خانم ان چار سیاہ مردوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بیجانی لہجے میں بولی ”دیکھ لیں تھانے دار صاحب! یہ سب جادوئی پیکر نہیں تو اور کیا ہے؟“

عابدہ کا شوہر منظور حسین دکان چھوڑ کر گھر کے اندر آ گیا تھا۔ وہ مسکین صورت والا ایک عام سا شخص تھا۔ میں نے پہلی نظر ہی میں اندازہ لگالیا کہ وہ اپنی بیوی کا دیل تھا۔ ایسے شوہر اپنی بیویوں کے سامنے دم مارنے کی جرات نہیں کر سکتے۔ عرف عام میں اس قسم کے شوہروں کو زن مرید بھی کہا جاتا ہے۔

میں نے عابدہ کے سوال کا جواب دینے کے بجائے منظور حسین سے پوچھا ”منظور حسین تم اس سلسلے میں کیا کہتے ہو؟“

”کس سلسلے میں جی؟“ وہ ہونفوں کی طرح مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا ”منظور! تمہاری بیوی عابدہ کا دعویٰ ہے کہ تمہاری بہن آسیرہ بیگم نے اس گھر پر کوئی سفلی عمل کروایا ہے۔ کبھی تمہارے صحن میں مردہ چوہے پڑے ملتے ہیں اور کبھی کٹی ہوئی مرغیاں؟“

”بس جی کیا بتاؤں۔“ وہ بے وقوفانہ انداز میں بولا۔ ”میں تو بہت پریشان ہوں۔ بتول کی حالت بھی ہر گز رتے دن کے ساتھ بگڑتی جا رہی ہے حالانکہ اس کا باقاعدہ علاج بھی کروا رہے ہیں۔ پتا نہیں کس بد بخت کی نظر ہمارے گھر کو کھا گئی ہے۔“

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اپنا دکھاروڈالا تھا۔ میں نے سوچا، ممکن ہے وہ اپنی بہن آسیہ کے حوالے سے جادوؤں نے پر بات نہ کرنا چاہتا ہو۔ میں نے اس معاملے میں اسے کریدنا مناسب نہیں سمجھا اور بتول کے حوالے سے سوال کیا۔

”تم اپنی بیمار بیٹی بتول کا علاج کس سے کروا رہے ہو؟“

عابدہ مجھے بتا چکی تھی کہ ملنگ کا لیا ہی اس کی بیٹی کا علاج کر رہا تھا تاہم میں بتول کے باپ سے علوم کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح ممکن تھا اس گتھی کا کوئی سرا میرے ہاتھ آ جاتا۔

منظور حسین نے جواب دیا، ”بتول کا علاج ملنگ بابا کر رہے ہیں۔“

”تو بار ما مطلب ہے، ملنگ کا لیا؟“

اس نے اٹھا۔ میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا، ”یہ انکشاف یا تحقیق بھی ملنگ کا لیا ہی کی ہے نا کہ اس گھر پر بہت سخت قسم کا جادو کیا گیا ہے۔“ ایک سے کور کر کے میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا، ”ملنگ صاحب کا دعویٰ ہے کہ جادو کرنے والی ہستی کوئی اور نہیں بلکہ آپ کی بہن آسیہ بیگم ہے؟“ وہ متاثر لہجے میں بولا، ”تھانے دار صاحب! میں کوئی الزام دے کر اپنا ایمان خراب نہیں کرنا چاہتا مگر یہ حقیقت ہے کہ ہمارا گھر کسی مصیبت کی زد میں ہے۔“

”تم کیوں نام لو گے اپنی بہن کا۔“ عابدہ چمک کر بولا، ”بھائی، نے کے ناتے کچھ تو پردہ رکھو گے نا۔“ پھر وہ میری جانب دیکھتے ہوئے بولی، ”تھانے دار صاحب! میں آپ کو بتاتی ہوں یہ سارا کھٹ راگ اسی نامراد نے پھیلا لیا ہے۔ آپ آسیہ کے خلاف کوئی مناسب کارروائی کرو کریں۔“

”کروں گا۔۔۔ ضرور کروں گا۔“ میں نے اسے ہانپنے کی خاطر کہا، ”تم دے تو جادو میں اس کے خلاف کیا کرتا ہوں۔ بس ذرا میں پہلے اپنی تسلی کروں پھر کوئی عملی قدم اٹھاتا ہوں۔“

اس کے بعد میں نے گھوم پھر کر اس گھر کا تفصیلی جائزہ لیا اور پھر منظور حسین کے ہاتھ اس کی بیٹھک میں آ گیا۔ دراصل میں عابدہ کی غیر موجودگی میں اس سے چند سوال جواب کرنا چاہتا تھا۔ عابدہ اس دوران میں گھر کے اندر مصروف ہو گئی تھی۔

منظور حسین کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ اس کی تین اولادیں تھیں۔ بڑی بیٹی بتول لگ بھگ بیس سال کی تھی۔ اس سے چھوٹے دو بیٹے تھے۔ امتیاز حسین پندرہ سال کا اور سب سے چھوٹا سرفراز حسین آٹھ سال کا تھا۔ میں تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا پھر اصل موضوع کی طرف

آ گیا۔

”منظور حسین!“ میں نے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا، ”مجھے پتا چلا ہے کہ کچھ عرصہ پہلے تمہاری بیٹی بتول کے لیے صدیہا کا رشتہ آیا تھا جو تم لوگوں نے مسترد کر دیا تھا۔“

”ہاں، کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔“ وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔

”تمہاری بیوی کا خیال ہے اسی انکار کے بعد آسیہ بیگم نے دشمنی میں تمہاری بیٹی اور گھر پر جادو کروا دیا ہے۔“ میں نے چیختے ہوئے لہجے میں کہا، ”تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟“

وہ جڑبڑھتے ہوئے بولا، ”عابدہ کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے سبھی ہوئی نظر سے بیٹھک کے دروازے کو دیکھا جیسے اسے ڈر ہو کہ کہیں عابدہ اپنے بارے میں اس کے خیالات سے آگاہ نہ ہو جائے۔ مطمئن ہونے کے بعد اس نے کہا، ”میں اس سلسلے میں بہن آسیہ کو قصور وار نہیں سمجھتا۔ وہ اس قسم کی سچ حرکت نہیں کر سکتی۔ عابدہ ”نند بھائی“ کی رواجی کشیدگی کے باعث ایسا سوچتی ہے ورنہ آسیہ بتول کی دشمن نہیں ہو سکتی۔ ہاں ایک بات میں ضرور کہوں گا۔“ اس نے ذرا توقف کر کے ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھ سے دیکھا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا، ”یہ تو میں محسوس کر رہا ہوں کہ ہمارے گھر پر کسی نے کوئی سلفی عمل ضرور کروا لیا ہے۔“

”تم یہ کس بنا پر محسوس کرتے ہو؟“ میں نے پوچھا، ”مردہ چوہے، کٹی ہوئی مرغیاں اور کالی بلی کی ”لاش“ کو دیکھ کر تم ایسا نہیں سوچ رہے؟“

وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا، ”یہ بات بھی ہے اور اس کے علاوہ بھی کچھ ہے۔“

”اس کے علاوہ کیا ہے؟“

”بتول کی سمجھ میں نہ آنے والی بیماری۔“ وہ دھکی لہجے میں بولا۔

میں نے کہا، ”تم نے اپنی بیٹی کو کسی سیانے اور تجربہ کار معالج کو دکھایا ہوتا تو شاید اس کی بیماری سمجھ میں بھی آ جاتی۔“

وہ بولا، ”ملنگ بابا کافی سیانے آ دی ہیں۔ ان کا علاج باقاعدگی سے جاری ہے۔ ہم بابا کی دی ہوئی دوا پابندی سے بتول کو پلا رہے ہیں۔“

مجھے اس کی سادگی آمیز جہالت پر غصہ تو بہت آیا تاہم میں نے ڈانٹ ڈپٹ کے بجائے قدرے سخت لہجے میں پوچھا، ”تم نے اپنی بیٹی کا علاج کسی ڈاکٹر یا حکیم سے کیوں نہیں کروا لیا؟“

”یہ عابدہ ہی کی ضد تھی۔“ وہ جھٹھلاہٹ آمیز انداز میں بولا، ”اس کا خیال تھا کہ ملنگ بابا ہر قسم

کے علم کے ماہر ہیں۔ وہ جادو کا توڑ بھی کریں گے اور بتول کا علاج بھی کریں گے۔“

”مگر ملنگ کا لیا کہ علاج کا ابھی تک کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوا؟“ میں نے طنز یہ لہجے میں کہا
”اس کے باوجود بھی تم لوگ اسی پر تکیہ کیے بیٹھے ہو!“

وہ بڑے وثوق سے بولا ”انہوں نے یقین دلایا ہے کہ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

میں نے پوچھا ”ملنگ بابا کا ٹھکانا کس طرف ہے؟“

”قبرستان کے نزدیک۔“ اس نے جواب دیا۔

”میں ملنگ کا لیا سے بھی ملوں گا۔“ میں نے کہا ”ذرا معلوم تو ہو وہ کس مرض کا علاج کر رہا

اس۔ ملاقات کے بعد ہی حقیقت حال کا علم ہو سکے گا۔“

منظور حسین نے نہ تو اس ارادے کو سراہا اور نہ ہی مجھے اس خیال سے باز رہنے کو کہا۔ وہ ایک

بے وقوف قسم کا مرد تھا۔ عابدہ نے اسے اس قدر دبا کر رکھا ہوا تھا کہ بعض اوقات تو وہ حواس باختہ دکھائی دیتا تھا۔

میں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا ”منظور! سچ بتاؤ تم لوگوں نے صدیقہ کا رشتہ کیوں ٹھکرایا تھا۔ تمہاری بیوی نے مجھے بتا تھا کہ صدیقہ کسی بھی طور بتول کے جوڑ کا نہیں تھا اس لیے اس رشتے سے انکار کیا گیا تھا جب کہ میں صدیقہ سے ایک ملاقات کر چکا ہوں۔ وہ قبول صورت اور معقول لڑکا ہے۔“

”آپ کا خیال بالکل درست ہے تھا نے دار صاحب! صدیقہ لہجے اور نیچی آواز میں بولا
”صدیقہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ وہ میرا بھانجا لگتا ہے کہ درحقیقت وہ معقول لڑکا ہے۔“

وہ اتنا تباہ کر خاموش ہو گیا۔ میں نے جلدی سے پوچھا۔ ”اس کے باوجود بھی تم لوگوں نے اس کے رشتے سے انکار کر دیا؟“

”بس جی، کیا بتاؤں۔“ وہ اداسی سے بولا ”میری طرف سے تو انکار نہیں تھا لیکن عابدہ نہیں مانی۔“

”اور تم نے اپنی بیوی کے سامنے ہتھیار پھینک دیے!“

وہ شرمندہ سی صورت بنا کر بولا ”کچھ ایسا ہی سمجھ لیں۔“

میں نے اس کی بے بسی کو محسوس کرتے ہوئے گفتگو کا زاویہ تھوڑا سا بدل دیا اور استفسار کیا

”عابدہ کے آمادہ نہ ہونے کی وجہ کہیں یہ تو نہیں تھی کہ وہ بتول کی شادی کہیں اور کرنا چاہتی ہے؟“

”ہاں! کچھ ایسی ہی بات ہے۔“ وہ مبہم انداز میں بولا۔

”وہ اپنی بیٹی کو کہاں بیاہنے کی خواہاں ہے؟“

”اس نے کھل کر تو کچھ نہیں بتایا۔“ منظور نے جواب دیا ”لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ اپنی بہن

شکیلہ کے بیٹے طارق سے بتول کی شادی کرنا چاہتی ہے۔“

میرے ذہن میں ایک اور نکتہ روشن ہو گیا۔ بتول کے حوالے سے ایک اور فریق سامنے آیا تھا۔

جادوئی واقعات کے ذیل میں طارق اور اس کے گھر والوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔

میں نے منظور حسین سے سوال کیا ”عابدہ کی بہن شکیلہ کی رہائش کہاں ہے؟“

”وہ بھی اسی پنڈ (گاؤں) میں رہتی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”طارق کام کیا کرتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کے کپڑے کی دکان ہے۔“

”اسی گاؤں میں؟“

”نہیں“ اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا ”شروع شروع میں تو اس کی دکان یہیں پر تھی مگر

اب وہ اپنے کاروبار کو قبضے کے بڑے بازار میں لے گیا ہے۔ وہاں اس کی دکان زیادہ چلنے لگی ہے اور

ظاہر ہے آمدنی بھی زیادہ ہو رہی ہے۔“

میں نے منظور حسین سے شکیلہ کے گھر کا پتا بھی سمجھ لیا اور قبضے کے مین بازار میں طارق کی دکان

کے بارے میں بھی معلوم کر لیا۔ اسی کی زبانی پتا چلا کہ طارق روزانہ رات کو گھر آتا ہے اور صبح قبضے والی

دکان پر جاتا ہے۔

مزید کچھ وقت وہاں گزارنے کے بعد میں اس گھر سے نکل آیا۔ میں نے رخصت ہونے سے

پہلے انہیں تسلی دی تھی کہ جس حد تک بھی ممکن ہو سکا میں ان کی مدد ضرور کروں گا۔ میرے کہنے پر انہوں

نے مرغیوں کی وہ کئی ہوئی چار گردنیں منحن سے اٹھا کر باہر پھینک دی تھیں۔

وہاں ہی کے سفر میں حوالدار جمہ خان نے پوچھا ”ملک صاحب! اب کس طرف چلنا ہے؟“

میں نے مزاج کے رنگ میں کہا ”تمہارے پاس کون کون سی ”طرفیں“ ہیں؟“

وہ بولا ”فی الحال تو جناب تین طرفیں ہیں۔ آسیر، بیگم کا گھر، شکیلہ کا گھر اور ملنگ کا لیا کا ٹھکانا۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”مگر بات یہ ہے جمہ خان

کہ ہم یہاں سے سیدھے تھانے جائیں گے۔ عابدہ خانم اور منظور حسین کو جس قسم کی صورت حال درپیش ہے اس کے پیچھے کوئی سکار اور عیار ذہن کام کر رہا ہے۔ مجھے تو اس میں کسی جادوؤں نے کا ہاتھ نظر نہیں آتا۔ اگر ہم اس تذکرہ شخص کو کھوج لیں تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو سکتا ہے۔ پھر کسی بھی پارٹی سے ملاقات کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔“

”اور وہ عیار اور مکار شخص کون ہو سکتا ہے؟“ حوالدار نے چونکے ہوئے لہجے میں سوال کیا ”ہم اس کے کس طرح پہنچ سکتے ہیں؟“

اس کے آلات بہت اہم تھے۔ میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا ”جمعہ خان! اب تک جو حالات میرے سامنے آئے ہیں ان کے پیش نظر اس سارے معاملے میں مجھے ملنگ کا لیا کا غالب ہاتھ نظر آ رہا ہے لیکن اسے براہ راست چھینرنا مناسب نہیں ہوگا۔ ایسے پیشہ ور لوگ بعض اوقات بہت خطرناک بھی ثابت ہوتے ہیں کیوں کہ ان کے مرید اور مریدوں پر اندھا یقین رکھتے ہیں۔ وہ ان کے خلاف کچھ سننے اور سننے کو جان نہیں ہوتے۔ اندھی عقیدت بسا اوقات بڑے مسائل کھڑے کر دیتی ہے۔“

”پھر تفتیش کی گاڑی کیسے آگے گئی گی ملک صاحب حوالدار نے پوچھا۔

میں نے کہا ”دیکھو جمعہ خان! اگر ہم یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائیں کہ یہ مرغیاں کہاں سے آرہی ہیں جو عابدہ کے صحن میں پائی جارہی ہیں تو شاید کچھ مفید اور کارآمد معلومات حاصل ہو جائیں۔“

شہروں میں جس طرح مرغیوں کی دکانیں ہوتی ہیں جہاں مرغی کا گوشت یا زندہ مرغی فروخت ہوتی ہے اس طرح کی کوئی کہانی گاؤں دیہات میں نہیں ہوتی۔ وہاں تقریباً ہر گھر میں مرغیاں پالی جاتی ہیں تاکہ مرغی کا گوشت اور انڈے گھر کے ہو جائیں۔ جن اکاؤ کا گھروں میں مرغیاں ہوں بھی ہوتیں وہ لوگ اناج کے بدلے دوسروں سے مرغی اور انڈے حاصل کر لیتے ہیں۔ بہت سے لوگ ان کو یہ بات سن کر حیرت ہوگی کہ گاؤں دیہات میں ضروریات زندگی کی بہت سی اشیاء اناج کے بدلے حاصل ہو جاتی ہیں۔ روپیہ یا پیسہ ایسی وہ اہمیت حاصل نہیں کر سکا جو حال شہر میں دیکھنے میں آتا ہے۔

اس تناظر میں یہ سوچا جاسکتا تھا کہ اگر عابدہ خانم کے گھر کے صحن میں کئی ہوئی مرغیاں دستیاب ہو رہی تھیں تو وہ کہیں نہ کہیں سے تو حاصل کی جارہی تھیں اور ظاہر ہے۔ وہ یا تو خریدی جارہی ہوں گی یا پھر چوری کی جارہی ہوں گی۔

جمعہ خان نے مجھ سے سوال کیا ”ملک صاحب! ان مرغیوں کی ”آمد“ کے بارے میں جاننے کے لیے آپ کے ذہن میں کوئی آئیڈیا ہے۔“

”فی الحال تو کوئی آئیڈیا نہیں۔“ میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا ”تھانے چل کر اس سلسلے میں کچھ سوچتے ہیں۔“

”اگر آپ یہ معاملہ میرے حوالے کر دیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کوئی مثبت حل آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔“ حوالدار جو شیلے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا ”ٹھیک ہے جمعہ خان! میں تمہیں اپنی صلاحیتیں آزمانے کا پورا موقع دوں گا۔ تم اپنے طور پر کوئی لائحہ عمل تیار کر کے اس منصوبے پر کام شروع کر دو۔“ وہ خوش ہو گیا۔ اس کے دل کی مراد برآئی تھی۔

آج کل تھانوں میں اچھا خاصا اسٹاف دیکھنے میں آتا ہے اور شہری حدود کے تھانوں میں تو خاصی بھاری نفری موجود ہوتی ہے مگر ہمارے زمانے میں تو یہ تعداد کافی کم ہوتی تھی اور وہ بھی گاؤں دیہات کے تھانوں میں! وہاں تو صورت حال کچھ زیادہ ہی خراب ہوتی تھی چنانچہ تھانے میں موجود ہر اہل کار ہر کام کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ یہ نہیں دیکھا جاتا تھا کہ کون سا کام حوالدار کے کرنے کا ہے اور کون سا اے ایس آئی یا ایس آئی کے کرنے کا۔ عملے کا ہر فرد اپنا فرض سمجھ کر پوری ذمہ داری سے تعاون کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ ہم جب تھانے پہنچے تو شام ہونے والی تھی۔

☆☆☆

عابدہ خانم ایک مرتبہ پھر میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ چہرے سے خاصی پریشان اور حواس باختہ نظر آتی تھی۔ میں نے سرسری انداز میں پوچھا ”اب نیا کیا ہوگا ہے؟“

”آپ نے اب تک میری کسی بات کا یقین نہیں کیا تھا نہ دار صاحب۔“ وہ شکایت بھرے لہجے میں بولی ”مگر اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ اگر آپ نے آئیے بیگم کو نہ روکا تو سب کچھ تباہ ہو کر رہ جائے گا۔“

میں نے پوچھا ”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ کیا کوئی نئی صورت حال پیش آگئی ہے؟“

”کچھ نہ پوچھیں جی۔“ وہ جھجھکی لیتے ہوئے بولی ”آج ہمارے گھر کے صحن میں نیم کے

درخت کے پس ایک مردہ کتا پڑا ہوا ملا ہے..... اور وہ بھی کالے رنگ کا۔ رات سے بتول کی طبیعت بھی بہت خراب ہے۔ آپ جلد از جلد ایسے کی سرگرمیوں کو روکیں ورنہ ہم برباد ہو جائیں گے۔“

وہ جو سلسلہ چل نکلا تھا اس کا تعلق جادوؤں سے ہو یا نہ ہوتا ہم یہ بات تو یقینی تھی کہ عابدہ خانم ایک مشکل اور افسوس ناک صورت حال سے دوچار تھی۔ رہ رہ کر میرے ذہن میں ملنگ کالیا کا نام ابھر رہا تھا۔ مجھے نوے فیصد امید تھی کہ اس جادوئی چکر کے عقب میں ملنگ کا ہاتھ ہو سکتا تھا۔

میں نے عابدہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا ”تم یہ بات ذہن سے نکال دو کہ میں نے تمہارے مسائل کو تبدیلی سے نہیں لیا۔ یقین کرو میں نے اپنے عملے کے کچھ افراد کو اس سلسلے میں اہم فرائض سونپ رکھے ہیں۔ انشاء اللہ بہت جلد ہی کوئی بہتر صورت حال سامنے آ جائے گی۔“

”کب؟“ اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا ”جب بتول اپنی جان سے ہار جائے گی؟“ اس کی آواز میں چھپی ہوئی کسی بڑی وضاحت کے ساتھ محسوس کر رہا تھا۔ میں نے ملنگ کالیا کے حوالے سے پوزیشن واضح کرنے کی خاطر پوچھا ”بتول تو ملنگ کالیا کے زیر علاج ہے۔ وہ عملیات و سفلیات وغیرہ کا بھی ماہر ہے۔ وہ بے چاری جان کیوں ہارے گی؟“

”میں تو اب ملنگ بابا کی طرف سے مایوس ہوتی جا رہی ہوں۔“ وہ درد بھرے لہجے میں بولی ”وہ علاج تو کر رہے ہیں مگر کوئی خاص فائدہ نہیں ہو رہا۔ جادوؤں کا توڑ بھی خاطر خواہ نہیں ہو سکا۔ البتہ ملنگ جی کی پیش گوئیاں ضرور پوری ہو رہی ہیں۔“

میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا ”مثلاً کس قسم کی پیش گوئیاں؟“ ”انہوں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ بہت سخت قسم کا گندہ عمل کیا گیا ہے۔“ عابدہ نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ”اس نوعیت کے سفلی عمل میں آغاز..... مردہ چوہے سے ہوتا ہے۔ پھر مرغی، بلی اور کتے وغیرہ کی باری آتی ہے..... اور سب سے آخر میں انسان۔“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی اور سر اسیمہ نظر سے مجھے ہٹنے لگی۔

میں نے اس کے ادھورے بیان کو مکمل کرتے ہوئے کہا ”یہ سلسلہ مردہ کتے تک تو پہنچ چکا ہے۔ اگلا مرحلہ مردہ انسان کا ہوگا!“

وہ منہ سے کچھ نہیں بولی، خوف زدہ انداز میں سر کو اثباتی جنبش دینے لگی۔ میں دل ہی دل میں ملنگ کالیا کی عیاری پر آتش آتش کر اٹھا۔ وہ خبیث انسان بڑی مہارت سے ان لوگوں کو آلو بنارہا تھا۔ اس کی پیش گوئیوں کا ذکر سن کر میرا یہ یقین اور پختہ ہو گیا تھا کہ ”اس کھیل“ میں ملنگ کالیا کا غالب ہاتھ تھا!

ایسا سوچتے ہوئے میرے ذہن میں ایک اہم سوال ابھرا۔ اگر ملنگ کالیا دیدہ و دانستہ یہ سب کچھ کر رہا تھا تو اس کے پس پردہ اس کا کون سا مفاد پوشیدہ تھا! یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ محض تفریحاً یہ کھیل کھیل رہا ہو۔ اس نکتے کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے میں نے عابدہ سے پوچھا۔

”عابدہ! یہ بات تو صاف ظاہر ہے، ملنگ کالیا تمہاری بیٹی بتول کا علاج مفت میں نہیں کر رہا ہوگا!“

وہ سنجیدگی سے بولی ”تھانے دار صاحب! مفت میں کون کسی کے کام آتا ہے۔“ میں نے پوچھا ”ملنگ کالیا علاج کے سلسلے میں اب تک تم لوگوں سے کتنی رقم وصول کر چکا ہے؟“ ”گا ہے یہ گا ہے وہ جتنے پیسے بھی مانگتا ہے ہمیں دینا پڑتے ہیں۔“ عابدہ نے تامل کرتے ہوئے بتایا ”منظور کی دکان ٹھیک ٹھاک چلتی ہے اس لیے ہمیں زیادہ پریشانی نہیں اٹھانا پڑتی اگر آمدنی کا یہ سہارا نہ ہوتا تو خدا جانے ہمارا کیا حشر ہوتا!“

”حشر تو تم لوگوں کا اب بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں ہو رہا۔“ میں نے تنکھے لہجے میں کہا۔ ”ملنگ کالیا کچھ نہ کر کے بھی خوب کما رہا ہے اور..... تم لوگ اس کے ہاتھوں بے وقوف بن رہے ہو۔“

وہ بے بسی سے بولی ”کیا کریں جی، معاملہ ہی ایسا ہے۔ اس قسم کے گندے عمل کا تو زکوٰۃی عامل کامل ہی کر سکتا ہے۔ ہمارے گاؤں میں ملنگ کالیا کے سوا کوئی دوسرا ایسا نام بھی تو نہیں!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”دیکھو عابدہ خانم! تمہارے حالات سے آگاہ ہو کر میں اپنے دل میں تمہارے لیے ہمدردی محسوس کر رہا ہوں۔ اگر تم سنجیدگی سے میری بات ماننا چاہو تو میں اس سلسلے میں تمہیں کوئی مفید مشورہ دے سکتا ہوں۔“ وہ ہمدردی گوش ہو کر امید بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور مضبوط لہجے میں کہا۔ ”ایک بات ذہن میں بٹھا لو کہ تم لوگوں کے ساتھ جو بھی واقعات پیش آ رہے ہیں ان کا جادو یا ٹوٹنے وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں۔ عین ممکن ہے ان جادوئی واقعات کے پیچھے ملنگ کالیا ہی کا ذہن کا فرما ہو۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ ملنگ کالیا کے چنگل سے نکل کر بتول کا علاج کسی حکیم یا ڈاکٹر سے کر دو۔“

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں موجود تاثرات سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ میری بات سنجیدگی سے نہیں لے رہی تھی اور اس کا ذہن اب بھی جادوؤں کے بارے میں ہی

سوچ رہا تھا۔ میں نے اسے متذبذب دیکھا تو واضح الفاظ میں کہا۔

”عابدہ! اگر تم اس طرح جاہلانہ سوچ کو ذہن میں بسائے بیٹھی رہیں تو کوئی بھی تمہارے یا تمہاری بیٹی کے لیے کچھ نہیں کر سکے گا۔ ملنگ کا لایا اسی طرح تمہیں بے وقوف بنا کر قیاسی اعتبار ہے گا۔ پولیس اس وقت تک کسی شخص پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی جب تک مذکورہ شخص کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہ ہو۔“

ایک لمحے کو رک کر میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا اور اپنی بات کو آگے بڑھا دیا۔ ”میں اور میرے عملے کے تجربہ کار افراد یہ جاننے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مردہ چوہے، بلیاں اور مرغیاں کتنے کیوں اور کہاں سے تمہارے گھر کے صحن میں آ رہے ہیں انشاء اللہ بہت جلد اس سہی کا کوئی سراہہ آ جائے گا البتہ ملنگ کا لایا سے چھٹکارا پانے کے لیے جب تک تم میرے ساتھ تعاون کے لیے تیار نہیں ہوگی بات بن نہیں سکے گی۔ جب تک تم لوگ اسے سچا عامل کامل اور معالج سمجھتے رہو گے میں اس کے ”اف کوئی سخت عملی قدم نہیں اٹھا سکوں گا۔“

وہ پوری بات سننے کے بعد ”کی قدم اٹھانے کی ضرورت تو آسیہ بیگم کے خلاف ہے۔ ہم پر جو مصیبت نازل ہوئی ہے اس کے چھ آسیہ کا ہاتھ ہے۔ ملنگ بابا تو بول کا علاج کر رہے ہیں اور ان کی پوری کوشش ہے کہ وہ اس گھر یعنی ہمارے گھر اور ان کی اشیاء سے پاک کر دیں۔“

میں خیال ہی خیال میں سرپیٹ کر رہ گیا۔ کسی نے مجھ سے کہا ہے... علم کی کوئی نہ کوئی حد ضرور ہوتی ہے مگر جہالت کی کوئی حد ہوتی ہے نہ ٹھکانا۔ کوئی بھی شخص بے دروہ، بے حساب بے شمار و بے انداز جاہل ہو سکتا ہے۔ میرے سامنے بیٹھی عابدہ خانم اس کی ایک زندہ مثال تھی۔ اس کے یکاڑ کی سوئی ایک مخصوص مقام پر انگ گئی تھی۔ میں اس کی حالت پر افسوس کرنے کے سوا اور کر سکتا تھا

میں نے افسوس ناک انداز میں اسے دیکھا اور تسلی آمیز لہجے میں کہا ”تم بے حس نہ ہو کر جاؤ۔ میں جلد از جلد تمہارے مسئلے کا کوئی حل نکالتا ہوں۔“

وہ مجھے دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے حوالدار جمہ خان کو اپنے پاس بلایا اور اس کی کوششوں کی رپورٹ مانگی۔ وہ چہرے سے خاصا بڑبڑاؤ نظر آ رہا تھا پھر جب وہ بولا تو اس کے جوش کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔ جمہ خان نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔

”ملک صاحب! میں نے ایک نہایت اہم آدمی کا سراغ لگایا ہے۔“

”کون ہے وہ اہم آدمی؟“

”اس کا نام تو خوشی محمد ہے۔“ جمہ خان نے بتایا ”مگر ”خوشیا“ مشہور ہے۔“

”یہ خوشیا اہم کس حوالے سے ہے؟“

”اس کی وجہ شہرت اس کا ٹکڑی چوڑ ہونا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے مرغی چور؟“

”بالکل یہی مطلب ہے ملک صاحب۔“ وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

”یہ شخص کہاں کا رہنے والا ہے۔“ میں نے پوچھا ”اور اس نے کس کس کی مرغیاں چرائی ہیں؟“ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پوری دلچسپی سے حوالدار کی جانب متوجہ ہو گیا۔

اس نے جواب دیا ”خوشیا نامی یہ ٹکڑی چور اسی گاؤں میں رہتا ہے جہاں عابدہ خانم اور آسیہ بیگم کے گھر ہیں۔ اس نے اسی گاؤں کے مختلف گھروں سے مرغیاں پار کی ہیں یا یوں سمجھ لیں کہ گھر کے باہر سے وہ مرغیاں اڑائی ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں کافی لوگوں کو ٹھولا ہے اور مجھے پتا چلا ہے کہ گاہے بگاہے ان کی مرغیاں غائب ہوتی رہی ہیں۔“

”کیا تم نے اس سلسلے میں خوشیا سے بات کی ہے؟“

”ابھی میں نے خوشیا کو شیخ نہیں کیا ملک صاحب۔“

”پھر تمہیں کیسے یقین ہے کہ وہ مرغیاں خوشیا ہی نے چرائی ہوں گی؟“ میں نے پوچھا۔

وہ بولا ”میں نے اپنے طور پر کچھ تحقیق کی ہے۔ گاؤں میں خوشیا کی شہرت ایک چور کی سی ہے خصوصاً لوگوں کی مرغیاں چراتے ہوئے تو وہ کئی مرتبہ دیکھا گیا ہے جہی تو وہ گاؤں میں ٹکڑی چور مشہور ہو گیا ہے۔“ حوالدار نے چند لمحوں کا توقف کر کے میری جانب دیکھا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”ملک صاحب! اگر ہم خوشیا کو تھانے بلا کر تھوڑی سی سختی کریں تو وہ سب کچھ صاف صاف بک دے گا۔ ہمیں عابدہ خانم والے معاملے میں کسی اور شخص کی تلاش ہے جو اپنے پاس مفت کی بہت سی مرغیاں رکھتا ہو۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے!“

”میں تمہارا اہم خیال ہوں جمہ خان۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا ”تم پہلی فرصت میں خوشیا کو پکڑ کر تھانے لے آؤ۔“

”جو حکم ملک صاحب!“ جمہ خان ولولہ انگیز لہجے میں بولا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”میں ایک گھنٹے کے اندر خوشی محمد عرف خوشیا کو آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔“

پھر اپنے وعدے کے مطابق بعد خان نے واقعی ایک گھنٹے کے اندر خوشیا کو میرے سامنے لا کر حاضر کیا۔ میں سمجھ رہا تھا خوشیا کی عمر کا کوئی شخص ہوگا مگر وہ میری توقع کے برخلاف ثابت ہوا۔ اس کی عمر چودہ پندرہ سال سے ہرگز زیادہ نہیں تھی۔ وہ نوجوان، دبلا پتلا اور دراز قامت تھا۔ چلیے کے اعتبار سے وہ آوارہ نظر آتا تھا۔ میں چند لمحوں تک تنقیدی نظر سے اس کا جائزہ لیتا رہا پھر گرج دار آواز میں اس سے سوال کیا۔

”خوشیا! جانتے ہو تمہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟“

”تذیب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا“ جناب! اصلی بات تو آپ کو ہی معلوم ہوگی مگر میں محسوس کر رہا ہوں کہ مجھے چوری وغیرہ کے سلسلے میں تھانے لایا گیا ہے۔“

”تمہارے احساسات بالکل درست ہیں۔“ میں نے دوستانہ انداز میں کہا ”مجھے امید ہے تم نے یہ بھی اندازہ کر لیا ہوگا کہ ہمیں کس قسم کی چوری کے ضمن میں پکڑا گیا ہے؟“

”میرا خیال ہے ٹکھڑیاں برانے کے سلسلے میں“ اس نے جواب دیا۔

”تم خاصے ذہین بندے ہو۔“ میں نے تعریفی انداز میں کہا ”اور میں توقع کر رہا ہوں تم سے جو کچھ بھی پوچھا جائے گا تم اس کا درست اور سیدھا جواب دو گے۔“

”جی ضرور..... تھانے دار صاحب!“ وہ تھوک نکلتے ہوئے بولا۔

حوالدار نے اس موقع پر کہا ”اگر تم نے ہمیں چکر دینے کی کوشش کی یا کسی قسم کی غلط بیانی سے کام لیا تو یاد رکھنا ہمارے پاس ٹیڑھے لوگوں کو سیدھا کرنے کے ایک سواکھ گڑ ہیں۔ ہم نہیں چاہتے تم اس کم عمری میں کسی اذیت ناک مرحلے سے گزرو لہذا تمہارے لیے یہی مناسب ہے کہ جو پوچھا جائے سچ بچتا دو۔“

”آپ فکر نہ کریں۔“ وہ تعاون آمیز لہجے میں بولا ”میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ آپ بوجھیں کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“

میں نے پوچھا ”خوشیا! پچھلے ایک دو ماہ میں گاؤں کے مختلف لوگوں کی مرغیاں پوری ہوئی ہیں خصوصاً کالی مرغیاں۔۔۔ اور ہمیں شک ہے یہ کارروائی تم نے ہی کی ہے۔ کیا میں سچ کہہ رہا ہوں؟“

وہ صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے بولا ”یہ کام تو میں کرتا ہی رہتا ہوں۔“

”تم یہ غلط کام کیوں کرتے ہو؟“

وہ سادگی سے بولا ”یہ میری روزی روٹی کا ذریعہ ہے۔ چوری شدہ مرغیاں میں دوسرے گاؤں

میں جا کر فروخت کر دیتا ہوں۔ اس طرح کچھ آمدن ہو جاتی ہے۔“

میں نے اس بحث میں بڑا مناسب نہیں سمجھا کہ وہ چوری چکاری جیسا غلط کام کیوں کرتا ہے اس کے بجائے وہ کوئی ذہنگ کانیک اور صالح کام کیوں نہیں کرتا۔ یہ میرا مقصد بھی نہیں تھا اور نہ ہی حالات کا تقاضا۔ میں نہایت احتیاط کے ساتھ خوشیا کی زبان سے اپنے مطلب کی باتیں اگوانا چاہتا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ میں کوئی ایسا سوال نہ کروں جس سے وہ بدک جائے۔

میں نے پوچھا ”کیا کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ چوری شدہ مرغیاں تم دوسرے گاؤں کے بجائے اپنے ہی گاؤں کے کسی فرد کے ہاتھ فروخت کر دو؟“

”عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔“ اس نے بتایا۔

”اس کا مطلب ہے خاص طور پر ایسا ہو سکتا ہے؟“

”جی۔۔۔ جی۔“ وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

میں اسے آہستہ آہستہ ٹھس رہا تھا۔ میں نے گہری دلچسپی لیتے ہوئے خوشیا سے پوچھا ”کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ تم کس طریقے سے مرغیاں پکڑتے ہو۔ مجھے یقین ہے وہ کوئی عام سا طریقہ تو نہیں ہوگا۔“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ تصدیقی انداز میں بولا ”عام طریقے سے مرغی قابو کرنے میں یہ خطرہ بہر حال موجود ہوتا ہے کہ مرغی شدید مزاحمت کے طور پر ککڑانا شروع کر دے۔ اس طرح دوسرے لوگ اس طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔“

اس کے بعد خوشیا نے مرغیاں پکڑنے کے دو کامیاب طریقے بیان کیے۔ پہلا طریقہ سادہ اور آسان تھا۔ کوئی گیلا تو لیا اچانک مرغی پر ڈال دیا جائے اس طرح بوکھلاہٹ میں وقتی طور پر مرغی سانس لینا بھول جاتی ہے۔ متوجش حالت میں اس مرغی کو آسانی سے قابو کر لیا جاتا ہے۔

دوسرا طریقہ قدرے پیچیدہ اور مشکل تھا مگر یہ زیادہ فائدہ مند ہے۔ اس طریقے کے مطابق جھوٹے ساز کی ایک کوڑی میں دھاگا بھنسا کر اس کو پھندے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ کوڑی کو گندھے ہوئے آٹے میں لپیٹ لیا جاتا ہے اور جس مقام پر مختلف مرغیاں دانہ ڈنکا چنگ رہی ہوں وہاں کوڑی کو بھیج دیا جاتا ہے اور دھاگے کے دوسرے سرے کو مضبوطی سے تھام کر تھوڑے فاصلے پر کھڑے ہو کر گنگرائی کی جاتی ہے۔ جب کوئی مرغی آٹا لپٹی ہوئی کوڑی چگ جاتی ہے تو دھاگے میں واضح تناؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی موقع کو غنیمت جان کر دھاگے کو ایک ہلکا جھک دیا جاتا ہے۔ اس طرح وہ

کوڑی مرغی کے حلق میں پھنس جاتی ہے چنانچہ مرغی حلق میں سے کسی بھی قسم کی آواز نکالنے کے قابل نہیں رہتی اور بہ آسانی اس پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ بعد ازاں کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر اس کے حلق سے کوڑی نکال لی جاتی ہے۔

خوشیا کی تکنیکی وضاحت ختم ہوئی تو میں نے دریافت کیا ”تم ان میں سے کون سا طریقہ اپناتے ہو؟“

”کوڑی والا طریقہ جناب۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے استفسار کیا ”اس کی کوئی خاص وجہ؟“

”یہ زیادہ محفوظ اور یقینی طریقہ ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”تو لیے والے طریقے سے مرغی کا تعاقب کرنا پڑتا ہے جس کے نتیجے میں مرغی اپنی مخصوص زبان میں شور مچا کر لوگوں کو اس جانب متوجہ کر سکتی ہے جب کہ آٹے کی لپٹی ہوئی کوڑی والے طریقے میں شکار یعنی مرغی کے نزدیک جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔“

میں نے اصل مقدمہ کی طرف آتے ہوئے سوال کیا ”خوشیا! پچھلے ایک دو ماہ سے جو مرغیاں تمہارے گاؤں سے غائب ہوں میں ان میں زیادہ تر دکانی مرغیوں کی ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟“

وہ جڑبڑہوتے ہوئے بولا ”بس جی ایک خاص آرڈر سامنے آ گیا تھا۔“

”کس قسم کا آرڈر خوشیا؟“ میں نے چونکتے ہوئے اسے دریافت کیا۔

وہ نگاہ چراتے ہوئے ٹالنے والے انداز میں بولا ”بس جی اسی ایک پارٹی۔“

”تم واضح طور پر کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔“ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا ”جس

کا مطلب یہی ہے کہ اب تم جھوٹ کا سہارا لینے کے بارے میں سوچ رہے ہو۔“

”اور اگر تم نے کسی غلط بیانی سے کام لیا تو اچھا نہیں ہوگا خوشیا۔“ حوالدار جمعہ خان نے قہرناک

نظر سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

وہ سہم کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا ”خوشیا! اگر میں تمہارے ساتھ

زری کا برتاؤ کر رہا ہوں تو اس کی صرف ایک ہی وجہ ہے اور وہ یہ کہ تم نے ابھی تک بھرپور تعاون کیا ہے

لیکن اگر تم نے حقائق کو چھپانے یا توڑ سوز کرنے کی کوشش کی تو پھر تمہارا برا حشر کیا جائے گا۔ ہم

مجرموں سے جس طرح پیش آتے ہیں تم اس کا تصور کر کے بھی کانپ اٹھو گے۔“

وہ فوراً لائن پر آگیا۔ ”جناب! میں نے مرغیاں چرا تے وقت کبھی اس بات کا خیال نہیں رکھا تھا کہ وہ کالی ہیں یا سفید، بھوری ہیں یا پت کبری۔ میں تو مرغی چور ہوں مرغیاں چرا تا میرا کام ہے چاہے وہ کسی بھی رنگ و نسل کی ہوں۔“ ایک لمحے کو وہ سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”کالی مرغیاں میں خاص طور پر ایک شخص کی فرمائش پر چوری کر رہا ہوں۔“

”میں اسی شخص کا نام جاننا چاہتا ہوں۔“ میں نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔

”جناب!“ وہ متامل دکھائی دینے لگا ”اگر اسے پتا چل گیا کہ میں نے آپ کو اس بارے میں بتا دیا ہے تو وہ مجھے شدید ترین نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔ اس نے مجھے سختی سے تاکید کر رکھی ہے کہ کسی صورت میں اس کا نام سامنے نہیں آنا چاہیئے۔“

”کیا وہ کوئی بہت خطرناک شخص ہے؟“

”پتا نہیں وہ خطرناک ہے یا خوف ناک۔“ وہ معربیت سے بولا ”لیکن وہ ایک طاقت ور انسان ہے۔ میں کسی بھی طرح اس کی دشمنی مول نہیں لے سکتا۔ اس نے مجھے زبان بندی کی تلقین کی تھی۔“

میں نے کہا ”تم صرف اس شخص کا نام بتاؤ باقی سب کچھ مجھ پر چھو دو۔ میں اس طرہم خان کو دیکھ لوں گا وہ کتنے پانی میں ہے۔ اس سلسلے میں تمہارا نام کہیں نہیں آئے گا یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ تم اس طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔ میں اپنے طور پر اس طرح کارروائی کروں گا کہ تمہاری طرف کسی کا شک نہیں جائے گا۔“

وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگا پھر اس نے اس شخص کا نام بتا دیا۔

میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی۔ وہ نام میری توقع کے عین مطابق تھا۔ خوشیا کے توسط سے کالی مرغیاں چرانے والا شخص کوئی اور نہیں بلکہ ملنگ کا لیا تھا۔ مجھے شروع ہی سے ملنگ پر شبہ تھا۔ میں اس قسم کے جعلی عاملوں اور بیروں فقیروں کی رگ رگ سے واقف ہوں اور ان کے طریقہ واردات سے بھی آگاہی رکھتا ہوں۔

اب یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا تھا۔ اگر ملنگ کا لیا عابدہ خانم کے گھر کو جادو زدہ ثابت کرنے کے لیے مختلف ہتھکنڈے آزما رہا تھا تو اس میں اس کا کون سا مفاد پوشیدہ تھا؟ ایک بات تو سامنے کی تھی اور عابدہ مجھے ابھی اس بارے میں بتا چکی تھی۔ ملنگ کا لیا بتول کے علاج معالجے اور جادو نوٹنے کے کھاتے میں ان سے گاہے بے گاہے رقیں وصول کرتا رہتا تھا مگر ذہن اس سے بھی آگے سوچ رہا تھا۔

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے مقاصد کچھ اور بھی ہوں۔

میں نے خوشیا کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا ”تم کالی مرغیاں چرا کر ملنگ کالیا کے حوالے کرتے تھے یا کسی اور شخص کو دیتے تھے؟“

”جناب! اس سلسلے میں ملنگ بابا کی مجھ سے براہ راست کبھی بات یا ملاقات نہیں ہوئی۔“ خوشیا نے بتایا ”ملنگ کے ڈیرے پر اس کا ایک خادم بھی ہوتا ہے۔ اس کا نام حنیف ہے اور وہ ایک آنکھ سے کٹا بھی ہے۔ اسی شخص نے مجھ سے کہا تھا کہ ملنگ بابا کو کالی مرغیوں کی ضرورت ہے۔ میں جب بھی ملا حنیف کاٹنے ہی سے ملا تھا۔“

”کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ ملنگ کالیا ان مرغیوں کا کیا کرتا ہوگا؟“

”ملنگ جادوؤں نے اہلیات کا ماہر ہے جناب۔“ وہ سر اسیدہ لہجے میں بولا ”ممکن ہے وہ کالی مرغی کے خون سے کوئی مل کر رہا ہو۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا۔ ملنگ کالیا حکمت وغیرہ کا کام بھی کرتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے وہ کالی مرغی کو کسی کشتے یا نڈھ میں استعمال کرتا ہو۔“ ایک لمحے کا توقف دے کر وہ سادہ لہجے میں بولا ”مجھے میرے کام کا اچھا معاوضہ مل رہا تھا اس لیے میں نے اس سلسلے میں اپنا دماغ کھپانے کی کوشش نہیں کی کہ ملنگ بابا مجھ سے حاصل شدہ کالی مرغیوں سے کیا کرتا ہوگا۔“

پہلے میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ ممکن ہے ملنگ کالیا خوشیا ہی سے وہ مرغیاں وغیرہ عابدہ کے گھر کے صحن میں چھنکواتا ہوگا لیکن خوشیا کے بیان نے میرے خیال کی تردید کر دی تھی۔ ملنگ کالیا کے خدمت گار حنیف کا نام سامنے آیا تو دھیان اس حوالے سے اس کی طرف چلا گیا۔ ملنگ اپنے کالے خادم سے یہ کام کروا سکتا تھا۔

میں نے خوشیا سے پوچھا ”تمہیں چوری کی مرغیوں کا معاوضہ کون دیتا تھا؟“

”ملنگ کا بندہ حنیف کاتا۔“ اس نے بتایا۔

”کیا تم عابدہ خانم یا منظور حسین کو جانتے ہو؟“

اس نے اثبات میں جواب دیا ”جی میں ان دونوں کو جانتا ہوں۔ یہ میاں بیوی ہیں۔ میرے ہی پنڈ میں رہتے ہیں۔ منظور چاچا کرپانے کی دکان کرتا ہے۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے سوال کیا ”کیوں کیا کوئی خاص بات ہے؟“

”عابدہ کی بیٹی سخت بیمار ہے۔“ میں نے کہا ”ملنگ کالیا اس کا علاج کر رہا ہے۔ سنا ہے کوئی کالے جادو وغیرہ کا چکر ہے۔“

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”ہاں جی یہ تو میں نے بھی سنا ہے۔ پورے گاؤں میں یہ مشہور ہے کہ بتول کی پھوپھی آسیہ بیگم نے اس گھر خاص طور پر بتول پر جادو ٹوٹا کر دیا ہے۔ مگر تھانے دار صاحب! مجھے تو اس بات میں سچائی نظر نہیں آتی!“

”کس بات میں خوشیا؟ میں نے پوچھا۔

”یہی کہ آسیہ بیگم نے جادو کر دیا ہوگا۔“

”تو حقیقت کیا ہے؟“

”حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے۔“ وہ اوپر چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”آسیہ بیگم اور اس کا گھر والا محمد علی تو بے چارے بہت شریف لوگ ہیں۔ وہ اس قسم کے گندے اعمال کے چکر میں نہیں پڑ سکتے۔“

میں نے اسے مزید کریدنا ضروری سمجھا اور کہا ”مجھے بتا چلا ہے یہ سارا چکر رشتے سے انکار کے بعد شروع ہوا ہے۔ عابدہ نے آسیہ کے بیٹے صدیق کا رشتہ ٹھکرادیا تھا۔ جواب میں انتقام کے طور پر آسیہ نے اس گھر اور ذول پر سفلی عمل کر دیا ہے۔“

وہ بولا ”رشتہ ٹھکرانے والی بات تو مجھے معلوم ہے اور اس انکار میں بھی عابدہ ہی کا ہاتھ تھا ورنہ منظور تو اپنے بھانجے کو کبھی مایوس نہ کرتا۔ وہ اس رشتے کی مخالفت میں نہیں تھا لیکن بے چارہ کیا کرے بیوی سے بہت ڈرتا ہے عابدہ کے سامنے اسے دم مارنے کی مجال نہیں۔“

اس کے بعد وہ تھوڑی دیر تک آسیہ بیگم اور عابدہ خانم کے بارے میں اپنی معلومات کا دریا بہاتا رہا جس کے مطابق آسیہ بیگم ایک سیدھی سادھی گھریلو عورت تھی جب کہ آسیہ کی بھالی عابدہ خاصی تیز طرار اور پنڈ قسم کی عورت تھی جس نے اپنے شوہر کے سر پر راستہ بنا رکھا تھا۔

خوشیا اپنا فصولی بیان ختم کر چکا تو میں نے پوچھا ”کیا تم نے کبھی ملنگ کالیا کو دیکھا ہے؟“

”کئی بار دیکھا ہے تھانے دار صاحب۔“ اس نے جواب دیا۔

”اس سے کبھی ملے بھی ہو کسی کام کے سلسلے میں؟“

”ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا۔“ اس نے بتایا ”بس دور دور ہی سے دیکھا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے تم کبھی اس کے ڈیرے یا آستانے پر نہیں گئے؟“

”جی بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ”ملنگ کالیا کا ذریعہ قبرستان کے نزدیک ہی ہے۔ میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کئی مرتبہ اس ڈیرے

کے پاس سے گزرا ہوں مگر آستانے کے اندر جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ ملنگ کا لیا کی جھلک میں کئی مرتبہ دیکھ چکا ہوں مگر وہ بدکبھی اس سے بات چیت یا ملاقات نہیں ہوئی۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا ”خوشیا! تم نے جتنی باتیں مجھے بتائی ہیں ان میں اگر ایک بھی غلط یا جھوٹی نکلے تو بس سمجھ لو میں تمہاری کھال کھینچ کر اسے کانٹوں والی تیری پر پھیلا دوں گا۔“

وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا ”تھانے دار صاحب! میں نے آپ سے ذرا سا بھی جھوٹ نہیں بولا۔ خدا پاک کی قسم! میں نے آپ کو ساری باتیں سولہ آنے بج بتائی ہیں۔ آگے آپ کی مرضی جو بھی تھیں۔۔۔ اور میرے ساتھ جس بھی قسم کا سلوک چاہے کریں!“

”ارم اپنے بیان میں سچے ہو تو میں تمہارے ساتھ بہت اچھا سلوک کروں گا خوشیا! میں نے تشفی آمیز لہجے میں اس کا حوصلہ بڑھایا ”تم اگر ملنگ کا لیا کی طرف سے کسی قسم کے خوف میں مبتلا ہو تو یہ ڈر اور اندیشہ اپنے ذہن سے نکال۔“

وہ بے یقینی کے تاثرات کے ساتھ مجھے تنگنے لگا۔ میں نے اس کا مزید حوصلہ بڑھاتے ہوئے مضبوط انداز میں کہا ”پہلی بات تو یہ کہ کسی بھی طرح ملنگ کا لیا یا اس کے چچے حنیف کا ناکویہ بات معلوم نہیں ہوگی کہ تم ہمیں کالی مرغیوں کے بارے میں بتا چکے ہو۔ اور اگر بالفرض وہ تمہارے بارے میں کسی شک میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو میں تمہاری مکمل حفاظت کا یقین دلاتا ہوں۔ ان میں سے کوئی تمہارا بال بھی بانکا نہیں کر سکتا۔ تم کسی بھی مرتلے پر کسی بھی قسم کا ڈر یا خوف، کوئی خطرہ محسوس کرو تو فوراً میرے پاس پلے آنا۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گا اور تمہارے ہر مخالف سے شادی و کادی نکال لوں گا۔“

وہ مطمئن لہجے میں بولا ”آپ کا بہت بہت شکریہ تھانے دار صاحب۔“

”اب تم جا سکتے ہو۔“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر جب وہ جانے کے لیے مڑا تو میں نے تاکیدی انداز میں کہا ”خوشیا! تم اپنے کسی عمل کی حرکت یا بات سے یہ ظاہر نہیں ہونے دو گے کہ تم ہمارے پاس تھانے آئے تھے اور میں نے تم سے ملنگ کا لیا اور کالی مرغیوں کے حوالے سے گفت و شنید کی تھی۔ خاص طور پر ملنگ کا لیا اور اس کے چچے حنیف کا ناکو اس ملاقات کی بھلک بھی نہیں پڑنا چاہیے!“

وہ فرماں برداری سے بولا ”آپ فکر نہ کریں جناب! میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا۔“

”اور یہ بات بھی یاد رکھنا۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا ”اب بھی اگر ملنگ کا لیا یا حنیف کا نام سے کسی قسم کی ”خدمت“ لینا چاہے تو تم انکار نہیں کرو گے لیکن کوئی بھی عملی قدم اٹھانے سے قبل تم مجھے اس کی اطلاع ضرور دو گے!“

”جی تھانے دار صاحب۔ میں یہ بات ذہن میں رکھوں گا۔“ وہ مر جھکا کر بولا۔
”بس تو پھر ٹھیک ہے۔“ میں مطمئن ہو گیا ”اب جو بھی ہوگا میں بھگت لوں گا۔ تم عام سے انداز میں اپنا کام جاری رکھو۔“

وہ سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

دو روز بعد میرے دروازے پر دستک ہوئی۔

میں اس وقت اپنے سرکاری کوارٹر میں آرام کی غرض سے لیٹا ہوا تھا۔ مذکورہ کوارٹر تھانے کے پچھواڑے واقع تھا۔ ان دنوں میری رہائش سرکاری کوارٹر ہی میں تھی۔ اس وقت رات کے دس بجے تھے۔ مجھے اس دستک پر حیرت نہیں ہوئی کیوں کہ اکثر کسی ضروری یا پہنچانی کام کے سبب مجھے کوارٹر سے بلایا جاتا تھا۔ عام طور پر میں نوبت کے رات تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر میں آ جاتا تھا۔

میں نے چار پائی چھوڑ دی اور دروازہ کھولنے کے لیے کوارٹر کے صحن میں آ گیا پھر جب میں نے کنڈی گرا کر دروازے کے پٹ کھولے تو اپنے سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ تھانے کا کوئی کانشیل نہیں بلکہ منظور حسین تھا۔ جی ہاں وہی منظور حسین جو بتول کا باپ اور عابدہ خانم کا شوہر تھا اور اپنے گھر ہی میں کریمانے کی دکان چلاتا تھا۔

رات کے دس بجے منظور حسین کو اکیلے اپنے کوارٹر کے سامنے کھڑا۔۔۔ دیکھ کر مجھے عیب سا احساس ہوا۔ اس وقت اس کی صورت پر تیرہ بج رہے تھے۔ وہ دو قسم کا شوہر تھا۔ رات کے اس پہر وہ اگر اکیلا میرے پاس آیا تھا تو اس کے دو مطالب ہو سکتے تھے۔ یا تو اس کی بیوی نے اسے گھر سے نکال دیا تھا اور یا پھر وہ بیوی کے خلاف کچھ کہنے میرے پاس آیا تھا۔“

میں نے یہ سب کچھ بہت تیزی سے سوچا اور منظور حسین کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ”کیا بات ہے منظور۔ تم اس وقت یہاں؟“

”پہلے مجھے اندر آنے دیں پھر بتاتا ہوں۔“ وہ بوکھلاہٹ آمیز نظر سے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے گھر کے اندر داخلے کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔

وہ کوائر کے مکن میں پہنچ چکا تو میں نے دروازے کی کنڈی چڑھاتے ہوئے سوال کیا ”ہاں“

اب بتاؤ۔ کیا بات ہے؟“

”تھانے دار صاحب! آپ مجھے خامے معقول اور سمجھ دار انسان لگے ہیں۔“ وہ سہمی ہوئی نظر

سے مجھے تکتے ہوئے بولا ”اس لیے میں نے سوچا اپنے دل کی بات آپ سے کہہ دوں۔ ممکن ہے“

آپ نہیں اور ہمارے گھر کو بچالیں۔ میں بہت چھپ چھپا کر راز داری سے یہاں آیا ہوں۔ میرے

سر والوں اور آپ کے تھانے والوں کو یہاں میری موجودی کے بارے میں کوئی خبر نہیں ہے۔“

میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ میں مزید کسی سوال یا جرح سے پہلے اسے کوائر کے

اکھوٹے کمرے میں لے گیا۔ مکن میں رکھے مٹی کے مٹکے میں سے پانی نکال کر اسے پلایا۔ جب اس کی

سانس اور حالت ذرا نامثل ہوئی تو میں نے اس سے پوچھا۔

’ہاں منظور! اب ’و‘ کیا معنی ہے؟‘

”آپ عابدہ کو تو اس بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے نا!“

”تم اپنی بیوی سے اتنا ڈرتے کیوں ہو؟“

وہ تامل کرتے ہوئے بولا ”وہ جی ہر معقول اور شریف انفس شہر اپنی بیوی سے ضرور ڈرتا ہے

خاص طور پر بچوں کی ماں کا پلڑا ہمیشہ بھاری رہتا ہے۔ میں تم بچوں کا باپ نہیں ہوں۔ آپ خود سمجھ دار

ہیں۔ میں زیادہ کیا بتاؤں!“

میں نے اس حوالے سے زیادہ جرح مناسب نہ سمجھی اور فوراً مطالب کی بات پر آ گیا ”ٹھیک

ہے منظور حسین!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے مخاطب کیا ”میں تمہاری بیوی کو تمہاری یہاں

آمد اور اس ملاقات کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ اب بولو کون سا مسئلہ تمہیں اس کیخ لایا

ہے۔۔۔۔ اور اس وقت؟“

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا ”تھانے دار صاحب! ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے کہا تھا کہ آپ

نہیں اور ہمارے گھر کو بچالیں۔ میں اسی سلسلے میں آپ سے ملنے آیا ہوں۔“

میں پوری توجہ سے اس کی بات سننے لگا۔ وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اپنا دکھڑا رونے لگا۔

”تھانے دار صاحب! چند روز پہلے جب آپ ہمارے گاؤں آئے تھے تو میرے گھر کی بیٹھک

میں آپ نے مجھ سے پوچھا تھا کہ بتول کا علاج کسی حکیم یا ڈاکٹر سے کیوں نہیں کروانا! اس وقت میں

نے آپ سے یہی کہا تھا کہ بتول سخت قسم کے جادوؤں کے اثر میں پکڑی ہوئی ہے اس لیے عامل

کامل ملنگ کا لیا ہے اس کا علاج کر دیا جا رہا ہے۔“ وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے

ہوئے بولا۔

”بات دراصل یہ ہے کہ ملنگ بابا سے علاج کروانے کی ضد عابدہ کی تھی۔۔۔۔ اور ہے۔ اس کے

خیال میں بتول جس سفلی عمل میں جکڑی ہوئی ہے اور اس کا توڑ صرف اور صرف ملنگ کا لیا کے پاس ہی

ہے۔ میں بھی اب تک یہی سمجھ رہا تھا اور سب کے سامنے عابدہ کی زبان بولتا رہا ہوں مگر اب پانی سر

سے اونچا ہو رہا ہے۔ اگر اب بھی میں آپ کے سامنے اپنے دل کا احوال بیان نہیں کروں گا تو ممکن ہے“

میرا دماغ پھٹ جائے۔“

اتنا کہ کردہ خاموش ہو گیا اور امید افزا نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا ”اب ایسا کیا ہوگا ہے منظور کہ تم محسوس کر رہے ہو پانی سر سے اونچا ہو رہا ہے؟“

میرے لہجے میں دوستانہ ہمدردی کی آمیزش تھی۔

وہ ہمت کرتے ہوئے بولا ”تھانے دار صاحب! اب تک تو ملنگ کا لیا مختلف قسم کے ید رنگ اور

بد ذائقہ محلول پلا کر بتول کا علاج کر رہا تھا اور ہم سے ہر پھیرے میں ایک مخصوص رقم بھی بنور کر چلا جاتا

تھا۔ ہم جادوئی اثرات کے توڑ اور بتول کی صحت یابی کے لیے سب کچھ برداشت کر رہے تھے مگر کل

رات عابدہ نے مجھے ایک ایسی بات بتائی ہے کہ ملنگ کا لیا مجھے سراسر فریڈ نظر آنے لگا ہے۔ وہ انتہائی

لاچکی اور کمینہ فطرت ثابت ہو رہا ہے۔ مجھے تو یقین ہو رہا ہے کہ بتول کی بیماری میں سب سے زیادہ

ہاتھ اسی کا ہے۔ اس کی دی ہوئی دوائیں اور محلول ہی بتول کو بیمار ڈالنے کا سبب ہیں۔ وہ ایک خاص

مکر وہ مقصد کے تحت اپنی چالیں چل رہا تھا اور ہم بے خبری میں آہستہ آہستہ اس کے جال میں پھنستے

چلے جا رہے تھے۔“

یہاں تک پہنچتے پہنچتے اس کی سانس پھول گئی۔ میں نے پوچھا ”کل رات عابدہ نے تم سے ایسی

کیا بات کہہ دی جو ملنگ کا لیا پر سے تمہارا یقین اور اعتقاد اٹھ گیا ہے؟“

”تھانے دار صاحب! عابدہ نے مجھے بتایا کہ ملنگ بابا ان تمام مسائل کا صرف ایک ہی حل بتا

رہے ہیں۔ اگر ہم نے ان کی بات نہ مانی تو پھر ہمیں تباہی اور بربادی سے کوئی بچا نہیں سکے گا۔“

میں نے پوچھا ”ملنگ کا لیا نے تمہارے مسائل کا کون سا حل بتایا۔۔۔۔ اور وہ اپنی کون سی بات

ماننے کو کہہ رہے ہیں؟“

منظور تھوڑی دیر تک تذبذب کے عالم میں رہا پھر ہچکچاتے ہوئے بولا ”جناب! ملنگ بابا نے کہا ہے کہ اگر ہم جادوی اثرات سے نکلنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس گھر کو چھوڑنا ہوگا۔ بہتر یہی ہوگا کہ ہم اپنا گھر بیچ دیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں ایک خریدار پارٹی بھی تلاش کر لی ہے۔“

وہ خاموش ہو کر زخمی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں اس کی بجز روح نگاہی سے سمجھ گیا کہ معاملہ یہاں پر ختم نہیں ہو جاتا جتنا وہ بیان کر چکا بلکہ اس سے آگے بھی بہت کچھ ابھی باقی ہے۔ چنانچہ اپنے ان کی تصدیق کے لیے میں نے اسے ٹولا۔

”منظور! یہ تو کوئی ایسی بات نہیں جس کی بنا پر تم ملنگ کالیا کو شک اور بے یقینی کی نظر سے دیکھو؟“

”اپ ٹھیک کہتے ہیں تھانے دار جی۔“ وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا ”سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ ملنگ بابا بتول کا جو علاج بتا رہے ہیں وہ میرے لیے قابل قبول نہیں ہے۔“

میں نے کہا ”تو کیا گھر کی جبری فروخت سے بتول کا بھلا نہیں ہوگا؟“

”گھر چھوڑنے یا فروخت کرنے سے تو گھر کی مصیبت دور ہوگی۔“ منظور نے کالیا کی زبان سے بتایا ”جب کہ بتول کو سحری اثرات سے نکالنے کے لیے ہمیں کالیا کے ایک ذاتی منصوبے پر سر جھکانا ہوگا۔ اگر ہم اس کی بات خاموشی سے مان لیں تو بتول کی جنگ ہو جائے گی۔“

میرا ماتھا ٹھکا۔ میں نے سیکھے لہجے میں استفسار کیا ”اور ملنگ کالیا کا ذاتی منصوبہ کیا ہے۔ وہ تم لوگوں سے اپنی کون سی بات منوانا چاہتا ہے؟“

”وہ چاہتا ہے ہم بتول کی شادی اس سے کرویں۔“ منظور سے شکستہ لہجے میں بتایا۔

”لاحول ولا قوۃ“ بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

منظور حسین رحم طلب نظر سے دیکھنے لگے۔ مجھے اس کی حالت پر بہت افسوس بھی ہوا اور میں نے اپنے دل میں اس کے لیے گہری ہمدردی بھی محسوس کی۔ میں نے کھوجنے والے انداز میں اس سے دریافت کیا۔

”اور تمہاری بیوی عابدہ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟“

”وہ ملنگ کالیا سے بہت متاثر ہے۔“ اس نے جواب دیا ”وہ ملنگ کی بیہودہ باتوں پر یقین رکھتی ہے اور اس کا خیال ہے کہ اگر ہم نے ملنگ بابا کی بات نہ مانی تو واقعی ہم تباہ و برباد ہو جائیں

گے۔ وہ مکان بیچنے کے ساتھ ساتھ بتول کو بھی اس کے نکاح میں دینے کے لیے تیار ہے۔“

”ایسا ہرگز ہرگز نہ ہونے دینا منظور حسین۔“ میں نے قطعیت سے کہا۔

”میری تو یہی کوشش ہے کہ ایسا نہ ہو۔“ وہ بے چارگی سے بولا ”اسی لیے تو آپ کی مدد لینے رات کے اس وقت آپ کے پاس آیا ہوں۔ عابدہ کے سامنے میری تو پیش نہیں چلتی۔ وہ میری بات کو اہمیت دیتی ہے اور نہ ہی مجھے کسی کھاتے میں گردانتی ہے۔ اگر آپ کسی طرح اس معاملے میں میری مدد کریں تو بات بن سکتی ہے۔ ملنگ کالیا جادو ٹوٹنے اور دیگر عملیات کے حوالے سے اچھی خاصی شہرت رکھتا ہے۔ گاؤں کے لوگ اس سے مرعوب اور ڈرے سہمے رہتے ہیں پھر عابدہ خود اس کی ہم خیال ثابت ہو رہی ہے۔ وہ نادان ملنگ کے جھوٹے وعدوں پر بھل رہی ہے اور یہی کو جنہم رسید کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو چکی ہے۔ اب آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟“

اس کی کسمپرسی کو میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ ایک ایسا زن مرید شوہر تھا جو اپنی بیٹی کے لیے دل میں بہت درد رکھتا تھا اور اس کو تباہی سے بچانا چاہتا تھا مگر بے بس اتنا تھا کہ از خود کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ دوسری جانب ملنگ کالیا کے عزائم بھی اب کھل کر میرے سامنے آ گئے تھے۔ وہ خبیث خصلت شخص بتول جیسی نوعمر حسین و جمیل لڑکی پر رال نیکار ہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ گھر کی فروخت کے سلسلے میں بھی وہ کسی جعلی پارٹی کو سامنے لا کر منظور اور عابدہ کا مکان ان سے تھینا نا چاہتا تھا۔ خوشا مجھے بتا چکا تھا کہ وہ کالی مرغیاں چرا کر کالیا کے خدمت گار حنیف کا تانک پہنچاتا تھا۔ اب یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی کہ عابدہ اور منظور کے گھر کے صحن میں پائی جانے والی مرغیاں، بیٹی کتا اور چوہے وغیرہ کالیا ہی کے ارسال کر رہے تھے۔ وہ ان ”حرکوں“ سے باور کرانا چاہتا تھا کہ اس گھر پر کالے جادو کا اثر ہے۔ بتول کے سلسلے میں وہ بڑی ”تن دہی“ سے کوشاں تھا اور اگلے سیدھے غلطیوں پلا کر اسے ذہنی اور جسمانی طور پر اس قدر تار کارہ کر چکا تھا کہ وہ مردہ نظر آتی تھی۔ وہ ہوس پرست شخص معصوم بتول پر دانت تیز کر رہا تھا اور اپنے مخصوص ہتھکنڈوں سے اسے ”حاصل“ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق منظور حسین اینڈ فیملی تباہی کے دہانے پر کھڑے تھے۔

میں نے منظور کو دلا سادیتے ہوئے کہا ”تم اب اس سلسلے میں زیادہ پریشان نہ ہو۔ میں دیکھ لوں گا ملنگ کالیا اور اس کے عملیات کو۔ تم بس اپنی بیوی پر نگاہ رکھو! اور اسے سمجھانے کی کوشش کرو کہ وہ کالیا کو گھر میں داخل نہ ہونے دے۔“

”میں آپ کی ہدایت پر عمل کر دوں گا۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ”مگر عابدہ کو کسی بات

کے لیے قائل کرتا میرے بس کی بات نہیں۔ ملنگ کا لیا نے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھادی ہے کہ اگر بتول کی شادی اس سے نہ کی گئی تو وہ جادوئی اثرات کے باعث جان ہار بیٹھے گی۔ بتول کو زندہ رکھنے کا بس یہی طریقہ ہے کہ ملنگ سے اس کی شادی کر دی جائے۔“

میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا، ”تمہیں تھوڑا بہت سخت تو ہونا پڑے گا۔ ملنگ کا لیا زبردستی تیری بیٹی سے شادی نہیں کر سکتا۔ میں تو بس یہ کہہ رہا ہوں، تم اسے اپنے گھر میں داخل ہونے نہیں دینا۔ اگر وہ سلطان زبردستی تمہارے گھر میں داخل ہونا چاہے یا بتول سے ملنا چاہے تو تم فوراً مجھے اطلاع دینا۔ میں اس مردود سے خود ہی سنت لوں گا۔ بتول سے اس کا میل جول ٹھیک نہیں..... اور اس کی دی ہوئی تمام دوائیاں بھی فوراً بند کر دو۔“ ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے منظور کی آنکھوں میں جھانکا اور کہا، ”میں بہت جلد ملنگ کا لیا کے ذریعے کا ”دورہ“ کرنے والا ہوں۔ تم فکر نہ کرو اس موذی کا زہر میں نکال لوں۔ تم اپنے گھر اور گھر والوں کا خیال رکھو۔“

وہ قدرے اطمینان بخش حالات اس نظر آنے لگا۔ اس کے بعد میں نے اسے کالی مرغیوں کی چوری اور اس کے صحن میں ان کی ”آمد“ کا احوال حقیقی تحفہ الفاظ میں سنایا۔ میری باتیں سن کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ موتیت آمیز نظر سے مجھ کو دیکھنے لگا۔

میں نے کہا، ”منظور حسین! میں تمہارے گھر کے مسائل اور ملنگ کا لیا کی طرف سے بے خبریاں بے پروا نہیں ہوں۔ انشاء اللہ بہت جلد میں تمہیں کامیابی کا اطلاع دوں گا۔ تم اپنے گھر کے معاملات پر گہری نظر رکھو، بیرونی مسائل سے میں خود نمٹ لوں گا۔“

میری حوصلہ افزا باتوں نے اس کی ہمت بندھائی اور وہ قدرے مضطرب لہجے میں بولا، ”تھانے دار صاحب! میری بچی اس شیطانی چکر سے نکل آئے گی نا؟“

”ضرور نکل آئے گی۔“ میں نے پورے وثوق سے کہا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔ میں نے واضح الفاظ میں اسے بتایا، ”منظور حسین! اس ملاقات کا کسی سے ذکر نہ کرنا، خصوصاً اپنی بیوی کو تو اس کی ہوا بھی نہ لگنے دینا۔ میں خود بھی کسی دن تمہارے گھر آؤں گا اور تمہاری بیٹی بتول سے بھرپور ملاقات کروں گا۔ تم نے وہی کرنا ہے جو میں نے سمجھایا ہے۔ میں ذرا ملنگ کا لیا کو نٹول لوں پھر آئندہ لاکھ لاکھ بتاؤں گا۔“

وہ میری ہدایت پر عمل کرنے کا وعدہ کر کے میرے کوارٹر سے رخصت ہو گیا۔

سفلیات کے بزعم خود ماہر ملنگ کا لیا کا آستانہ قبرستان سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ آستانے کے قریب ہی سے ریلوے لائن گزرتی تھی جو بہت کم مصروف رہتی تھی۔ آستانے تک جانے کے لیے قبرستان کے اندر سے گزرتا پڑتا تھا۔ یہ ایک پگڈنڈی نما چھوٹا سارا راستہ تھا جس نے قبرستان کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔

میں حوالدار جمعہ خان کے ہمراہ کا لیا کے آستانے پر پہنچا تھا۔ اس وقت ہم سرکاری لباس میں تھے اور وہ دوپہر کا وقت تھا۔ ہم آستانے کے احاطے میں داخل ہوئے تو کا لیا کے خدمت گار حنیف کاٹا سے سامنا ہو گیا۔ اس کے یک چشم چراغ گل کو دیکھ کر میں نے فوراً سمجھ لیا کہ وہ حنیف ہی ہوگا۔ ہمیں وردی میں دیکھ کر وہ چونکا کیوں کہ آستانے پر پولیس کی آمد معمول کی بات نہیں تھی۔

وہ نرم لہجے میں بولا، ”مائی باپ! آپ نے کیوں تکلیف کی۔ کسی کے ہاتھ پیغام بھیج دیا ہوتا تو میں خود تھانے حاضر ہو جاتا۔“

”میں تم سے نہیں بلکہ تمہارے گرو کا لیا سے ملنے آیا ہوں۔“ میں نے اکھڑے لہجے میں کہا۔ حنیف کاٹا سے بات کرتے ہوئے میں عقابلی نظر سے آستانے کا جائزہ بھی لے رہا تھا حنیف نے میری بات کے جواب میں گڑبڑاتے ہوئے لہجے میں بتایا، ”ملنگ جی تو اس وقت ذریعے پر نہیں ہیں۔“

حنیف کے لہجے کی گڑبڑاہٹ نے مجھے بتا دیا کہ وہ دروغ گوئی سے کام لے رہا تھا۔ ویسے بھی تھوڑی دیر پہلے میں نے آستانے کے اندر کسی انسان کی ایک جھلک دیکھی تھی جو سیاہ لباس میں تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے حنیف سے بات کرتے دیکھ کر وہ سیاہ پوش کہیں چھپ گیا ہو اور ہماری گفتگو سننے کی کوشش کر رہا ہو۔ یہ احساس مجھے لاشعور طور پر تھا اور اس کے ساتھ ہی لاشعور مجھے یہ بھی سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ سیاہ پوش ملنگ کا لیا کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے بوکھلاہٹ میں مبتلا حنیف کانے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا، ”تمہارے گرو کھٹال ذریعے پر نہیں تو پھر کہاں گئے ہیں؟“

”وہ ساتھ والے گاؤں میں ایک مریضہ کا علاج کرنے گئے ہیں۔“ وہ کن آنکھوں سے آستانے کے اندرونی حصے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے چیختے ہوئے لہجے میں کہا، ”انہوں نے مریضوں کے علاج پر ہی کیوں کر باندھ رکھی ہے۔ کیا انہیں آس پاس کوئی مرد مریض نظر نہیں آتا؟“

اپنی بات ختم کرتے ہی میں نے حنیف کانے کی معطل آنکھ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ مزید گڑبڑا گیا اور آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔

میں نے آستانے کے اندر داخل ہونے کے لیے قدم بڑھائے تو حنیف کا نا اس طرح میرے سامنے آ گیا جیسے میرا راستہ روک رہا ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا ”سرکار! میں نے بتایا ہے، ملنگ جی یہاں نہیں ہیں۔ آپ اس ملاقات کو کل تک ٹال دیں۔ آج رات کو ملنگ جی آجائیں گے۔ آپ کل صبح تشریف لائیں تو وہ مل جائیں گے۔“

میں نے اسے ایک طرف ہٹاتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا ”میں ملنگ کا لایا کے بارے میں بری معلومات حاصل کرنے کے بعد ہی ادھر آیا ہوں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ اس وقت ڈیرے پر موجود ہے۔ تم جرح بول کر اپنے لیے مصیبت کو دعوت دے رہا ہو!“

اسی اثنا میں ایک سیاہ پوش پستہ قامت شخص ڈیرے کے اندرونی حصے سے نکل کر ہمارے سامنے آ گیا۔ اس کے لباس کی طرح اس کی رنگت بھی سیاہ ہی تھی۔ اس کے چہرے پر شیطانیت تاج رہی تھی اور اپنے طبع سے وہ ایک پیشہ ور میاں نظر آتا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ملنگ کا لایا کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر حنیف کا ”اس“ ”روہ صورت پستہ قامت شخص کو دیکھ کر جس طرح با ادب بالملاحظہ ہوشیار ہو گیا تھا اس سے بھی اس بات کی تشریح ہوتی تھی کہ وہ اس کا گرد گھٹنا لایا ہی تھا۔

ملنگ کا لایا نے ایک بے پروا سی نظر میرے اور جمعہ خان کے چہرے پر ڈالی پھر حنیف کانے سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا ”حنیف! کیا معاملہ ہے۔ صاحب بہادر کس سلسلے میں آئے ہیں؟“

ملنگ کا لایا کی آواز میں ایک عجیب سی گونج اور دب دبہ تھا۔ حنیف نے گھمکاتے ہوئے انداز میں کہا ”سرشدیہ آپ سے ملنے آئے ہیں۔“

”اور تم ہمیں دروازے سے ہی ٹھلانے کی کوشش کر رہے تھے۔“ میں نے مزید لہجے میں کہا ”تمہارے بیان کے مطابق تو ملنگ جی دوسرے گاؤں کسی مریضہ کا علاج کرنے گئے ہوئے تھے؟“

اس موقع پر ملنگ کا لایا نے اپنے چیلے کا تحفظ کیا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا ”تھانے دار صاحب! حنیف نے آپ سے جو کچھ کہا وہ میری ہدایات کے مطابق تھا۔ اس میں اس بے چارے کا کوئی قصور نہیں۔“ پھر وہ قدرے نرم اور دوستانہ انداز میں گویا ہوا ”آپ مجھ سے ملنے آئے ہیں یہ میری خوش قسمتی ہے۔ آپ میرے غریب خانے کے اندر تشریف لائیں۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے

اندر جانے کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔

میں اور جمعہ خان آستانے کے اندرونی حصے میں داخل ہو گئے۔ اس دوران میں حنیف کا نا لایا کا اشارہ پا کر نود گیارہ ہو چکا تھا۔ ملنگ کا لایا کے آستانے یا ڈیرے پر پہنچی چھتوں والے دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں ایک کمرے میں لے آیا جس کی آرائش اور ترتیب سے واضح تھا کہ وہ ملنگ کا لایا کا حجرہ خاص تھا۔ کمرے میں فرش نشست کا اہتمام کیا گیا تھا۔ کمرے کے مغربی کونے میں ملنگ کی نشست گاہ تھی جو ایک مخصوص قسم کی گدی پر مشتمل تھی۔ دیواروں کے ساتھ گاؤں کے لگے ہوئے تھے۔

ملنگ کا لایا اپنے لیے مخصوص نشست پر نیم دراز ہو گیا۔ میں اور جمعہ خان بھی گاؤں کیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ ملنگ کا انداز دوستانہ بلکہ میزبانانہ تھا چنانچہ میں نے بھی کسی قسم کا سخت رویہ اپنانے کے بجائے معتدل انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔

”ملنگ جی! ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے بتایا ہے کہ آپ کے خدمت گار حنیف نے آپ ہی کی ہدایات پر ہمیں آپ کے بارے میں غلط معلومات دی تھیں۔ آپ نے ایسی ہدایات کیوں جاری کی تھیں کیا آپ ہم سے ملنا نہیں چاہتے تھے۔ اور کیوں؟“

وہ زیر لب مسکرایا بولا ”یہ ہدایات خاص طور پر آپ کے لیے نہیں تھیں بلکہ میں نے حنیف سے کہہ رکھا تھا کہ کوئی بھی مجھ سے ملنے آئے تو اسے یہی بتایا جائے کہ میں کسی دوسرے گاؤں گیا ہوں۔“

”اس کی کوئی خاص وجہ تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں! اس نے مدبرانہ انداز میں گردن کو حرکت دی اور بتایا ”دراصل آج میں ایک خاص قسم کا چلہ کھینچنا چاہتا تھا اس لیے کسی بھی قسم کی بیرونی مداخلت نہیں چاہتا تھا۔ ملنے والے جب کسی کام سے آتے ہیں تو پھر بہت سا وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ خیر۔۔۔“

اس نے ”خیر“ پر دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں اس کے ”خیر“ میں پوشیدہ ”شر“ سے بہ خوبی آگاہ تھا۔ میری مردم شناس آنکھوں نے پہلی ہی نظر میں ملنگ کا لایا کا اندرونی اور بیرونی ایسکرے لے ڈالا تھا۔ وہ لالچی طبیعت، حریص فطرت، ہوس زدہ ذہنیت اور کینہ فحش رکھنے والا ایک عیار و سرکار پیشہ دروغی عامل و کال تھا۔ ایسے دھوکا باز اور چال ساز نام نہاد پہنچتے ہوئے افراد ہر ملک ہر شہر ہر گاؤں قصبے میں پائے جاتے ہیں۔ انسان اگر ذرا سی سمجھ بوجھ اور شعور رکھتا ہو تو ان نقاب پوش چہرہ دو بے نقاب کیا جاسکتا ہے۔

میں نے ملنگ کا لیا کے نرم رویے کا جواب اسی انداز میں دیا اور انفسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا ”ملنگ جی! ہماری آمد سے آپ کی چلہ کشی میں رخنہ پڑ گیا مگر کیا کریں! ہمیں آپ کی اس مخصوص مصروفیت کا علم نہیں تھا ورنہ کسی اور وقت آ جاتے۔“

”اب آ ہی گئے ہیں تو بچھتا نے یا انفسوس کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔“ وہ رعونت سے بولا ”میں اپنے چلے کو ایک دن کے لیے آگے بڑھا دیتا ہوں۔“ پھر وہ براہ راست مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا ”بلکہ صغیر حیات صاحب! میں آپ کو کافی عرصہ سے جانتا ہوں مگر ہماری ملاقات آج پہلی مرتبہ ہوئی ہے۔ خیر فرمائیں۔ آپ کو اس زحمت کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟“

اس نے مجھ سے آشنا کی جادوئی کیا تھا وہ ایک طرف تھا اور اس میں کسی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ کسی بھی قسم اور نوعیت کے جرم میں ملوث افراد اپنے علاقے کے تھانے دار کو یہ خوبی پہنچاتے ہیں۔ اس حوالے سے ملنگ کا لیا کا انکشاف میرے لیے چونکا دینے والا نہیں تھا۔ میں نے اس کے استفسار کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”ملنگ جی! میں بتول کے سلسلے میں آپ سے بات کرنے آیا ہوں۔“

”بتول!“ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا ”کون بتول؟“

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے ”وہی بتول جنمظور حسین کریمانہ والے کی بیٹی ہے اور دو چار ماہ سے آپ جس کا علاج فرما رہے ہیں۔“

وہ میرے لہجے میں پوشیدہ ترشی کو محسوس کرتے ہوئے مختلط ہو گیا اور ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا ”اچھا اچھا وہ بتول۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ وہ لڑکی بے چاری بہت محنت زدہ ہے۔ اس پر نہایت ہی سخت قسم کا گندامل کیا گیا ہے۔ یہ رشتے واریاں بھی کیا چیز ہوتی ہیں۔“ وہ فلسفیانہ انداز میں خلا میں گھورتے ہوئے بولا ”ذرا ذرا سی بات پر لوگ دشمنی پر آتے ہیں۔ اب آپ آسیر کو ہی لے لیں۔ عابدہ نے بتول کے رشتے سے کیا انکار کر دیا وہ جادو نو نے پر آتے آئی اور مصوم بتول کی زندگی اس نے تباہ کر کے رکھ دی ہے۔“

میں ملنگ کا لیا کی اداکاری کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا مگر یہ داد میں نے دل ہی دل میں دی تھی۔ وہ چہرے کے تاثرات میں کمال رکھتا تھا مگر میں یہاں مکالمہ بازی کے لیے نہیں آیا تھا۔ میں نے الفاظ کو طنز کی چادر میں لپیٹتے ہوئے ملنگ کا لیا کی جانب بڑھا دیا۔

”ملنگ جی! مجھے پتا چلا ہے آپ تباہ حال بتول کو آباد کرنے کے چکر میں لگے ہوئے ہیں؟“

میں نے لفظ ”آباد“ اور ”چکر“ پر خصوصی زور دیا تھا۔ وہ تمللا کر رہ گیا تاہم اس کے چہرے سے کوئی خاص ناگواری ظاہر نہیں ہوئی۔ وہ حتی الامکان سنجیدہ لہجے میں بولا۔

”ملنگ صاحب! میں تو یہاں بیٹھا ہی اسی لیے ہوں۔ جو بھی ضرورت مند اور مصیبت زدہ میرے پاس آتا ہے اس کی مدد ضرور کرتا ہوں۔ بتول بھی میرے زیر علاج ہے۔ انشاء اللہ وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گی۔“

میں نے چہیتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا ”بتول کو بیماری کیا ہے؟“

”اس پر سخت قسم کا سہلی کیا گیا ہے۔“

”اور اس کے گھر پر؟“

”وہ گھر بھی نادیہ حصار سے باندھ دیا گیا ہے۔“

”ان حرکات کا مذمہ دار کون ہے؟“

”بتول کی پھوپھی۔۔۔ آسیر بیگم“ وہ قطعیت سے بولا۔

میں نے پوچھا ”آپ کو یہ بات کیوں کر معلوم ہوئی ملنگ جی؟“

”حساب کتاب سے۔“ وہ جزبہ ہوتے ہوئے بولا۔

”آپ حساب کتاب کے اتنے ہی ماہر ہیں تو پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ بتول کب تک ٹھیک ہو جائے گی۔۔۔ اور اس گھر کی مصیبتیں کب ٹلیں گی؟“

اس نے میرے لہجے میں پوشیدہ تنیدی کو محسوس کر لیا اور میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولا ”تھانے دار صاحب! آپ کی باتوں اور انداز سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ آپ کو میری ذات پر کسی قسم کا شک ہو گیا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

میں نے اس کے سوال کا گول مول سا جواب دیا اور کہا ”ہماری تفتیش کی گاڑی شک کے پیروں ہی سے چلتی ہے ملنگ جی!“

وہ ہلکی سی جھپکاتے ہوئے بولا ”بہر حال میں آپ کو بتا دیتا چاہتا ہوں کہ بتول کا معاملہ بہت اہم اور پیچیدہ ہے۔ وہ کوئی عام قسم کے جادو کے اثرات میں نہیں ہے۔ میں نے روزمرہ اور معمول کی تمام کوششیں کر کے دیکھ لی ہیں مگر بات نہیں بن سکی۔۔۔۔۔“

میں نے قطع کاہی کرتے ہوئے کہا ”گویا اب غیر معمولی قسم کی کوشش کا ارادہ رکھتے ہیں!“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور کہا ”آپ بہت گہری باتیں کرتے ہیں ملنگ صاحب!“

”آپ بھی تو بہت گہری چالیں چلتے ہیں ملنگ جی!“ میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے کہا۔

وہ ایک جھرجھری لے کر رہ گیا تاہم سنہلے ہوئے لہجے میں گویا ہوا ”ملک صفدر حیات صاحب! آپ بھی کیا پیلایاں بکھو رہے ہیں۔ صاف صاف کہیں جو بھی کہنا چاہتے ہیں۔ ہم سے کیا پردہ۔ میں آپ سے کوئی باہر تھوڑا ہی ہوں!“

اس نے یہ جملے بڑے اعتماد سے ادا کیے تھے۔ میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے کہا ”صاف صاف کہا ہوا سننے کا حوصلہ ہے آپ میں ملنگ جی؟“

وہ مختصر انداز میں مسکرایا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”ہے حوصلہ مجھ میں بہت حوصلہ ہے۔ آپ سے پہلے اس تھانے کے جوانچارج صاحب تھے ان سے میری اچھی سلام دعا تھی مگر آپ سے آج پہلی رجب ملاقات ہو رہی ہے۔ آپ جو بھی کہیں گے میں پوری توجہ سے سنوں گا اور آپ کے ساتھ پورا تعاون بھی کر لوں گا۔“

”ہوں“ میں نے معنی خیر لہجے سے اس کا جائزہ لیا اور کہا ”ملنگ جی! آپ خاصے یار باش ثابت ہو رہے ہو۔ لگتا ہے ہماری خوب نیچے گی۔“

یہ جملے میں نے اسے خوش کرنے کے لیے کہے تھے۔ میں خود کو اسی کے مزاج کا ظاہر کر کے اس کا اعتماد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مجھ سے پہلے والے تھانے دار سے شناسائی کا دعویٰ کر کے ملنگ کا لیا نے یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچادی تھی کہ وہ ایک بدقماش شخص تھا۔ اس کی یہ بات مجھے معلوم ہو چکی تھی کہ سابق تھانے دار ایک رشوت خور اور مجرموں کے ہاتھ مضبوط کرنے والا تھا نہ انچارج تھا اور یہ تو آپ نے سن رکھا ہوگا۔ کدہم جنس باہم جنس پرواز.....

ملنگ کا لیا نے کہا ”اللہ کرے ہماری خوب نیچے۔ میری تو یہ خواہش بھی ہے۔“ اسی دوران میں ملنگ کا چپلا خفیف کا نا ہماری خاطر تواضع کے لیے کھانے پینے کا کچھ سامان لے آیا۔ برتنوں کو ہمارے درمیان چھوڑ کر وہ واپس چلا گیا۔ ملنگ کے اصرار پر ہم نے تھوڑا تھوڑا لے لیا۔ کچھ دیر بعد میں نے حوالدار جود خان کے کان میں کہا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے باہر چلا جائے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ ملنگ کا لیا بات چیت کے دوران کئی بار مخصوص انداز میں جود خان کو دیکھ چکا تھا جس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ وہ تجلیے میں مجھ سے کچھ ”راز و نیاز“ کرنا چاہتا تھا۔

”یہ آپ نے عقل مندی کا کام کیا ہے۔“ حوالدار کے جاتے ہی کا لیا نے میری طرف دیکھتے

ہوئے سراہنے والے انداز میں کہا ”اب ہم زیادہ کھل کر بات چیت کر سکتے ہیں۔“

میں نے ذومعنی انداز میں کہا ”اب آپ بھی عقل مندی کا مظاہرہ کریں ملنگ جی۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ ادھر تھانے میں آج کل بہت مصروفیت چل رہی ہے۔“

”ہاں جی حکم کریں۔“ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔

میں نے کہا ”ملنگ جی! یہ بتول کا کیا پکڑ ہے؟“

”بہت مظلوم لڑکی ہے تھانے دار صاحب“ وہ ہمدردی بھرے لہجے میں بولا ”بے چاری پر اس کی پھوپھی نے بڑا ڈھٹ قسم کا گند اعل کر دیا ہے۔“

”یہ بات تو سبھی جانتے ہیں۔“ میں نے سناتے ہوئے لہجے میں کہا ”اور اس بات کو پھیلانے میں آپ کا ہاتھ ہے۔ آپ ہی نے یہ تشخیص کی ہے اور پیش گوئی بھی کی تھی کہ ان کے گھر کے مرن میں مردہ جو ہے بلیاں کتنے اور مرغیاں وغیرہ پڑی ملیں گی..... اور ایسا ہی ہوا بھی۔“ میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ”پھر آپ کا علاج شروع ہوا اور بتول بد سے بدترین حالت کو پہنچ گئی۔ آپ اس جادو کا توڑ کرنے میں ناکامیاب رہے اور بالآخر اس مصیبت سے مکمل نجات کے لیے آپ نے بتول کی والدہ کو جو مل بتایا وہ بتول کے لیے ہونہ ہو مگر آپ کے لیے بہت پرکشش اور سود مند ہے۔ بتول بہر حال ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی ہے جو اگرچہ چند روز تک آپ کے دیے ہوئے مملول استعمال کرنا چھوڑ دے تو اس کی رعنائی اور شادابی واپس آ سکتی ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”آپ تو سراسر مجھ پر رشک کر رہے ہیں۔“ وہ جیسے جیسے ہوتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا ”میں تو حقائق کا ذکر کر رہا ہوں۔ آپ چاہیں تو تردید یا تصدیق کر سکتے ہیں۔“

وہ چند لمحات تک کھوجتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر تحمل لہجے میں گویا ہوا ”دیکھیں ملک

صاحب! آپ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں میں نا تو مکمل طور پر اس کی تردید کروں گا اور نہ ہی تصدیق۔“

”یہ تو دو غلا پن ہوگا!“ میں نے کہا۔

”میرے نزدیک یہ دو غلا پن نہیں بلکہ حقیقت ہوگی۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

میں نے پوچھا ”وہ کس طرح ملنگ جی؟“

”وہ اس طرح ملک صاحب!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ”یہ بات بالکل سچ ہے

کہ بتول ایک گندے عمل کے زیر اثر ہے اور میرے حساب کتاب کے مطابق یہ سفلی عمل اس کی کسی

قریبی رشتے دار عورت نے کروایا ہے۔ غالب امکان آسہ بیگم کا ہے یہی میں نے عابدہ بیگم کو بتایا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ جادو ٹونا بہت سخت اور پائے دار ہے۔ میں کوشش کے باوجود بھی اس کا توڑ نہیں کر سکا چنانچہ۔۔۔“

وہ یہاں تک پہنچ کر رک گیا۔ میں نے اس کی ادھوری بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا ”چنانچہ آپ نے اس لڑکی کی شافی جھاڑ پھونک کے لیے اسے اپنے عقد میں لینے کی تجویز رکھی ہے؟“ بات ختم کرتے کرتے میرا لہجہ خاصا تلخ ہو گیا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے گڑبڑایا، تھوڑی دیر کے لیے اس کا ہر متغیر ہرا پھر سنہلے ہوئے بولا ”آپ کو یہ بات یقیناً عابدہ یا منظور نے بتائی ہوگی!“

”مجھے یہ بات کہیں سے بھی پتا چلی ہو، تمہیں اس سے غرض نہیں ہونا چاہیے۔“ میں غیر ارادی طور پر ”آپ“ سے ”تم“ پر آ گیا تھا۔ ملنگ کے لیے میرے دل میں غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا ”تم صرف یہ بتاؤ کہ میں سچ کہہ رہا ہوں یا نہیں؟“

وہ میرے بدلے ہوئے تو ہانپ گیا اور جواباً خشک لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا ”دیکھو ملنگ جی! اگر سچی بات سننا چاہتے ہو تو پھر جان لو اس لڑکی پر واقعی میرا دل آ گیا ہے۔ میں اسے دل و جان سے پسند کرنے لگا ہوں اور جائز طریقے سے اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے میرے چہرے کے اثرات کا جائزہ لیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”اور جہاں تک اس پر جادوئی اثرات کا تعلق ہے تو یہ بات اپنی جگہ اہل حقیقت ہے۔“

وہ بڑی صفائی سے اپنے علم اور عمل کی عزت بھی بچانا چاہتا تھا تا کہ اس کی شخصیت کا بھرم قائم رہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ بتول کی پسندیدگی اور اس سے جائز شادی کا ذکر کر کے خود کو راستہ شمس بھی ثابت کرنا چاہتا تھا۔ یہ اس کی عیاری اور چال بازی کا ایک عمدہ عملی مظاہرہ تھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”کسی کو پسند کرنا اور اس سے شادی کی خواہش کرنا کوئی جرم نہیں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ فریق ثانی کی مرضی اور اس کے لواحقین کی رضامندی بھی شامل ہو۔“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور مضبوط لہجے میں بولا ”آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس سلسلے میں بتول میرا ساتھ دینے کے لیے پوری طرح تیار رہے۔ وہ مجھ سے شادی کرنے پر رضامند ہے البتہ اس کے والدین کو منانا پڑے گا۔“

میرے لیے واقعی یہ ایک حیرت انگیز اطلاع تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بتول جیسی خوب صورت اور حسین و جمیل لڑکی ملنگ کا لیا جیسے کالے بھنگ کم روپستہ قد شخص سے شادی کی خواہاں ہوگی۔ میں نے ابھی تک بتول کو روپہ روئیں دیکھا تھا اس کے بارے میں تاہم جتنا سنا تھا اس کے مطابق وہ گاؤں کی خوب روتھ لڑکی تھی اور دوسری کوئی لڑکی اس کی مثال نہیں تھی۔ پھر عابدہ یا منظور کی زبانی مجھے جو حالات پتا چلے تھے ان کے مطابق بھی بتول ملنگ کا لیا میں کسی قسم کی دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ کالیا نے جو انکشاف کیا تھا اس سے یہی بات ثابت ہوتی تھی کہ وہ صدنی جھوٹ کا سہارا لے رہا ہے۔

لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ جھوٹ کا مقابلہ جھوٹ اور مکاری ہی سے کرنا چاہیے۔ اور جھوٹے کو اس کے گھرنک پنپنا کرا کر آنا چاہیے۔ ملنگ کا لیا ایک دروغ گو اور عیار خفص تھا میں نے اس کی چال اسی پر لوٹانے کا فیصلہ کر لیا اور آہستہ آہستہ اسے گھسنے لگا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو ملنگ جی۔“ میں نے پرسوج انداز میں کہا ”جب لڑکا لڑکی راضی تو پھر کیا کرے گا قاضی۔ بس تم ذرا بتول کے والدین کو بھی راضی کر لو تو پھر اچھی بات ہوگی۔“

وہ سمجھا میں اس کے چکر میں آ گیا ہوں۔ سنجیدگی سے بولا ”آپ فکر ہی نہ کریں ملک صاحب! میں تو خود بھی زور زبردستی کا قائل نہیں ہوں۔ ہر کام طریقے سے لیتے سے کرنا چاہتا ہوں۔ میری پوری کوشش ہوگی کہ عابدہ اور منظور اس رشتے کے لیے تیار ہو جائیں۔“

میں سوچنے لگا عابدہ تو صدیہا سے بیٹی یا بیٹے کو تیار نہیں ہوتی تھی، کالیا جیسے بد ہیئت شخص کے لیے وہ کس طرح آمادہ ہوگئی۔ بہر حال یہ تو ملنگ کا لیا کے خیالات تھے جو وہ مجھے متاثر کرنے کے لیے پیش کر رہا تھا۔ میں ان جان بنا رہا، فی الحال یہی مناسب تھا۔

”بالکل..... بالکل“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”سب کچھ میری پیش گوئی کے مطابق پیش آ رہا ہے۔“

”تمہیں یہ سب کچھ قتل از وقت کیسے معلوم ہو گیا تھا؟“

”میں نے جب پہلی مرتبہ بتول کو دیکھا تھا تو معاملے کی یہ تک پہنچ گیا تھا۔“ وہ گھمبیر لہجے میں گویا ہوا ”میں گزشتہ پندرہ سال سے عملیات کی دنیا میں ہوں۔ ایک نظر کسی سرزدہ شخص کو دیکھ کر اس کے بارے میں بہت دور تک تفصیل سے بتا سکتا ہوں۔“

میں نے اس کی تعلی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا ”ملنگ جی! امرہ کتے تک تو آپ کی ”پیش گوئی“ سچی ثابت ہوگئی ہے۔ اب حضرات انسان کی باری ہے۔“

”بہ جعفر ایسا ملک صاحب۔“ وہ مفکرانہ انداز میں خلا میں گھورتے ہوئے بولا ”اگر بتول کے والدین نے کچھ داری کا مظاہرہ نہیں کیا اور بتول کی شادی کے سلسلے میں کوئی اڑنگا لگانے کی کوشش کی تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

الفاظ ”کچھ بھی“ پر اس نے اچھا خاصا زور ڈالا تھا اور اس میں ایک خوفناک دھمکی بھی پوشیدہ تھی جس کا عیاں مطلب یہی تھا کہ اگر عابدہ اینڈ کمپنی نے ملنگ سے بتول کی شادی نہ کی تو ان کے گھر کے صحن میں کوئی مردہ انسان بھی پایا جاسکتا ہے اور اس کے بعد بتول کا خاتمہ ہو جائے گا۔

ملنگ کا لیا کا طریقہ واردات خاصا خطرناک اور موثر تھا۔ کوئی بھی ایسا شخص جو ”اندھوں میں کانٹا اچھا“ کی حیثیت رکھتا ہو اور سب لوگ اس سے مرعوب اور خوف زدہ ہوں وہ اگر کسی نوجوان لڑکی کے بارے میں اس قسم کی تہلیلہ خیز پیش گوئی کر دے تو اس لڑکی کے والدین لامحالہ اس کی بات مانے پر تیار ہو جائیں گے۔ ملنگ کا لیا جیسے عامل کامل انسانوں خصوصاً مجبور انسانوں کی نفسیات سے بہ خوبی آگاہ ہوتے ہیں اور معاشرے کی کبھی ہوئی رگ پر انگلی رکھ کر اپنی مرضی اور منشا کے مطابق کھی نکال لیتے ہیں۔

ملنگ کا لیا کے عزائم اور منصوبہ بندی کی تہ تک پہنچ چکا تھا۔ وہ بتول پر ہاتھ صاف کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے والدین کو گھر سے بے دخل بھی کرنا چاہتا تھا۔ منظور حسین نے مجھے بتایا تھا کہ مکان کے خریدار کی حیثیت سے ملنگ نے ایک پارٹی کا بندہ دست بھی کر لیا تھا۔ مجھے نہیں امید تھی کہ ایسا کوئی خریدار وجود بھی رکھتا ہوگا۔ یقیناً یہ ملنگ کا لیا کی کوئی گہری جال ہو سکتی تھی تاہم اس سلسلے میں میں نے ملنگ کو ٹوٹنا بھی ضروری جانا۔

”ملنگ جی! مجھے معلوم ہوا ہے کہ عابدہ اور منظور کا مکان خریدنے کے لیے کوئی گا کہ بھی لگ گیا ہے؟“ میں نے سادہ لہجے میں دریافت کیا ”اور وہ شخص تمہارا ہی کوئی جاننے والا ہے!“

وہ تصدیق کرتے ہوئے بولا ”آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔ میرا ایک جاننے والا اس مکان کو خریدنے میں دلچسپی لے رہا ہے۔ اگر منظور حسین راضی ہو گیا تو میں ان کے درمیان سودا کروادوں گا۔“

”تمہارے اس جاننے والا کا نام کیا ہے؟“ میں نے پوچھا ”اور وہ کہاں رہتا ہے؟“

ملنگ کا لیا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا ”اس کا نام فیروز علی ہے اور وہ ایک نزدیکی گاؤں میں رہتا ہے۔“

”کیا تم نے فیروز کو بتا دیا ہے کہ وہ مکان آسب زدہ ہے؟“

”نہیں“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”وہ کیوں بھی؟“ میں چونک اٹھا ”یہ تو کھلی بے ایمانی ہوگی۔ اس سے حقیقت چھپا کر تم دھوکا دے کر مرکب ہو گے۔“

وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا ”ایسی کوئی بات نہیں۔ فیروز کو میں یہ مکان بہت کم پیسوں میں دلوا دوں گا۔ وہ خوش ہو جائے گا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔“

میں اس کی خود غرضی اور شقی القلمی پر کھولی کر رہ گیا تاہم میں نے اپنے دلی جذبات کا اظہار کرنے کے بجائے پوچھا ”اور اگر بعد میں وہ آسب زدہ مکان فیروز علی کے لیے مصیبت کا باعث بن گیا تو پھر وہ بے چارہ تمہیں بددعاں دے گا۔“

”ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“ وہ پر اعتماد لہجے میں بولا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ مکان فیروز کے لیے مصیبت نہیں بنے گا۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے اس مکان کے حوالے سے آسب وغیرہ کی بات بالکل غلط کی ہے“ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا ”عابدہ کے مکان پر جادو ٹوٹنے اور گندے عمل کا کوئی اثر نہیں ہے۔“

وہ سنجیدگی سے بولا ”ملنگ جی! آپ معاملات کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکے اسی لیے الجھن کا شکار ہو رہے ہیں۔“

”میں سمجھ نہیں سکا تو تم آسان الفاظ میں سمجھاؤ۔“ میں اپنے چہرے پر ان جان تاثرات سجاتے ہوئے بولا۔ حالانکہ میں یہ بہ خوبی جان گیا تھا کہ وہ مجھے کوئی نیا پکڑ دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔

وہ دھیمی آواز میں گویا ہوا ”ملنگ جی! بات دراصل یہ ہے کہ وہ مکان صرف منظور حسین اور اس کے گھر والوں کے لیے جادوئی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے تمام برے اثرات صرف اور صرف بتول اور اس کے لواحقین کے لیے ہیں۔ وہاں کوئی بھی نیا سکین آئے گا تو وہ ان سفلی اثرات سے متاثر نہیں ہوگا۔ اس قسم کے گندے عمل ”نام مع والدہ“ کے مخصوص افراد کے خلاف ہی کیے جاتے ہیں دوسرے لوگ اس سے محفوظ رہتے ہیں۔“

وہ اپنی چرب زبانی اور عیاری سے خود کو بڑی خوب صورتی سے بچا لے گیا تھا۔ اس نے ایک ٹیکنیکل توجیہ پیش کی تھی۔ میں نے اس سلسلے میں زیادہ جرح نہیں کی۔ میں چاہتا تو ملنگ کا لیا کے ساتھ

اٹھانے سے قبل ایک ملاقات بتول سے کرنا چاہتا ہوں اور ملنگ کالیا کی اس دوران میں کڑی نگرانی بھی بہت ضروری ہے۔ ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ جعد خان نے کہا ”ملنگ کالیا پر ہمیں کیا ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے۔“

میں نے کہا ”کچھ بھی ہو کالیا اس گاؤں میں ایک طاقت ور شخصیت کا حامل ہے اور یہاں کے وسٹیک اس سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ ممکن ہے کسی نازک موقع پر عائدہ اور منظور بھی اسی کی طرف داری پر اتر آئیں۔ ایسی صورت میں ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔ کوئی بھی قانونی کارروائی کرنے کے لیے مدعی کا تعاون بہت ضروری ہوتا ہے۔ میں بتول سے تفصیلی ملاقات کر کے حالات کی صحیح صورت حال کا اندازہ لگا لوں پھر کوئی عملی قدم اٹھائیں گے۔“

ہم اسی نوعیت کی باتیں کرتے ہوئے تھانے آ گئے۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ دو ہوشیار قسم کے کانسیلر کو اپنے پاس بلا کر انہیں ملنگ کالیا اور اس کے ڈیرے کی کڑی نگرانی کا فرض سونپ دیا۔ ان دونوں نے سادہ لباس میں رہتے ہوئے اپنی ڈیوٹی نبھانے اور جیسے ہی کوئی غیر معمولی بات محسوس کرتے ان میں سے ایک فوراً مجھے اطلاع دینے کے لیے تھانے آ جاتا۔ میں نے انہیں کسی بھی قسم کی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کی کھلی اجازت بھی دے دی تھی۔

یہ بندوبست کر کے میں مطمئن ہو گیا۔ میں نے اپنے تمام مہرے اہم مقامات پر اسادہ کر دیئے تھے اور ہر قسم کی چال چلنے کے لیے ذہنی طور پر چاق و چوبند تھا۔

☆☆☆

میں اس وقت اے ایس آئی شوکت مرزا کے ساتھ عابدہ خانم کے گھر کے صحن میں کھڑا تھا۔ ہمیں ہنگامی طور پر یہاں آنا پڑا تھا۔ حوالدار جعد خان طبیعت کی خرابی کے باعث اس روز چھٹی پر تھا لہذا میری ہر ای کے فرائض اے ایس آئی شوکت مرزا کو ادا کرنا پڑ رہے تھے۔ ملنگ کالیا سے ملاقات کیے دو روز گزر چکے تھے۔ لیکن میں ابھی تک بتول سے ملنے نہیں جاسکا تھا اور اب ایک اطلاع پر ہمیں وہاں آنا پڑ گیا تھا۔

اس روز بھی میں تھانے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ منظور حسین روتا دھوتا میرے پاس پہنچ گیا تھا اور اس نے وحشت ناک اطلاع دی تھی وہ ہمیں اس کے گھر فوراً پہنچنے کا سبب بن گئی تھی۔ مذکورہ روز جب اس گھر کے مکین سو کر اٹھے تو گھر کے صحن میں ایک انسانی بازو پڑا ہوا تھا۔ اس بازو کو انسانی جسم کے شانے سے کاٹا گیا تھا اور اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ کسی خوبصورت عورت کا

سخت قسم کا روتہ بھی اختیار کر سکتا تھا لیکن میں اس شاطر کو اسی کی بساط پر شہ مات دینا چاہتا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ بہت سنبھل کر تحلی مزاجی سے اس کھیل کو کھیل جائے اور میں یہی کر رہی رہا تھا۔ خوشامرغی چور کے حوالے سے بھی میرے پاس ملنگ کے خلاف اچھا خاصا مواد موجود تھا۔ میں اسے کسی خاص موقع پر استعمال کرنا چاہتا تھا۔

میں تھوری دیر مزید ملنگ کالیا کے ڈیرے پر رکار ہا پھر حوالدار جعد خان کے ساتھ واپس آ گیا۔ ملاقات میں میں نے ملنگ پر یہی تاثر چھوڑا تھا کہ مجھے اس پر تھوڑا شک تھا جواب جاتا رہا تھا اور میں اس کی طرف سے مطمئن ہو کر وہاں سے جا رہا تھا۔ اس پر یہ تاثر قائم کرنا ضروری تھا تا کہ آئندہ جو بھی کرنا تھا وہ اپنے پروگرام کے مطابق کرنا چلا جائے اور میں رنگے ہاتھوں اسے چھاپنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ ایسے ہیاد اور چال باز لوگوں کو بہت گھبر مارنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ میں اس کی طرف سے آنکھ بند کر کے بیٹھ جانا چاہتا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اپنے چند سادہ پوش اہل کاروں کو ملنگ کالیا اور اس کے ڈیرے کی نگرانی پر مامور کر دوں گا تا کہ اگر وہ غیر معمولی بات نوٹ کریں تو فوراً مجھے اطلاع دیں تاکہ کوئی فی الفور عملی قدم اٹھایا جاسکے۔

اس کے علاوہ میں پہلی فرصت میں بتول سے بھی ایک تفصیلی ملاقات کرنا چاہتا تھا اس سے ملنگ کالیا کے دعوے کی تصدیق یا تردید بھی ہو جاتی کہ بتول بھی اسے پسند کرتی تھی۔ علاوہ ازیں بتول سے مل کر میں یہ بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا کہ کالیا ان کے گھر میں پہنچ کر کس قسم کے پھٹکنڈے آزار پہا ہے۔ ہر حوالے سے بتول سے میرا ملنا بہت اہم اور ضروری تھا۔

ہم ملنگ کے ڈیرے سے تھانے کی جانب روانہ ہوئے تو حوالدار جعد خان نے مجھ سے سوال کیا ”ملنگ صاحب! یہ ملنگ کسی بھی طور اعتماد کے قابل نہیں۔ اس کی کارستانیاں بہت واضح ہیں مگر پھر بھی آپ اسے شرافت سے چھوڑ آئے ہیں۔ اس کے خلاف کسی قسم کا کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟“

”ہاں بہت ہی خاص الخاص وجہ ہے جعد خان!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”پہلی بات تو یہ ہے کہ ملنگ کی چال بازی اور مکاری کو پکڑنے کے لیے موجودہ حالات ابھی زیادہ سازگار نہیں ہیں۔ اس کے خلاف جو کچھ بھی ہمیں حاصل ہے اس کی بنا پر کوئی جان دار کیس نہیں بن سکتا۔ میں ملنگ کو بڑی مضبوط پکڑ میں لانا چاہتا ہوں اس کے لیے اس کا رنگے ہاتھوں پکڑا جانا ضروری ہے جس کے لیے میں نے لائحہ عمل سوچ لیا ہے۔ انشاء اللہ وہ بہت جلد ہماری گرفت میں ہوگا۔ میں کوئی عملی قدم

بازو تھا۔ مذکورہ نسوانی بازو صحن کے عین وسط میں نیم کے درخت کے پاس پڑا ہوا تھا۔

اس اطلاع پر جب ہم جانے وقوعہ پر پہنچے تو وہاں لگ بھگ ایک درجن مردوزن اکٹھا ہو چکے تھے اور ان میں مختلف نوعیت کی چڑچڑاہٹیں جاری تھیں۔ عابدہ کا خیال تھا کہ وہ بازو ملنگ بابا کی پیش گوئی کی ایک کڑی تھی اور اب..... اس کے بعد خدا نخواستہ بتول کی باری تھی۔ غم و اندوہ سے اس کا ہر حال تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اس وقت کا لیا وہاں موجود ہوتا تو وہ بیٹی کی جان بچانے کے لیے کالیا کی مرضی اور خواہش کے مطابق فوراً بیٹی کا نکاح اس سے پڑھوا دیتی۔ اسی سے ملتی جلتی کیفیت منظور حسین کی بھی تھی۔ ایک نشان صفت انسان نے ہستے بستے گھر کو ماتم کدہ بند دیا تھا۔ وہ اپنی ہوس اور حرص پوری کرنے کے لیے اس گھر کے کینوں کو اذیت اور کرب کے پل صراط سے گزار رہا تھا۔ اس لمحے میرے دل میں ملنگ کالیا کے لیے نفرت کی ایک لہر بلند ہوئی اور پلک جھپکتے میں وہ کڑوی کیلی لہر ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی کو چھو کر آسمان کی جانب بڑھ گئی۔ میں نے دانتوں کو سختی سے بھینچتے ہوئے حتی فیصلہ کیا کہ اب میں اس فراہم اہل کامل کو ایک لمحے کی مہلت یا ڈھیل نہیں دوں گا۔

عابدہ کے گھر کے صحن میں موجود افراد میں سے ایک عورت نے انکشاف کیا ”یہ کتنا ہوا بازو تو زاہدہ کا ہے!“

میں نے چونک کر اس عورت کی طرف دیکھا پھر اس کی جانب جا کر استفسار کیا ”کون زاہدہ؟“ وہ بولی ”میں زاہدہ پر دین کی بات کر رہی ہوں۔ ابھی کل ہی تو اسے دفن کیا گیا ہے۔“ عورت کے انکشاف نے وہاں موجود لوگوں کو حیرت نما وحشت میں مبتلا کر دیا اور بازو کو بہ غور دیکھنے کے بعد انہوں نے اس عورت کے بیان کی تصدیق کر دی۔ تصدیق کرنے والوں میں عابدہ اور اس کا شوہر بھی شامل تھے۔ میں انکشاف کرنے والی عورت کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کا نام مجھے بعد میں معلوم ہوا تھا لیکن میں یہاں اس کا نام لے کر ہی اس سے ہونے والی گفتگو کا احوال رقم کروں گا۔

”نصیب بی بی! تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ بازو زاہدہ پر دین کا ہے جسے دفن کیا گیا تھا؟“

”میں نے اس کی چچی (چھنگلی) سے پہچانا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

اس کی بات سن کر میں نے بازو کے ہاتھ کو دیکھا اور ہاتھ کی چھنگلی کو آدھا کٹا ہوا پایا۔ اس کے بعد میں نے سوالیہ نظر سے نصیب بی بی کی طرف دیکھا۔ وہ میری نگاہ کا مفہوم سمجھتے ہوئے بولی۔

”تھانے دار صاحب! دو سال پہلے زاہدہ کی چچی (چھنگلی) پٹھے (چارا) کترنوا لٹو کے میں آ گئی تھی جس کی وجہ سے آدھی کٹ گئی تھی۔ پورے گاؤں میں کسی اور عورت کے ہاتھ کی کوئی انگلی اس

طرح کی ہوئی نہیں ملے گی۔ میں نے اسی نشانی سے زاہدہ کو پہچانا ہے۔“

مزید دس پندرہ منٹ میں مجھے جو حالات معلوم ہوئے ان کے مطابق زاہدہ پر دین نامی وہ عورت دو روز پہلے ہی صحن کے مرض میں مبتلا ہو کر مر گئی تھی اور گزشتہ روز اسے گاؤں کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا تھا۔ زاہدہ کا کٹا ہوا بازو عابدہ کے صحن میں پائے جانے کا ایک ہی واضح مطلب تھا اور وہ یہ کہ مرحومہ کی قبر کو کھول کر اس کی لاش کی بے حرمتی کی گئی تھی۔ اس کے مردہ تن سے ایک بازو جدا کر لیا گیا تھا جسے ازاں بعد رات کے پچھلے پہر یا علی الصباح عابدہ کے گھر کے صحن میں پھینک دیا گیا تھا۔ میری فوری اور حتمی سوچ کے مطابق یہ کام ملنگ کالیا کے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے یہ کام یا تو خود کیا تھا یا پھر اپنے چلے حنیف کاٹا سے کروایا تھا۔ کالیا کا ذریعہ قبرستان سے لگا ہوا تھا۔ اس لیے یہ کام زیادہ مشکل نہیں تھا اور خاص طور پر اس صورت میں کہ اسے اپنی قبیح پیش گوئی کو پایہ تکمیل تک پہنچانا تھا تاکہ وہ اپنی ہوس کو پورا کرنے کے لیے بتول کو حاصل کر سکے۔ نفسانی خواہشات کے غلام اس شخص کا منصوبہ دیرے دیرے اپنی تکمیل کے مراحل طے کر رہا تھا۔ بہر حال، کسی قبر کو کھول کر اس میں دفن کسی مردے کی بے حرمتی کرنا قابلِ ذل اندازی پولیس تھا اور میں اس مذموم حرکت پر ملنگ کالیا کے ساتھ کسی قسم کی رد و رعایت کے حق میں نہیں تھا۔

میں نے موقع پر موجود افراد کو تسلی بخشی دی اور کہا ”آپ لوگ فکر نہ کریں میں بہت جلد اس واقعے کے ذمے دار شخص کو عبرت ناک سزا دلواؤں گا۔“

مجھ سے سوال کیا گیا ”تھانے دار صاحب! اب اس بازو کا کیا کرنا ہے؟“

میں نے چند لمحات سوچنے کے بعد جواب دیا ”اس بازو کو دوبارہ زاہدہ پر دین کی قبر میں دفن کیا جائے گا اور میں یہ کام اپنی گرانی میں کرواؤں گا۔ اس کے لیے آپ لوگوں کو تھوڑا انتظار کرنا ہوگا۔ میں بتول سے مل کر کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں پھر ہم سب قبرستان کی طرف چلیں گے۔“ وہاں موجود افراد نے میری تجویز کو سراہا۔ اسی اثنا میں مجھے معلوم ہوا کہ چند لمحے پہلے جس شخص نے مجھ سے بازو کے بارے میں سوال کیا تھا وہ مرحومہ زاہدہ پر دین کا شوہر محمد طفیل تھا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی موقع پر پہنچا تھا۔

میں آج تمام معاملات کو بہ خیر و خوبی منٹا لینا چاہتا تھا، بتول سے ملاقات کے بعد مجھے سیدھا قبرستان جانا تھا تاکہ دیگر امور کے ساتھ ساتھ ملنگ کالیا کی ”مزاج پرسی“ بھی کر سکوں تاہم اس سلسلے میں میرا ذہن الجھن کا شکار تھا۔ میں نے دو روز پہلے دوسرا لباس کاٹنیکو کو قبرستان کے گرد و نواح میں

تعیینات کیا تھا جنہیں ملنگ کا لیا اور اس کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا تھی لیکن ابھی تک ان کی طرف سے کوئی مفید اطلاع نہیں ملی تھی۔ زابدہ پروین کی قبر کھول کر اگر اس کا بازو کاٹ کر نکال لیا گیا تھا تو یہ بات میرے آدمیوں سے پوشیدہ نہیں رہنا چاہیے تھی۔ قدیر اور نصیر نامی وہ دونوں کانٹیلر میرے آزمائے ہوئے اور بھروسے کے آدمی تھے۔ میرا ذہن اس بارے میں مسلسل سوچ رہا تھا۔

میں نے عابدہ خانم سے کہا ”میں فوری طور پر بتول سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ کس کمرے میں

اس گھر کے پچھلے حصے میں دو کمرے پہلو بہ پہلو بنے ہوئے تھے۔ عابدہ نے مغربی جانب والے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”بتول اس کمرے میں ہے۔“
میں نے اسے ایسے آلی شوکت مرزا کے وہیں صحن میں رکنے کو کہا اور مذکورہ کمرے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ عابدہ بھی میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ میں نے واضح الفاظ میں اسے یاد کر لیا کہ بتول سے تنہائی میں گفتگو کر دوں گا۔ اے مجھے وہاں پہنچا کر واپس آنا ہوگا۔

وہ جلدی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی ”ضرور ضرور“ پھر اس نے غم انگیز انداز میں دریافت کیا ”تھانے دار صاحب! میری بتول بچ جائے گی نا؟“
”اسے کچھ نہیں ہوگا۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
”ملنگ جی کی پیش گوئی کا آخری مرحلہ بھی اب تو گزر گیا ہے۔ ہند سوز لہجے میں گویا ہوئی ”اس کے بعد تو...“

اس نے شکستہ احساس کے ساتھ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں رٹ گیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مدوثق انداز میں کہا ”عابدہ! آج تمہاری بیٹی کی مصیبت کا آخری دن ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ آج کے بعد اس کی بیماری باقی رہے گی اور نہ ہی اس گھر پر کسی قسم کے جادوئی اثرات کا کوئی ثبوت ملے گا۔“

”آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟“ یہ سوال منظور حسین نے کیا تھا۔ وہ ہمارے عقب میں دبے قدموں چلتے ہوئے برآمدے تک اپہنچا تھا۔

میں نے منظور کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا ”آج میں ملنگ کا لیا کا قلع قمع کر دوں گا۔“
”وہ کیا ہوتا ہے؟“ وہ حماقت آمیز سادگی سے مستفسر ہوا۔
میں نے کہا ”وہ ہوتا ہے... ستیاناس... بلکہ سوا ستیاناس۔“

”یقیناً آپ کو ملنگ جی کے خلاف کوئی شہس ثبوت مل گیا ہے؟“

”ہاں“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا ”ملنگ کے سیاہ کرتوتوں کے خلاف میرے پاس کچھ شہادتیں جمع ہوئی ہیں اور باقی حتمی ثبوت بتول سے بات چیت کے بعد مجھے حاصل ہو جائیں گے۔ آپ لوگ دیکھتے جائیں آگے آگے کیا ہوتا ہے۔“

وہ میرے عزائم اور لہجے کی قطعیت کو دیکھتے ہوئے وہیں رک گئے اور عابدہ نے مطمئن لہجے میں کہا ”ٹھیک ہے تھانے دار صاحب! آپ بتول سے جو پوچھنا چاہتے ہیں وہ پوچھ لیں۔“
میں نے کہا ”عابدہ تم مجھے بتول کے پاس پہنچا کر واپس آ جانا۔“

اس نے میرے حکم کی تعمیل کی اور میں چند ساعتوں کے بعد بتول کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ بتول ایک رنگ دار چارپائی پر دراز تھی۔ میری آمد کے بعد وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور عابدہ نے اسے سر ہانے کی طرف سے ٹیک لگا کر بیٹھنے میں مدد دی تھی۔ عابدہ نے بتول کو میرے بارے میں دو چار جملوں میں بتایا اور کمرے سے نکل گئی۔

وہ دن کا آغاز تھا اس لیے کمرے میں اچھا خاصا اجالا ہو رہا تھا۔ میں نے تنقیدی اور تجرباتی نظر سے یہ غور بتول کا جائزہ لیا۔ جیسا کہ مجھے معلوم تھا وہ بیس سال کی ایک حسین و جمیل دوشیزہ تھی مگر اس وقت اس کا حسن و جمال اور شگفتگی و تازگی تو خیر چکی تھی۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا نظر آتی تھی۔ میں نے اس کی موجودہ حالت کا باریک بینی سے مشاہدہ کر کے یہ بہ خوبی اندازہ لگالیا کہ چند ماہ پہلے شادی اور عنائی کا شاہکار رہی ہوگی مگر شیطان خصلت ہوس پرست ملنگ کا لیا نے اپنا دھند اچکانے اور اس کو ”حاصل“ کرنے کے لیے اپنے مکروہ منصوبے کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ علاج و معالجے کے نام پر کا لیا نے بتول کو جادو یہ اور مخلوقات استعمال کروائے تھے یہ سب اسی کے بد اثرات کا نتیجہ تھا۔

حالات حاضرہ کی چند باتیں کرنے کے بعد میں نے براہ راست بتول سے نہایت ہی اہم سوال کر ڈالا۔ میں نے پوچھا ”بیٹی! کا لیا نے مجھے بتایا ہے کہ تم بھی اس سے شادی کرنے پر آمادہ ہو۔ اس بات میں کس حد تک حقیقت ہے؟“

اس کی کھنڈر کی طرح ویران آنکھوں سے سادون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔ میرے سوال کے جواب میں یہ ردِ عمل فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے اس حوالے سے اسے کریدنا مناسب نہیں سمجھا اور رونے کے لیے چھوڑ دیا۔ اس طرح میں اس کے اندر کے درد کو آنسوؤں کے ذریعے اس کے وجود سے خارج کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح اس کا قلبی و ذہنی دباؤ ختم نہیں تو کم ضرور ہو جاتا اور وہ

میرے سوالات کے زیادہ معقول جواب دے سکتی۔

چند لحظات تک آنسو بہانے کے بعد وہ نائل ہو گئی تھی تو میں نے ہم دردناک لہجے میں پوچھا
”بتول بیٹی! تم نے سوال کا جواب نہیں دیا؟“

”تھانے دار صاحب! آپ نے مجھے بتی کہہ کر مخاطب کیا تو میرے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ وہ
گلوگیر آواز میں بولی ”اگر آپ مجھے واقعی بتی کی طرح سمجھتے ہیں تو کسی طرح اس شیطان کا لیا سے
ہار دی جان چھڑا دیں۔ ہم آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولیں گے۔“

میں نے شہت بھرے لہجے میں کہا ”میں نے تمہیں بتی کہا ہے تو سمجھو تم میری بتی ہی ہو اور اسی
لہجے سے تم کا لیا کی طرف سے قطعی بے فکر ہو جاؤ۔ بس سمجھ لو آج کے بعد سے تم سب کی مصیبتیں ٹل
گیں۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا ”اب تم میرے سوال کا جواب دو؟“

”آپ نے جو کچھ پوچھا ہے اس میں رتی بھر بھی حقیقت نہیں۔“ وہ قدرے حوصلہ مند انداز
میں بولی۔

میں نے کہا ”اس کا مطلب ہے مانگ کا لیا نے تمہارے حوالے سے جھوٹ بولا ہے!“
”وہ ایک نمبر کا جھوٹا اور دھوکے باز ہے۔“ وہ نفرت آواز لہجے میں بولی ”مجھ سے یہ کہتا ہے
کہ اگر میں نے اس سے شادی کے لیے رضامندی ظاہر نہیں کی تو وہ اپنے جادو اور عملیات کے ذریعے
میرے ماں باپ اور چھوٹے بھائیوں کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے پر مجبور کر دے گا۔ دوسری جانب وہ
میری اماں اور ابا کو یہ کہہ کر سہاتا اور لرزاتا رہتا ہے کہ اگر انہوں نے شرافت سے میری شادی اس سے
نہیں کی تو میں خون تھوکتی ہوئی ان کی نظروں کے سامنے جان دے دوں گی۔ حرے اور افسوس کی بات
یہ ہے کہ وہ یہ دھمکیاں ہمیں براہ راست نہیں دیتا بلکہ وہ سب کچھ کالے جادو اور گمنامی کی آڑ میں
کہتا ہے۔ اس کے مطابق پھوپھی آسیہ نے مجھ پر اور اس گھر پر بہت سخت قسم کا سفلی عمل کروایا ہے
جس سے نجات کی واحد راہ کا لیا کی باتیں ماننے کی صورت میں نکلتی ہے۔ اب تو آپ تمام صورت حال
سمجھ گئے ہوں گے!“

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”بالکل! میں سب سمجھ گیا ہوں مگر ایک بات تو بتاؤ بیٹی!“
اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا ”تمہاری باتوں سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ
تم شروع ہی سے ملنگ کا لیا کے فراڈ کو سمجھ رہی ہو۔ اس کے باوجود بھی تم اس سے علاج کرواتی رہی
ہو؟“

”یہ کڑوے کیلے محلول اور الٹی سیدھی پھنکیاں استعمال کرنے میں میری مرضی شامل نہیں۔“ وہ
اپنے چہرے پر ناپسندیدگی کے تاثرات سجاتے ہوئے بولی ”یہ سب کچھ اماں کے حکم پر مجھے کرنا پڑتا
ہے۔ وہ ملنگ کا لیا کی بہت معتقد ہے۔“

”اسی اندھے اعتماد اور اعتقاد نے تو تمہارا بیڑا غرق کیا ہے۔“ میں نے قدرے تلخی سے کہا
”لیکن فکر نہ کرو اب عابدہ کی آنکھیں بھی کھل چکی ہیں۔ وہ بھی کا لیا کی حقیقت کو بڑی حد تک سمجھ چکی
ہے۔“

وہ بولی ”آج صبح ہی سے ہمارے گھر میں قیامت آئی ہوئی ہے۔ کسی عورت کا ایک بازو
ہمارے صحن میں پڑا پایا گیا ہے۔ اس مردود نے کچھ اس قسم کی پیش گوئی کی تھی۔“

میں نے بتول کو بتایا کہ وہ بازو دو روز قبل وفات پانے والی زاہدہ پروین کا ہے جسے خوف و
ہراس پیدا کرنے کے لیے ملنگ کا لیا نے اس کی لاش سے جدا کر کے اس کے گھر کے صحن میں پھینک دیا
پھینک دیا ہے۔ بازو کی شناخت والی بات ابھی اس تک نہیں پہنچی تھی۔ میری زبان سے زاہدہ پروین کا نام
سننے ہی وہ ایک مرتبہ پھر اشک بار ہو گئی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ زاہدہ سے بتول کی اچھی خاصی دوستی
رہی تھی۔

میں مزید تھوڑی دیر وہاں رک کر بتول سے مختلف قسم کے سوالات کرتا رہا۔ ان سوالات کے اس
نے حسب توقع اور مناسب جواب دیے۔ کا لیا جب بھی بتول کی جھڑپھونک کے لیے آتا تھا تو ہوس
زدہ نظر سے اس کے وجود کا ایکس رے کرتا رہتا تھا۔ اس کی آواز شہوت زدہ اور خیالات انتہائی بیہودہ
ہوتے تھے۔ بتول کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کوئی بھوکا بھیڑیا ہو جو نظر کے ٹکلیے دانتوں سے اسے کچا
چبا رہا ہو۔

میں بتول والے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گیا۔ اس دوران میں زاہدہ پروین کے
بازو کو ایک سفید کپڑے میں لپیٹ کر ایک چارپائی پر رکھ دیا گیا تھا اور سب میرے آئندہ احکامات کے
منتظر تھے۔ میرا اشارہ پا کر وہ بازو کے ساتھ قبرستان کی طرف چل پڑے۔ کپڑے میں لپٹا ہوا بازو
زاہدہ کے شوہر ظہیر نے اپنے بازوؤں پر اٹھا رکھا تھا۔

ہم عابدہ کے گھر سے نکل کر قبرستان کی طرف جانے والے راستے پر آئے ہی تھے کہ میری نظر
نصیر پر پڑی۔ نصیر ان دو کانٹیلز میں سے ایک تھا جنہیں میں نے ملنگ کا لیا کی نگرانی پر مامور کیا تھا۔
نصیر تیز قدموں سے چلتے ہوئے ہماری طرف آ رہا تھا۔ اس کا بوکھلاہٹ آمیز انداز دیکھ کر میرا ماتھا

ٹھکا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ نصیر کوئی نہایت ہی اہم اور سنسنی خیز خبر لے کر آ رہا ہے۔
میں نے سب کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور نصیر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ ہم دونوں کا ملاپ
باقی افراد سے لگ بھگ سو قدم کے فاصلے پر ہوا۔ نصیر نے مجھے سیلوٹ کیا اور ہاپنے ہوئے لہجے میں
بولاً۔

”ملک صاحب! میں ابھی تھانے سے آ رہا تھا۔“

”تم تھانے کیا لینے پہنچ گئے تھے۔ میں نے تمہیں کالیا کی نگرانی.....؟“

وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا ”میں آپ کو ایک اہم اطلاع پہنچانے تھانے
گیا تھا مگر وہاں سے بچا چلا کہ آپ اسی گاؤں آئے ہوئے ہیں تو پھر میں سیدھا ادھر ہی آ گیا ہوں۔“
”وہ“ ہم اطلاع کیا ہے؟“ میں فوراً مطلب کی بات پر آ گیا۔

وہ دور کھڑے افراد پر ایک اچھتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔

”ملک صاحب! وہ اہم اطلاع ملنگ کالیا سے متعلق ہے۔ وہ ہماری توقع سے کہیں زیادہ
خطرناک شخص ہے۔“

”تم نے اس کی کون سی خطرناکی دیکھی؟“

”گذشتہ رات ہم نے قبرستان میں ایک ہولناک منظر مشاہدہ کیا ہے۔“ نصیر نے جھرجھری
لینے ہوئے بتایا ”ملنگ کالیا اور اس کے چیلے حنیف کا تانے ایک تازہ قبر کو کھول کر اس میں سے کچھ نکالا
تھا۔ ہم دن میں یہ دیکھ چکے تھے کہ اس قبر میں کسی عورت کو دفنایا گیا تھا۔“

”کالیا اینڈ کمپنی نے اس قبر سے کیا نکالا تھا؟“ میں نے ان جان بنے ہوئے پوچھا۔

”یہ تو معلوم نہیں ہو سکا۔“ وہ پلکیں چھکاتے ہوئے بولا ”تاہم انہوں نے وہاں سے جو کچھ بھی
حاصل کیا تھا اسے ایک تھیلے میں ڈال کر وہ ڈیرے کے اندرونی حصے میں لے گئے تھے۔ میں اور قدیر
اس واقعے پر تبادلہ خیالات کر رہے تھے کہ حنیف کا تاڈیرے سے نکلتا ہوا نظر آیا۔ اس کے تھیلے میں
وہی تھیلا تھا جو کچھ دیر پہلے قبرستان سے وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ وہ صبح کا ذب کا وقت تھا۔ ندیروہیں
درختوں کے جھنڈ میں چھپا ڈیرے کی نگرانی کرتا رہا اور میں مناسب فاصلہ رکھ کر حنیف کانے کا تعاقب
کرنے لگا۔“

نصیر سانس لینے کی خاطر چند لمحے خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”یہ تعاقب عابدہ
خانم کے گھر کے قریب پہنچ کر ختم ہوا۔ میں ایک درخت کی آڑ میں چھپ کر حنیف کانے کی کارروائی

دیکھنے لگا۔ حنیف کانے نے محتاط نظر سے چاروں طرف دیکھ کر اپنی تسلی کی پھر اس نے کپڑے کے تھیلے
سے کوئی چیز نکال کر بہ آہستگی عابدہ کے گھر کے صحن کی طرف اچھال دی۔ اندھیرے کے باعث میں
اس ”چیز“ کو شناخت نہ کر سکا تاہم مجھے محسوس ہوا جیسے وہ کوئی لکڑی وغیرہ ہو۔ پھر اس سے قبل حنیف
واپسی کا سفر اختیار کرتا میں راستہ بدل کر اس جانب بڑھ گیا جدھر قدیر موجود تھا۔

”میں نے قدیر کو ساری کتھا کہہ سنائی اور ہم نے باہمی مشاورت سے یہ فیصلہ کیا کہ فی الفور
آپ کو اس واقعے کی اطلاع دی جائے۔ اس وقت تک سورج نکل آیا تھا میں اجالا ہوتے ہی آپ کی
طرف روانہ ہو گیا مگر جب میں تھانے پہنچا تو پتا چلا کہ آپ اسی طرف آئے ہوئے ہیں۔“
کانٹیل نصیر کا بیان میرے شک کی تصدیق کر رہا تھا۔ ملنگ کالیا کی پول پٹی بالکل کھل کر
سامنے آگئی تھی۔ اب اسے چھاپنے کے لیے میرے پاس بہت کچھ جمع ہو چکا تھا میں نے نصیر کی طرف
دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اور کچھ کوئی اور اہم بات؟“

وہ چونک کر بولا ”ہاں“ ایک بات تو میں آپ کو بتانا بھول ہی گیا۔“ اس کا انداز ایسا تھا جیسے یہ
بات اسے ابھی یاد آئی ہو۔ وہ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا ”اس ڈیرے پر ملنگ کالیا اور حنیف
کانا کے علاوہ بھی ایک اور شخص موجود ہے۔ ہم نے دو تین مرتبہ اس پر اسرار شخص کی جھلک دیکھی
ہے۔“

نصیر نے انکشاف عام سے انداز میں کیا تھا تاہم میرے لیے یہ کسی سنسنی خیز خبر سے کم نہیں تھا۔
میں پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے مستفسر ہوا۔

”وہ کون شخص ہے بھی..... اور تم نے اس کے لیے پراسرار کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے؟“

نصیر بولا ”میں اس شخص کو جانتا ہوں نہ ہی اس کا نام مجھے معلوم ہے اور..... پراسرار میں نے
اسے اس حوالے سے کہا ہے کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ چھپ کر وہاں رہ رہا ہے۔ اس کی حرکات و
سکنات سے لگتا ہے جیسے وہ وہاں اپنی موجودی کو پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے اس کا حلیہ بھی عجیب سا ہے۔
بے ترتیبی کی داڑھی مونچھیں سرخ سرخ آنکھیں اور قدرے خستہ لباس۔ مجھے تو وہ کوئی جرائم پیشہ شخص
لگتا ہے۔“

کانٹیل نصیر کی کسی بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ یہ باتیں وہاں
موجود کسی غیر متعلق شخص سے نہ کرنے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ میری ہدایات پر عمل کرے گا پھر میں نے

اسے بھی اپنے ساتھ لے لیا اور ہمارا قافلہ قبرستان کی طرف روانہ ہو گیا۔

اے ایس آئی شوکت مرز میرے نزدیک آ گیا اور سرگوشیاں لہجے میں بولا "ملک صاحب! خیر تو ہے۔ مجھے تو کوئی گڑ بڑ لگ رہی ہے!"

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا اور تحسنانہ لہجے میں کہا "ہمیں فوری طور پر ملنگ کالیا کے آستانے پر ریڈ کر کے وہاں موجود ہر شخص کو اپنی حراست میں لینا۔"

"جو حکم ملک صاحب۔" وہ چوک نظر سے چاروں جانب دیکھتے ہوئے بولا "سادہ پوش نگراں کا ہلو کے پاس گرفتاری کے لیے مناسب سامان موجود ہے، ہم بھی ہر قسم کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے پوری طرح لیس ہیں۔ آپ احکامات صادر کریں۔"

میں نے کہا "مجھے امید ہے، ہم کسی خون خرابے کے بغیر ملنگ کالیا اور اس کے ساتھیوں پر قابو پالیں گے۔ اس کے لیے ہمیں صابرانہ حکمت عملی سے کام لینا ہوگا۔"

"آپ حکمت عملی وضاحت کریں۔"

میں نے کہا "میں نصیر کو واپس اس کی "ڈیوٹی" کے مقام پر بھیج رہا ہوں، اس ہدایت کے ساتھ کہ وہ دونوں ملنگ کالیا اور اس کے ڈیرے پر موجود ہر شخص کو اپنی نظروں میں رکھیں۔ ہم گاؤں والوں کے ساتھ سیدھا قبرستان جائیں گے اور نہایت ہی عام اور فطری انداز میں زاہدہ پروین کے بازو کو پیر قبہ کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد ہم دونوں ملنگ کالیا کے آستانے کا رخ کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" اے ایس آئی نے تائیدی انداز میں کہا "اور اگر قبرستان والی مصروفیت کے دوران میں ملنگ یا اس کے چیلے حنیف کانے سے ٹاکرا ہو گیا تو ہماری پالیسی کی ہونا چاہیے؟"

میں نے بتایا "ہماری پالیسی یہ ہوگی کہ ہمیں کالیا یا اس کے کسی آدمی پر کسی قسم کا شک نہیں۔ ہمارے عمل سے "کالیا دشمنی" کی ایک جھلک بھی ظاہر نہیں ہوگی اور اس طرح ہم یہ آسانی اس کے ڈیرے میں گھس کر اس کا شکار کر سکیں گے۔"

"بالکل سمجھ گیا۔" اے ایس آئی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "اب آپ نصیر کو خصوصی ہدایت کے ساتھ روانہ کر دیں۔"

میں نے نصیر کو سمجھا کر رخصت کر دیا۔ وہ ایک دوسرے راستے سے قدیر کے پاس جانے کے لیے ہم سے جدا ہو گیا۔

میری حکمت عملی بڑا مثبت رنگ لائی تھی۔ زاہدہ پروین کے بازو کو اس کے مدفن میں اتارا ہی جا رہا تھا کہ حنیف کالیا وہاں پہنچ گیا۔ وہ مجھ سے کریدنے والے انداز میں سوال کرنے لگا تو میں سمجھ گیا کہ کالیا نے باہر کی صورت حال جاننے کے لیے اسے وہاں بھیجا ہوگا۔ میں نے حنیف کالیا کو کوئی ایسی بات نہیں بتائی جس سے وہ کسی قسم کی تشویش میں مبتلا ہو جاتا۔ وہ مطمئن ہو کر جانے لگا تو میں نے اس کے گرد کی خیر خیریت بھی پوچھ لی۔ اس نے میری توقع کے مطابق جواب دیا۔

"ملنگ جی دودن کے لیے جھنگ گئے ہوئے ہیں۔"

مجھے یہی امید تھی کہ وہ کالیا کی غیر موجودگی کا بہانہ کرے گا۔ میں نے مایوس کن لہجے میں کہا "پھر تو آج اس سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔ میں نے سوچا تھا، جب یہاں تک آ ہی گیا ہوں تو ملنگ سے ملتا چلوں۔"

"وہ تو جھنگ سے پرسوں آئیں گے۔" حنیف نے اپنی ایک چشم میں عیاری کی چمک پیدا کرتے ہوئے کہا "ویسے میں ملنگ جی کو آپ کا سلام کہہ دوں گا۔"

"ضرور ضرور۔" میں نے خوش دلی سے کہا اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔

مجھے یقین تھا کہ وہ کہیں نہ کہیں چھپ کر ہمیں ضرور رواج کر رہا ہوگا۔ قبرستان والی کارروائی کے حوالے سے میں نے اسے بتایا کہ کسی بد بخت نے زاہدہ پروین کا بازو کاٹ کر باہر کھیتوں میں پھینک دیا تھا جسے دوبارہ دفن کرنے کے لیے گاؤں والوں نے پولیس کو بلا لیا تھا جس کی وجہ سے مجھے آنا پڑا۔ میری وضاحت پر حنیف کالیا نے مکاری سے مسکراتے ہوئے کہا تھا "ملک صاحب! یہ کسی بد بخت جانور کی کارستانی ہو سکتی ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور دل ہی دل میں کہا۔۔۔ تم سے زیادہ بد بخت جانور اور کون ہو سکتا ہے۔ بہر حال وہ بد بظاہر مطمئن ہو کر وہاں سے چلا گیا تھا۔

میں اور اے ایس آئی بھی دیگر افراد کے ساتھ قبرستان سے نکل کر گاؤں کی جانب بڑھ گئے۔ میں کالیا اور حنیف کا ٹاکرہ دینا چاہتا تھا کہ کسی بھی طور ہمارا دھیان ان کی طرف نہیں لگا ہوا۔

آدھے گھنٹے کے بعد میں اور اے ایس آئی شوکت مرزا کئی راستے بدل کر ایک مرتبہ پھر ملنگ کالیا کے آستانے پر کھڑے تھے۔ ڈیرے کا داخلی دروازہ کھلا تھا۔ ہم نے دستک وغیرہ کا تکلف کیے بغیر اندر داخل ہونے کا فیصلہ کیا تھا اور اگلے ہی لمحے میں ہم دونوں ڈیرے کے احاطے میں تھے۔

بچی چھتوں والے دو کمروں میں سے ایک کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یہ وہ کمرہ نہیں تھا جس میں ملنگ

نے اپنا حجرہ بنا رکھا تھا۔ کھلے ہوئے دروازے والے کمرے میں وہ شخص موجود تھا جس کے پارے میں نصیر نے مجھے بتایا تھا۔ وہ وضع قطع اور طبع سے واقعی جرم پیشہ دکھائی دیتا تھا۔

ہم پر نگاہ پڑتے ہی وہ چونک اٹھا۔ اس کے چونکنے کی وجہ بھی میری سمجھ میں آ گئی۔ ہم اس وقت سرکاری لباس میں تھے۔ اس مشکوک شخص کا ہمیں دیکھ کر بوکھلا جانا نصیر کے اندازے کی تصدیق بھی کرتا تھا کہ وہ شخص کوئی مجرم ہو سکتا تھا۔

میرے اشارے پر شوکت مرزا نے چپتے کے مانند جست بھری اور آن واحد میں تذکرہ شخص کو بے بس کر کے پھٹکڑی پہنا دی۔

اسی وقت دوسرے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہاں دو چہرے ہمارے دیدار کے لیے ابھرے۔ ان میں ایک ملنگ کالا اور دوسرا حنیف کا نا کا چہرہ تھا اور ان چہروں پر بے انداز حیرت آمیز وحشت برس رہی تھی۔ ان کی آنکھیں ساکت اور زبانیں گنگ ہو کر رہ گئیں تھیں۔

میں نے ملنگ کا لپا کی طرف دیکھتے ہوئے مضحکہ خیز انداز میں کہا ”قبلہ! آپ تو جھنگ گئے ہوئے تھے۔ آپ کی تشریف آوری کہاں کی؟“

اس نے میرے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے پہلے حنیف کا نا کی اگلی آنکھ میں دیکھا پھر الجھن زدہ نظر سے مجھے تنکے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرے سوال کا کیا جواب دے۔

اسی وقت میں نے یک چشم حبیث صورت حنیف کا نا کی اپنی آنکھ سے اپنے عقب میں تنکے ہوئے دیکھا۔ بے اختیار میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور میرے سینے سے اطمینان کی ایک طویل اور گہری سانس خارج ہوئی۔ وہاں کھلے ہوئے دروازے میں نصیر اور فدیہ الرٹ کھڑے میرے علم کے منتظر تھے۔

میں نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر انہیں علم دیا کہ وہ ملنگ اور اس کے تعلق کو فوراً گرفتار کر لیں۔

قدیر اور نصیر لپک کر ان دونوں کی طرف بڑھے۔ کالیا اور کانا نے فرار ہونے کی کوشش کی مگر میں ان کے راستے کی دیوار بن گیا اور ان دونوں کو لات گھونے پر رکھ لیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ”پیر و مرید“ کی کالیاں سند یافتہ اپنی زبوروں سے آراستہ ہو چکی تھیں۔

ان تینوں زیر جر است شیطانوں کو تھپڑ اور ٹھنڈے مارتے ہوئے ہم تھانے لے آئے۔ اس روز میرے پیشہ ورانہ ریکارڈ میں ایک اور کامیابی کا اضافہ ہو چکا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ میری

اس کامیابی میں تھانے کے دیگر عملے کا بھی پورا پورا ہاتھ تھا۔

☆☆☆

جب کوئی مجرم ٹھوس ثبوت کے ساتھ پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے تو پھر اس کی زبان کھلوا چندان مشکل نہیں رہتا۔ ہمارے ہتھے تو ایک نہیں تین تین مجرم لگے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ اچھل کود ملنگ کا لپا ہی پجار ہا تھا۔ پہلے وہ مجھے دوستانہ انداز میں سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ میں کسی غلط فہمی میں انہیں پکڑ لایا ہوں لہذا بہتر یہی ہوگا کہ میں انہیں پہلی فرصت میں جانے کی اجازت دے دوں۔

اس کے نہایت ہی واہیات مشورے کے جواب میں میں نے اس کے سیاہ کرتوتوں کی تفصیل اس کے سامنے رکھ دی۔ جس میں ٹکڑی چور خوشی محمد عرف خوشیا کا ذکر بھی آیا اور بتول کے تاثرات بھی زیر بحث آئے۔ ازیں علاوہ میرے کانٹیل نصیر کا آنکھوں دیکھا احوال حنیف کا نا سے متعلق بھی سامنے آیا جس نے حنیف کو کٹا ہوا بازو عابدہ کے گھر میں پھینکتے ہوئے دیکھا تھا پھر نصیر اور قدیر نے ان گرو چیل کو زامدہ کی قبر کھولتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔

میں نے زہر خند لیچے میں کہا ”ملنگ کالیا! میں ان چار افراد کو تمہارے خلاف بہ طور گواہ عدالت میں پیش کروں گا۔ جب تم قانون کی گرفت میں نظر آؤ گے تو گاؤں کے دوسرے لوگوں کو بھی حوصلہ ملے گا اور ممکن ہے تمہارے متعلق کچھ مزید شرمناک انکشافات ہوں!“

میں نے اس سیاہ کار کو آئینہ دکھایا تو وہ پھر گیا اور مجھے اپنے عملیات وغیرہ کی طاقت سے ڈرانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے دھمکی آمیز لیچے میں کہا۔

”ملنگ کالیا! تم تو ایک جھوٹے عامل کامل اور بے بس ولا چار افراد کی نفسیاتی کمزوریوں سے کھیل کر اپنا دھندا اچکا رہے ہو۔ تمہارے عملیات کی قوت میرا کیا گاڑ لے گی۔ تم نے ابھی تک ہماری تفتیش کی قوت کا مزہ نہیں چکھا۔ آج میں تمہیں تھانے کے ”عملیات“ کا نظارہ کراؤں گا جسے دیکھ کر تمہاری کینہی نگاہ پتھر جا جائے گی، تمہارا حریص ذہن جامد ہو جائے گا اور تمہارا ذلیل دل دھڑکنا بھول جائے گا۔ ہمیں بھی بہت سے جادوئی کمالات دکھانا آتے ہیں۔ تم ہماری تحویل میں ”بہت کچھ“ سیکھو گے۔“

وہ میرے پتے ہوئے لیچے اور ہنگ آمیز انداز سے سلگ اٹھا اور خالی خولی دھکیوں کے بجائے مغلطات پر اتر آیا۔ میں نے اس کی اوقات کے مطابق اس سے سلوک کرتے ہوئے اسے حوالدار

کے مکان کو خالی کروانے کی کوشش ملنگ کالیا کرے گا لیکن مدفون خزانہ وہ دونوں آپس میں برابر تقسیم کریں گے۔ اس موقع پر بختا نے ایک عیاری سے کام لیا تھا اور ملنگ کو صرف ایک بھاری رقم کے بارے میں ہی بتایا تھا۔ زیورات، قیمتی پتھر اور سونے کی اینٹوں کا تذکرہ وہ گول کر گیا تھا۔ ملنگ کالیا کی نظر ایک نگڑی رقم کے ساتھ ساتھ بتول پر بھی جمی ہوئی تھی چنانچہ اس کمینہ فحش شیطان ابن شیطان نے اپنے مقصد کے حصول کی خاطر جو کوشش کی وہ آپ گزشتہ بیس تینتیس صفحات میں پڑھتے آرہے ہیں۔

تینوں کے اقبالی بیان کے بعد میرے لیے بہت آسانی پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے ان پر مختلف دفاتر لگا کر ہالان تیار کیا اور آئندہ روز انہیں عدالت کے حوالے کر دیا۔

اس واقعے کے ایک ماہ بعد منظور حسین اپنی زوجہ عابدہ خانم کے ساتھ مجھ سے ملنے آیا۔ میں نے احوال دریافت کرنے کے بعد بتول کی صحت کے بارے میں پوچھا ”اب آپ کی بیٹی کی طبیعت کیسی ہے؟“

”وہ آپ کی دعاؤں سے ماشاء اللہ بہت اچھی ہے۔“ منظور حسین نے بتایا ”ہم اسی سلسلے میں آپ سے ملنے آئے ہیں۔“

”اب اس کا کیا سلسلہ نکل آیا منظور؟“

میں بتاتا ہوں جناب۔“ منظور میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی لٹ اٹھا ”دراصل ہم جلد از جلد بتول کی شادی کر دینا چاہتے ہیں مگر وہ بے ضد ہے کہ آپ کی مرضی اور مشورے ہی سے شادی کرے گی۔ آپ نے اسے ایک جہنم میں گرنے سے بچایا ہے اس لیے اس کے روشن مستقبل کا سلسلہ بھی آپ ہی کریں گے۔“

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ایک منہ بولی بیٹی نے ایک منہ بولے باپ کے کمرے پر بہت بڑی ذمہ داری ڈال دی تھی۔ میں خود کو بہت ذمہ دار انسان سمجھتا ہوں اس لیے بہت سوچ سمجھ کر مجھے کوئی قدم اٹھانا تھا۔

میں نے عابدہ سے پوچھا ”تم بتول کی اس خواہش کے بارے میں کیا کہتی ہو؟“

”میں کیا کہوں جی۔“ وہ شکست خوردہ انداز میں بولی۔ ”اب تو بتول ہی کی بات ماننا پڑے گی۔ اس نے آپ کو بڑا بنایا ہے۔ جو فیصلہ آپ کریں گے وہی ماننا ہوگا۔“

میں نے یہ سوال منظور کے بجائے عابدہ سے اس لیے کیا تھا کہ گھر میں عابدہ ہی کی حکم رانی

ہے۔ جب میں نے بتول سے تفصیلی ملاقات کی تھی اس وقت اس سے میں نے یہ بھی پوچھ لیا تھا کہ وہ کسی خاص لڑکے کو پسند کرتی ہے یا نہیں! اس نے اس سلسلے میں کسی پسند یا ناپسند کا اظہار نہیں کیا تھا۔

میں نے منظور حسین سے سوال کیا ”آپ لوگوں کی نظر میں کوئی بہتر رشتہ ہے؟“ وہ بولا ”صدیقہ کا رشتہ عابدہ ٹھکرا چکی ہے۔ اور کوئی ذہنگ کا لڑکا میری نظر میں فی الحال نہیں ہے۔“

میں نے کھٹکار کر گھا صاف کیا اور ان دونوں کو بہ یک وقت مخاطب کرتے ہوئے کہا ”اگر بتول کا یہ خیال ہے کہ میں نے اسے جہنم میں گرنے سے بچایا ہے تو پھر میں اسے جنت میں داخل ہونے کا مفید مشورہ ضرور دوں گا۔۔۔ اور آپ دونوں کو بھی میرے مشورے سے اتفاق کرنا ہوگا۔ میں بتول کے لیے جس لڑکے کا انتخاب کروں گا، آپ دونوں کو اسے اپنا داماد بنانا ہوگا۔“

”منظور ہے۔“ وہ دونوں بہ یک آواز ہو کر بولے۔

میں نے ان کے سامنے آئینہ بیگم کے بیٹے محمد صدیق عرف صدیقہ کا نام رکھ دیا۔ میں اس لڑکے سے مل چکا ہوں اور میرے حساب سے وہ بتول کے لیے نہایت ہی مناسب اور موزوں تھا۔

ان دونوں نے میری تجویز اور انتخاب پر صا د کیا اور لمبی خوشی رخصت ہو گئے۔ میں اس سے زیادہ بتول کے لیے کیا کر سکتا تھا۔ وہ ایک سیاہ کار کے بچہ ستم سے نکل آئی تھی۔ میں نے ملنگ کالیا کو ایسا فٹ کیا تھا کہ اسے زندگی کا بیش تر حصہ اب جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارنا تھا۔

ملنگ کالیا جیسے لعنتی کردار ہر علاقے میں پائے جاتے ہیں۔ اللہ سب کو ان کے شر سے محفوظ رکھے۔ آمین!

چلتے چلتے یہ بھی سن لیں کہ عابدہ کے گھر سے جو ”مدفون خزانہ“ برآمد ہوا تھا، مختلف سرکاری مراحل سے گزرنے کے بعد اسے اس کے مالک چوہدری امانت علی کے حوالے کر دیا گیا تھا جو اس وقت قریب المرگ تھا۔ چوہدری نے خوشی کے اس موقع پر سونے کے دو بیٹ بتول کی شادی میں تحفے کے طور پر دے دیے تھے۔



اکثر افراد پولیس والوں کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہیں۔ اس کے لیے انہیں تصور وار بھی نہیں بٹھرایا جاسکتا کیونکہ رامیڈیا ان کے ذہن میں پولیس والوں کا بڑا شرمناک تصور اجاگر کرتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ ہاتھ مارنے والی دی ڈراموں اور فلموں کا ہے جہاں پولیس والوں کو انتہائی ظالم، جابر اور رشوت خور دکھایا جاتا ہے۔ وہ بے گناہ شہریوں کو اٹھا کر تھانے میں بند کر دیتے ہیں۔ ان پر گرجتے برستے ہیں انہیں ڈراتے دھمکاتے ہیں اور ان کی جان بخشی کے عوض لمبی چوڑی رقم طلب کرتے ہیں۔ اگر کوئی بے تصور شخص ان کا مطالبہ پورا نہ کرے مانتہ کر سکے تو اس کو نہ صرف بے دردی سے پھینٹی لگائی جاتی ہے بلکہ اس پر بے دریغ تشدد بھی کیا جاتا ہے۔ بعد ازاں انہیں جعلی مقدمات میں الجھا کر جیل بھیج دیا جاتا ہے۔

کسی بھی جگہ میں کالی بھیتروں کے وجود سے انکار تو ممکن نہیں ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پولیس والے بھی آپ ہی کی طرح کے انسان ہوتے ہیں۔ ہماری پولیس ٹی وی اور فلم والوں کی پولیس سے بالکل مختلف ہے۔ ہمارے تھانوں میں شرفا کا احترام کیا جاتا ہے۔ انہیں عزت سے کرسی پر بٹھایا جاتا ہے۔ ان کے مسائل پوری توجہ سے سنے جاتے ہیں اور ممکن حد تک ان کی مدد کی جاتی ہے۔ البتہ مجرموں کے ساتھ پولیس سختی کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ وہ آسانی سے زبان کھولنے پر تیار نہیں ہوتے اور جھوٹ بول کر خود کو سزا سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں لہذا جج اگلو ان کے لیے پولیس کو ان کی "خاطر مدارات" کرنا پڑتی ہے۔

آج میں آپ کی خدمت میں ایک عبرت اثر واقعہ پیش کرتا ہوں۔

وہ موسم گرما کی ایک خوش گوار صبح تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ میں مکلف وردی میں ملبوس

تھانے پہنچا تو پتا چلا کہ گنے کے کھیتوں میں سے ایک نوجوان شخص کی لاش ملی ہے۔ لاش کی اطلاع دینے والا ایک غریب صورت مزارع تھا۔ ان دنوں گنے کی فصل کی کٹائی شروع ہو چکی تھی۔ مذکورہ مزارع کا نام چراغ دین تھا۔

چراغ دین نے مجھے بتایا کہ وہ حسب معمول گنے کی کٹائی میں مصروف تھا۔ جب وہ ایک کھیت کے اندرونی حصے میں پہنچا تو وہاں ایک نوجوان کو اوندھے منہ پڑے دیکھ کر چونک اٹھا۔ قریب جا کر جب چراغ دین نے اس کا جائزہ لیا تو اسے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ وہ شخص اب زندہ نہیں تھا۔ چراغ دین نے اپنی دیوانتی وغیرہ کو کھیت ہی میں چھوڑا اور فی الفور اس واقعے کی اطلاع دینے تھانے چلا آیا تھا۔

میں نے پوری بات سننے کے بعد چند سیپاہیوں کو ساتھ لیا اور موقع پر پہنچ گیا۔ اس وقت ساڑھے نو بج چکے تھے۔ جائے وقوعہ پر اچھے خاصے لوگ جمع تھے۔ میں نے سب کو پیچھے ہٹایا اور نوجوان کی لاش کا جائزہ لینے لگا۔ مجھے پہلی ہی نظر میں اندازہ ہو گیا کہ مذکورہ نوجوان زندگی کی قید سے آزاد ہو چکا ہے۔ یہ بات بھی یقینی تھی کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔

مقتول کی عمر کا اندازہ میں نے چوبیس پچیس سال کے درمیان لگایا۔ اس نے دو گھوڑا مارا کہ بوسکی کی شروانی کا قمیض پہن رکھی تھی۔ اس وقت کے رواج کے مطابق بوسکی کی قمیض کے ساتھ کورے لٹھے کی شلوار بھی اس کے جسم پر نظر آ رہی تھی۔ مقتول کے پاؤں میں کوہائی چیل تھی۔ اپنی شکل و صورت اور وضع قطع سے وہ ایک نفیس اور آسودہ حال شخص دکھائی دیتا تھا۔ اس کا لباس نیا اور بے داغ تھا۔ وہ اس وقت اوندھے منہ زمین پر پڑا تھا۔ اس کی پوزیشن سے اندازہ ہوتا تھا کہ جیسے وہ اکڑوں بیٹھے ہوئے اچانک منہ کے بل گر پڑا ہو۔

مقتول کے سر کے پچھلے حصے میں چوٹ کا نمایاں نشان نظر آ رہا تھا۔ چوٹ ان قدر شدت سے لگائی گئی تھی کہ کھوپڑی جڑ گئی تھی اور بہنے والے خون نے بوسکی کی قمیض کو رنگین کر دیا تھا۔ سر کے دوسرے حصوں پر بھی چوٹوں کے کچھ نشانات پائے گئے تھے تاہم وہ اتنے مہلک نہیں تھے۔ سب سے کاری ضرب سر کے پچھلے حصے میں لگائی تھی اور میرے خیال کے مطابق یہی ضرب اس کی موت کا سبب بنی تھی۔ ایک بات واضح تھی کہ مقتول کے عقب سے اس پر حملہ کیا گیا تھا۔ میں نے چوٹوں سے فوری طور پر یہ اندازہ لگالیا تھا کہ حملہ لائٹھی یا لائٹھوں سے کیا گیا تھا۔ حملہ آور ایک شخص بھی ہو سکتا تھا اور ایک سے زیادہ اشخاص بھی۔ مجھے بتایا گیا کہ مقتول کا نام عارف علی تھا اور وہ اسی گاؤں کا رہنے والا

تھا۔

میں نے مقتول کی لاش کو پلٹ کر دیکھا تو چونک اٹھا۔ اس کی شلوار کا کمر بند کھلا ہوا تھا۔ میرے ذہن میں تیز روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔ پوری صورت حال مجھ پر واضح ہو گئی۔ یہ بات یقینی تھی کہ جب مقتول کے عقب سے حملہ آور نے اس کے سر کو نشانہ بنایا، اس وقت مقتول پیشاب کرنے کے لیے بیٹھا ہوا تھا۔

میں نے پوری طرح لاش کا جائزہ لینے کے بعد مقتول کی تلاشی لی۔ مقتول کی سامنے والی جیب میں سے ایک عدد ہاتھ کا کڑھا ہوا ریشتی رد مال، المونیم کی چھوٹی کنگھی اور کچھ کاغذات برآمد ہوئے۔ قمیض کی سامنے والی جیب میں سے ایک چھوٹی ڈیبا ملی۔ یہ سونے کے زیورات رکھنے والی ڈیبا تھی۔ اس کے سائز اور بناوٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ انگوٹھی کے لیے بنائی گئی تھی لیکن اس وقت وہ ڈیبا خالی تھی۔ انگوٹھی اس میں موجود نہیں تھی۔

میں نے مقتول کی جیب جس سے برآمد ہونے والے کاغذات کو دیکھنا شروع کیا تو کاغذات کے اندر سے کچھ رقم نکلی۔ وہ ایک سو ساٹھ روپے مالیت کے چھوٹے بڑے نوٹ تھے۔ ان ہی کاغذات میں سونے کی انگوٹھی کی ایک رسید بھی برآمد ہوئی۔ یہ رسید ”محبوب جیولرز“ کی تھی اور پتہ صرافہ بازار لاہور کا تھا۔ رسید پر ایک ماہ پہلے کی تاریخ درج تھی۔ اس رسید کے مطابق پانچ ماہ ورن کی ایک طلائی انگوٹھی مبلغ پینتالیس روپے میں خریدی گئی تھی۔ خریدار کا نام عارف علی تھا۔

میں نے مقتول کی جامد تلاشی سے برآمد ہونے والی تمام اشیاء اپنے قبضے میں کیا اور گھوم پھر کر جائے واردات کا جائزہ لینے لگا۔ جس کھیت میں سے مقتول کی لاش ملی تھی اس کے قریب ہی ایک ٹوبہ ویل تھا۔ میں وقوعہ کا نقشہ تیار کرنے میں مصروف تھا کہ پتا چلا، مقتول عارف علی کا بڑا بھائی نذر علی اس سامنے کی اطلاع پا کر موقع واردات پر آن پہنچا ہے۔ نذر علی سیدھا میرے پاس آیا۔ میں اس وقت لاش کے قریب ہی کھڑا تھا۔ وہ اپنے بھائی کی لاش کو دیکھتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولا۔

”تھانے دار صاحب! یہ کیا ہو گیا۔ میرے بھائی کو کس نے قتل کیا ہے؟“

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تشفی آمیز لہجے میں کہا ”نذر علی! میں اسی بات کا پتا چلانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تمہارے بھائی کا قاتل کون ہے اور اس قتل کا محرک کیا ہے۔ اس کے لیے مجھے تمہارے بھرپور تعاون کی ضرورت ہے۔“

”میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔ وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔“

میں نے پوچھا ”تمہارے خیال میں عارف علی کو کس نے قتل کیا ہو گا؟“
”میں کچھ نہیں جانتا جناب۔“ وہ دھکی لہجے میں گویا ہوا ”عارف علی رات کو بھلا چنگا چھت پر سونے کے لیے گیا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اب اس کی لاش دیکھنے کو ملے گی۔“
”تمہیں کسی پر شک ہے؟“
”نہیں جناب۔“

میں نے پوچھا ”عارف علی کی کسی سے دشمنی وغیرہ تھی؟“
”ایسی کوئی بات نہیں تھی جناب۔۔۔۔۔“ نذر علی نے بتایا ”وہ تو سب کا دوست تھا۔ کوئی شخص اس سے دشمنی کر ہی نہیں سکتا تھا۔“
میں نے کہا ”نذر علی! کوئی کسی کو بلاوجہ قتل نہیں کرتا۔ ایسا کام کوئی دوست نہیں بلکہ دشمن ہی کر سکتا ہے اور تم کہتے ہو اس کا کوئی دشمن نہیں تھا؟“

”آپ پورے پنڈے پوچھ لیں جناب عارف کی کسی سے لڑائی نہیں تھی۔ آج تک کسی سے اس کا معمولی سا جھگڑا بھی نہیں ہوا۔ سب اس کی تعریف کرتے تھے۔“
”نذر علی!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”جہاں انسان کے سو دوست ہوتے ہیں وہاں ایک آدھ دشمن بھی ہوتا ہے اور بعض دشمن تو دوست نما ہوتے ہیں۔ لگتا ہے یہ بھی کسی ایسے ہی دوست نما دشمن کا کام ہے۔“

وہ رو دینے والے انداز میں بولا ”میری تو مت ماری گئی ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میرے گہرے بھائی کو کس کی نظر لگ ہے۔“

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بھائی کی لاش کے نزدیک ہی زمین پر بیٹھ گیا۔
میں نے ضابطہ کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد عارف علی کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے ضلع اسپتال بھجوا دی اور موقع پر موجود افراد کے بیانات قلم بند کرنے لگا۔ تاہم کوئی ایسی بات معلوم نہ ہو سکی جو عارف علی کے قتل پر روشنی ڈال سکتی۔ مجموعی طور پر مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں اس کا خلاصہ یہ تھا کہ عارف علی ایک مہذب، پڑھا لکھا اور صلح جو انسان تھا۔ وہ گریجویٹ تھا اور ابھی تک اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے لاہور کے ایک کالج سے گریجویشن کیا تھا۔ وہ کچھ عرصہ لاہوری میں ملازمت بھی کرتا رہا تھا اور کم و بیش ایک ماہ قتل گاؤں آیا تھا۔ اب اس کا ارادہ مستقل طور پر یہیں رہنے کا تھا۔

عارف علی کو کبھی بھی کبھی باڑی سے دلچسپی نہیں رہی تھی لیکن حیرت انگیز طور پر اس مرتبہ جب وہ

گاؤں آیا تو یہ ابرادہ کر کے آیا تھا کہ اب وہ کاشت کاری کے معاملات میں بڑے بھائی کا ہاتھ بنائے گا۔ وہ باپ دادا کے پیٹے کو اپنانے کا مقصد فیصلہ کر چکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ بہتر طور پر زمین کے معاملات کو دیکھ سکے گا۔

مقتول کے بارے میں اکثریت کا تاثر بہت اچھا تھا۔ عام رپورٹ یہی تھی کہ اس کا کوئی دشمن نہیں تھا اور گاؤں کا ہر شخص عارف علی جیسے بے ضرر اور خاموش طبع انسان کے وحشیانہ قتل پر حیرت زدہ تھا۔ لیکن میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ میرے ذہن میں شک کے کئی دروازے کھل چکے تھے۔ میں اپنے ان خیالات کا اظہار آگے چل کر مناسب موقع پر کروں گا۔

جائے واردات سے فارغ ہو کر میں نذر علی کے ساتھ اس کے گھر چلا آیا۔ اس کا گھر ایک چھوٹی حویلی سے مشابہ تھا۔ نذر علی کی عمر لگ بھگ چالیس سال تھی اور وہ شادی شدہ تھا۔ اس کے تین بچے تھے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ گزشتہ شب معمول عارف علی رات کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد چھت پر چلا گیا تھا۔ موسم گرما میں چھت پر سونا اسے پسند تھا۔ گھر کے باقی افراد کشادہ صحن میں سوتے تھے۔

میں نے پوچھا ”نذر علی تمہارا بھائی کتنے بچے سونے کے لیے چھت پر گیا تھا؟“
”ٹھیک وقت کا تو مجھے اندازہ نہیں جناب۔“ نذر علی نے بتایا ”بیسے میرا خیال ہے وہ دس بجے کے بعد ہی چھت پر گیا تھا۔“

میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا ”اس وقت ساڑھے دس بج رہے ہیں۔ تم آدھا گھنٹا پہلے جائے واردات پر پہنچے تھے۔ کیا تمہیں اس سے پہلے معلوم نہیں تھا کہ تمہارے بھائی کو کسی نے قتل کر دیا تھا؟“

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”تمہارے دار صاحب! میں منہ اندھیرے اپنے رشتہ کی طرف نکل جاتا ہوں۔ عارف علی ذرا دیر سے اٹھے گا عادی ہے۔ میں حسب معمول گھر سے نکل گیا تھا۔ واپسی پر مجھے معلوم ہوا کہ عارف علی کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ پھر میں بھاگا بھاگا کھیتوں میں جا پہنچا۔“
”نذر علی! آج صبح حسب معمول جب تم گھر سے نکلے تو کیا اس وقت عارف علی گھر میں موجود تھا۔“

”میرا مطلب ہے کیا وہ اس وقت چھت پر سو رہا تھا؟“

”ظاہر ہے وہ چھت پر ہی ہوگا۔“

”کیا تم نے چھت پر جا کر دیکھا تھا؟“

”نہیں جناب! میں نے دیکھا تو نہیں تھا۔“ نذر علی نے جواب دیا۔
میں نے پوچھا ”نذر علی! جب تم گھر سے نکلے تھے اس وقت تمہارے گھر کا اندرونی دروازہ بند تھا یا کھلا ہوا تھا؟“

”بند تھا جناب۔“

”یعنی جیسے رات سونے سے پہلے تم نے اسے بند کیا تھا وہ تمہارے جانے تک ویسے ہی بند تھا؟“

نذر علی نے اثبات میں جواب دیا ”میں نے پوچھا“ کیا گھر سے باہر جانے کا کوئی اور دروازہ بھی موجود ہے؟“

”نہیں جناب! ایسا کوئی دروازہ موجود نہیں ہے۔“

میں نے کہا ”نذر علی! میں تمہارے گھر کی چھت دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”آپ میرے ساتھ آئیں۔“ اس نے کہا اور سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

میں نذر علی کی راہ نمائی میں چھت پر پہنچ گیا۔ نذر علی نے مجھے بتایا کہ مقتول عارف علی رات کو کس چارپائی پر سویا تھا۔ میں نے اس چارپائی کا بغور جائزہ لیا۔

وہ رنگ داری پاپوں والی ایک خوب صورت چارپائی تھی جس پر سفید رنگ کا ایک بے داغ کھیس بچھا ہوا تھا۔ کھیس پر کوئی شکن نظر نہیں آ رہی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ عارف علی رات کو اس بستر پر سویا ہی نہیں تھا۔

گھر کے پچھواڑے میں ایک باڑا نظر آ رہا تھا جس میں نصف درجن کے قریب مویشی بندھے ہوئے تھے جن میں بیل، بھینس اور بکریاں شامل تھیں۔ گھر کی چھت سے لکڑی کی ایک سیڑھی باڑے کے اندر چلی گئی تھی۔

میں نے نذر علی سے پوچھا ”یہ باڑا کس کا ہے؟“

”میرا ہے جناب۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے لکڑی کی اس سیڑھی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا ”نذر علی! کیا یہ سیڑھی مستقل نہیں لگی رہتی ہے؟“

”جی ہاں جناب۔“

”میں تمہارا باڑا دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”آجائیں۔“ اس نے سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے کہا۔

ابھی تک میں یہ سمجھ نہیں سکا تھا کہ مقتول عارف علی گئے کے کھیتوں میں کیوں کر پہنچا تھا۔ اسے کوئی بلا کر لے گیا تھا یا وہ خود کسی سے ملنے وہاں گیا تھا۔ نذر علی نے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ رات چھت پر جانے کے بعد عارف علی پھر نیچے نہیں اتر اٹھا۔ اگر وہ گھر کے بیرونی دروازے سے باہر جاتا تو صبح نذر علی کو وہ دروازہ کھلا ہوا ملتا لیکن نذر علی نے اس کی تردید کی تھی۔ اب باڑے میں لگی ہوئی اس سیڑھی کو دیکھ کر مجھے خیال آیا تھا، ممکن ہے عارف علی اس سیڑھی کے ذریعے باڑے میں اتر اہوا اور پھر وہیں سے باہر نکل گیا ہو۔

ہم دونوں آگے پیچھے باڑے میں اتر آئے۔ باڑے کے ایک کونے میں کئے ہوئے چارے کا ڈھیر لگا ہوا تھا، دوسری طرف جلانے والی لکڑیاں اور اپنے رکھے ہوئے تھے۔ ایک بغیر دروازے کے کمرے میں بل اور پچھلے پڑی تھیں۔ اس کے علاوہ کچھ ناکارہ مشین پرزے بھی رکھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ باڑے کے بیرونی دروازہ ایسا تھا جسے اندر اور باہر دونوں جانب سے کھولا جاسکتا تھا۔ میں نے گھوم پھر کر ہر امکان کا جائزہ لیا پھر نذر علی سے پوچھا۔

”لگتا ہے تمہارا بھائی باڑے کے راستے سے باہر گیا تھا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظر جمادی۔

”شاید آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔“ نذر علی نے جواب دیا۔ ”میرا ایک راستہ ہے جہاں سے وہ میرے علم میں آئے بغیر باہر جاسکتا تھا۔“

”ہوں!“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ”وہ تمہارے علم میں لائے بغیر گھر سے باہر کیوں گیا تھا؟“

”یہی بات تو میری بھی سمجھ میں نہیں آرہی۔“

میں نے کہا ”نذر علی“ اگر تم نے مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کی تو یہ تمہارے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔ اگر ایسی ویسی کوئی بات ہے تو تم ابھی مجھے بتا دو ورنہ بعد میں تمہیں پچھتانا پڑے گا۔“

”مجھے جو کچھ معلوم تھا وہ آپ کو بتا چکا ہوں جناب۔“ وہ روہانسا ہو رہا تھا۔

میں نے پوچھا ”نذر علی“ تمہارے بھائی کی لاش جن کھیتوں سے ملی ہے وہ تمہارے گھر سے خاصے فاصلے پر ہیں۔ مجھے بتاؤ عارف علی کو ایسی کیا ضرورت پیش آگئی کہ وہ تمہارے علم میں لائے بغیر وہاں پہنچ گیا تھا؟“

اس نے اپنی لائے کا اظہار کیا، میں نے پوچھا ”نذر علی“ سچ بتاؤ۔ تمہارے بھائی کا کسی لڑکی سے کوئی چکر تو نہیں چل رہا تھا؟“

اس نے جواب دینے میں تھوڑی سی ہچکچاہٹ کا اظہار کیا پھر بولا ”نہیں جناب، ایسی تو کوئی بات نہیں تھی۔“

میں نے کہا ”سوچ لو نذر علی“ اگر بعد میں کوئی ایسی بات نکل آئی تو میں تمہارے ساتھ سختی سے پیش آؤں گا۔“

”آپ میری بات کا یقین کریں تمہانے دار صاحب۔“ وہ ملتھیانہ انداز میں بولا ”میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔“

میں واضح طور پر محسوس کر رہا تھا کہ نذر علی مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے تاہم میں نے اس وقت زیادہ اصرار نہیں کیا اور اس کے ساتھ واپس گھر میں آ گیا۔ ہم دوبارہ بیٹھک میں آ کر بیٹھے تو میں نے سوال کیا۔

”نذر علی“ کیا عارف علی کسی لڑکی کو پسند کرتا تھا؟“

وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پھر بولا ”تمہانے دار صاحب میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس نے کبھی مجھ سے ایسا کوئی ذکر نہیں کیا۔“

میں نے کہا ”عارف علی تعلیم یافتہ اور صحت مند نو جوان تھا۔ اس عمر میں اس کی شادی ہو جانا چاہیے تھی۔ کیا تم نے کہیں اس کے رشتے کی بات چلائی تھی؟“

”ابھی ایک ماہ پہلے تو وہ لاہور سے آیا تھا۔“ نذر علی نے جواب دیا ”جب وہ لاہور میں ملازمت کر رہا تھا تو میں نے کئی بار شادی کے موضوع پر اس سے بات کرنا چاہی تھی لیکن وہ ہمیشہ ٹال جاتا تھا۔ کہتا تھا پہلے وہ اپنی ایک حیثیت بنائے گا پھر شادی کے بارے میں سوچے گا۔ میں نے اس کو سمجھایا کہ ہم باحیثیت لوگ ہیں۔ ہماری اچھی خاصی زمین ہے۔ اللہ کا دیا ہوا سب کچھ ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اپنا آبائی پیشہ چھوڑ کر لاہور شہر میں کوئی کاروبار کرنا چاہتا ہے۔ میں نے بھی زیادہ زور نہیں دیا پھر اچانک ہی اس کے خیالات بدل گئے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

نذر علی نے بتایا ”پہلی مرتبہ جب وہ یہاں آیا تھا تو واپس جاتے ہوئے ہوا کچھ اداس نظر آ رہا تھا جب کہ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ گاؤں سے شہر جاتے ہوئے ہمیشہ خوش نظر آیا تھا۔“

”تم نے اس کے افسردہ ہونے کی وجہ پوچھی تھی؟“

”ہاں میں نے اس سے اس بارے میں پوچھا تھا۔“ نذر علی نے جواب دیا ”میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا تھا کہ اب اس کا دل نہیں چاہتا کہ وہ گاؤں سے جائے۔“

میں نے پوچھا ”اس نے دل کے نہ چاہنے کا سبب بھی بتایا ہوگا؟“

”سبب تو نہیں بتایا تھا البتہ یہ کہا تھا کہ ممکن ہے وہ آخری بار لاہور جا رہا ہو۔“ نذر علی نے کہا ”شاید اس نے ٹھیک ہی کہا تھا کیونکہ اس مرتبہ وہ یہی فیصلہ کر کے آیا تھا کہ اب وہ مستقل گاؤں میں ہی رہے گا لیکن گاؤں میں ایک ماہ سے زیادہ رہنا اسے نصیب نہ ہوا۔“ نذر علی کی آواز بھرا گئی ”کسی طالب نے اس کی زندگی کا چراغ ہی گل کر دیا۔“

میں نے ہمدردی سے کہا ”نذر علی مجھے تمہارے بھائی کی ناگہانی موت کا دکھ ہے۔ تم فکر نہ کرو میں اس کے قاتل کو بہت جلد ڈھونڈ نکالوں گا۔ بس مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔“

”آپ حکم کریں، تمہارے دار صاحب۔“ وہ آنسو خشک کرتے ہوئے بولا ”میں جو کچھ کر سکا ضرور کروں گا۔“

میں نے کہا ”نذر علی! تم نے ابھی مجھے بتایا ہے کہ پچھلی مرتبہ جب عارف گاؤں آیا تھا تو کسی وجہ سے اس کا واپس جانے کوئی نہیں چاہ رہا تھا۔ تمہارے پوچھنے کے باوجود بھی اس نے اس کا سبب نہیں بتایا تھا۔ کیا تم نے اس کے جانے کے بعد اپنے طور پر کوئی سگن اپنے کی کوشش نہیں کی کہ اچانک اسے گاؤں میں ایسا کیا نظر آ گیا تھا کہ یہاں سے جاتے ہو۔“ افسردہ ہوا ہوا تھا؟“

وہ ایک سرد آہ بھرتے ہوئے گویا ہوا ”تمہارے دار صاحب مجھے خود عارف کی کیفیت سے حیرت ہوئی تھی اور جیسا آپ اس وقت سوچ رہے ہیں ایسا ہی اس وقت میں نے بھی سوچا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید گاؤں کی کوئی لڑکی اس کے پاؤں کی زنجیر بن رہی ہے۔ میں نے اپنے تئیں معلوم کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔“

میں نے پوچھا ”نذر علی ذرا سوچ کر بتاؤ۔ عارف علی عام طور پر کتنے عرصے بعد گاؤں آتا تھا؟“

”سال میں ایک مرتبہ جناب۔“

”یہاں گاؤں میں وہ کتنے دن ٹھہرتا تھا؟“

”وہ دس بارہ دن سے زیادہ نہیں رکھتا تھا۔“

میں نے پوچھا ”کیا اس مرتبہ بھی وہ پورے سال کے بعد ہی واپس آیا تھا؟“

”نہیں جناب۔“ نذر علی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا ”اس بار تو وہ دو ماہ بعد ہی واپس لوٹ آیا تھا۔“

”اور یہ فیصلہ کر کے آیا تھا کہ اب وہ کبھی گاؤں سے نہیں جائے گا؟“

”جی ہاں۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ گاؤں میں کسی چیز سے اس کا دل لگ گیا تھا۔“ میں نے پرسوج انداز میں کہا ”ایک جوان اور خوب صورت شخص کا دل کسی لڑکی ہی میں لگ سکتا ہے نذر علی!“

”ہو سکتا ہے ایسا ہی ہوا ہو۔“ نذر علی نے کہا ”لیکن میں اس بار نے میں کچھ نہیں جانتا۔“

دفعہ پر میں نے کچھ افراد کے بیانات نوٹ کیے تھے۔ اس وقت میرے ذہن میں کئی مشکوک سوالات نے سر ابھارا تھا۔ ان ہی سوالات میں ایک نذر علی کے بارے میں بھی تھا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ مقتول عارف علی کو کاشکار سے کوئی لگاؤ نہیں تھا اور زمین و زمینداری کے سارے معاملات نذر علی کے ہاتھ میں تھے۔ چھوٹے بھائی نے نہ تو کبھی بڑے بھائی کے کام میں مداخلت کی تھی اور نہ ہی کبھی کسی حساب کتاب کے بارے میں کوئی سوال کیا تھا۔ اب وہ اچانک سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گاؤں آ گیا تھا اور اپنا آبائی پیشہ اپنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ان حالات و واقعات کی روشنی میں اس بات کا امکان بہر حال موجود تھا کہ مقتول عارف علی کے اس اچانک فیصلے سے نذر علی کو تشویش ہوئی ہو۔ اس نے سوچا ہو کہ آگے چل کر چھوٹا بھائی کہیں زمین کے بنوارے کا ٹکٹا کھڑا نہ کر دے یا آج تک کا حساب نہ طلب کر لے۔ زن زراور زمین کے معاملے میں کوئی بھی بات خالی از امکان نہیں ہوتی۔ ممکن ہے نذر علی نے خود ہی بھائی کو راستے سے ہٹا دیا ہو؟ اس سوال کی روشنی میں میں نے نذر علی سے پوچھا۔

”نذر علی! میں نے سنا ہے تمہارا بھائی اب کھیتی باڑی کا ارادہ رکھتا تھا؟“

”آپ نے ٹھیک سنا ہے جناب۔“ اس نے جواب دیا ”حالانکہ اس سے پہلے وہ اس کام سے کتراتا رہا تھا۔ میں اس کے کاشکاری کے فیصلے سے بہت حیران ہوا تھا۔“

”اب تو تمہاری حیرت دور ہو گئی ہوگی؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے چہیتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

وہ جڑبڑ ہو کر بولا ”میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا جناب!“

میں نے کہا ”میرا مطلب ہے کہ اب تو تم مطمئن ہو گئے ہو گے۔ عارف علی زمینداری کرنے

کے لیے زندہ نہیں رہا۔ تم اسی طرح اپنا کلام چلاتے رہو گے جیسا اب تک کرتے آئے ہو؟“

وہ میرے سوال کا مقصد سمجھ گیا، جلدی سے بولا ”آپ بالکل غلط سمجھ رہے ہیں جناب۔ آپ خواہ مخواہ مجھ پر شک کر رہے ہیں۔ میں اپنے بھائی کی جان لینے کا تو کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

میں نے کہا ”نذر علی! اس میں کوئی شک نہیں کہ عارف علی تمہارا چھوٹا بھائی تھا۔ وہ تمہارا بازو تھا۔ اس کی موت کا جتنا دکھ تمہیں ہو سکتا ہے اتنا کسی اور کو ہو ہی نہیں سکتا لیکن میں اپنے فرائض سے مجبور ہوں۔ میں قاتل کا سراغ لگانے کے لیے چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ تمہاری ذات پوری طرح شک سے پاک نہیں ہے۔ خاص طور پر ان آلات کے پس منظر میں کہ مقتول پورے جوش و خروش کے ساتھ کھتی باڑی کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔“

”چند لمحے کچھ سوچو، رہا پھر بولا ”تھانے دار صاحب“ میں آپ کی سوچ پر کوئی پابندی لگا سکتا ہوں اور نہ ہی آپ کی نفی کے راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی کر سکتا ہوں۔ دلوں کے حال اللہ جانتا ہے۔ میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں بگناہ ہوں۔ مجھے صدی صدی عین ہے کہ میرا اللہ میری عزت ضرور رکھے گا۔“

میں نے پوچھا ”نذر علی! تم ایک طویل عرصے سے زمینوں کا انتظام سنبھالے ہوئے ہو۔ مانا کہ مقتول کو زمین و جائداد کے معاملات سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی لیکن ایسا تو ہو سکتا ہے کہ اس کی خواہش ہو اس کے حصے کی زمین اسے مل جائے؟“

نذر علی نے کہا ”عارف علی نے کبھی ایسی کوئی خواہش ظاہر نہیں کی۔ اگر وہ زمین میں سے اپنا حصہ مانگتا تو میں بخوشی اس کے حوالے کر دیتا۔“

”کیا اس نے کبھی زمین کی آمدنی کا حساب بھی مانگا تھا؟“

”نہیں جناب اس نے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔“

نذر علی کے لہجے میں کوئی ایسی بات موجو تھی جو اس کی سچائی پر دلالت کرتی تھی لیکن جب تک اصل قاتل کا سراغ نہ ملتا، میں نذر علی کی ذات کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اسے مشکوک افراد کی لسٹ میں رکھ لیا۔

پھر میں نے سوالات کا زور یہ تبدیل کرتے ہوئے کہا ”نذر علی! تمہارے بھائی کی لاش گنے کے کھیتوں میں سے ملی ہے۔ تم خود وہ جگہ دیکھ چکے ہو۔“

”جی ہاں وہ گنے کا کھیت ہی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا ”وہ زمین کس کی ملکیت ہے؟“

”گرداور ارشاد حسین کی۔“ ٹھکے مال کا ایک عہدہ جو پنواری سے ایک درجہ اوپر ہوتا ہے۔ ”گرد

اور“ کو ”قانون گو“ بھی کہا جاتا ہے۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ ارشاد حسین گرداور سرکاری ملازم تھا اور اس گاؤں میں اس کی اچھی خاصی زمین تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس نے سوا یکڑ کے قریب زمین کس طرح حاصل کی تھی البتہ ایک بات تھی کہ عام لوگوں میں ارشاد حسین گرداور کا تاثر بہت اچھا تھا۔ لوگ اس کا احترام کرتے تھے اور اس احترام میں ڈر و خوف سے زیادہ محبت اور عقیدت پائی جاتی تھی۔

میں نے گرداور ارشاد حسین کا نام اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ میرا خیال تھا کہ فرصت ملے ہی میں اس سے بھی اس سلسلے میں پوچھ گچھ ضرور کروں گا۔ پھر میں دوبارہ نذر علی کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”نذر علی!“ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ”اس مرتبہ تمہارا بھائی لاہور سے سونے کی کوئی انگوٹھی بھی لایا تھا؟“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا ”نہیں جناب۔ آپ کس قسم کی انگوٹھی کا ذکر کر رہے ہیں؟“

میں نے اپنی جیب میں سے انگوٹھی والی خالی ڈبیا نکال کر نذر علی کو دکھائی اور کہا ”یہ ڈبیا مجھے مقتول کی جامہ تلاشی سے ملی تھی۔“ پھر میں نے اسے ”محبوب جیولرز“ کی رسید دکھاتے ہوئے اپنی بات کی وضاحت کی ”نذر علی! عارف علی نے ایک ماہ قبل محبوب جیولرز سے سونے کی ایک انگوٹھی خریدی تھی۔ ایک ماہ قبل کا مطلب یہ ہوا کہ جب وہ لاہور سے گاؤں آیا تھا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ کس ہستی کے لیے شہر سے طلائی انگوٹھی خرید کر لاسکتا ہے؟“

”یہ تو سارا قصہ ہی میری سمجھ سے بالاتر ہے۔“ وہ ہونٹوں کی طرح انگوٹھی والی ڈبیا کو دیکھتے

ہوئے بولا ”یہ ڈبیا تو خالی نظر آ رہی ہے۔ اس کی انگوٹھی کہاں گئی؟“

”اس انگوٹھی کے درست مقام کے بارے میں صرف تمہارا بھائی جانتا تھا جواب زندہ نہیں رہا

اس لیے میں تمہارے سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا

”مجھے یہ ڈبیا مقتول کے لباس میں سے ایسے ہی خالی ملی تھی۔“

”میں ذرا اپنی گھر والی سے پوچھتا ہوں۔“ نذر علی نے الجھن آمیز لہجے میں کہا ”شاید وہ اس

بارے میں کچھ جانتی ہو۔“

میں نے کہا ”تم اپنی گھر والی کو ادھر بیٹھک ہی میں بلا لو۔ میں بھی اس سے بہت کچھ پوچھنا

چاہتا ہوں۔“

نذر علی اٹھ کر گھر کے اندر دینی حصے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنی بیوی کو لے کر آ گیا۔ اس کی بیوی کا نام خالدہ پروین تھا۔ وہ ایک قبول صورت عورت تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے تیس اور پتیس کے درمیان لگایا۔ اس کے ساتھ اس کی سب سے چھوٹی بیٹی عالیہ بھی تھی۔ عالیہ کی عمر کم دیش پانچ سال تھی۔ عالیہ سے بڑی بہن کا نام فردوس تھا۔ فردوس سے بڑا ایک بھائی کا مران تھا۔

خالدہ پروین کو انگوٹھی والی خالی ڈبیا کا پس منظر سنانے کے بعد میں نے پوچھا ”خالدہ بی بی“ عارف علی تمہارا دیور تھا۔ دیور بھابیوں سے بہت بے تکلف ہوتے ہیں اور عام طور پر انہیں اپنے ہر راز میں شریک رکھتے ہیں۔ تمہیں تو علم ہوگا وہ یہ انگوٹھی کس کے لیے لایا تھا؟“

”جی“ اس نے مجھے تو انگوٹھی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“ خالدہ نے جواب دیا ”میں سوچ رہی ہوں لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا“ آخر یہ چکر کیا ہے۔“

”میں بھی اسی چکر سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا ”یہ بات تو ثابت ہے کہ وہ لاہور سے آتے ہوئے اپنے ساتھ ایک انگوٹھی خرید کر لایا تھا۔ مجھے اس کی جیب سے انگوٹھی کی رسید بھی ملی ہے۔ اگر یہ بتا چل جائے کہ مقتول عارف علی وہ انگوٹھی کس کے لیے لایا تھا تو اس کے قاتل تک پہنچنے میں آسانی ہو جائے گی۔“

نذر علی نے کہا ”تھانے دار صاحب یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی نے اس کی جیب میں وہ انگوٹھی والی خالی ڈبیا رکھ دی ہو۔“

”میں نے اس امکان پر بھی غور کیا ہے۔“ میں نے کہا ”لیکن اس کی جیب سے برآمد ہونے والی انگوٹھی کی رسید ظاہر کرتی ہے کہ انگوٹھی وہی خرید کر لایا تھا۔“

خالدہ پروین نے کہا ”مجھے تو لگتا ہے کسی نے عارف کے خلاف سازش کی ہے۔“

”ایسی سازش کون کر سکتا ہے؟“

”یہ تو مجھے نہیں معلوم۔“ خالدہ پروین نے کہا ”میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ عارف کے ساتھ لڑکیوں والا کوئی چکر نہیں تھا۔ کسی لڑکی کو سونے کی انگوٹھی دینا تو بہت دور کی بات ہے وہ تو لڑکیوں سے بات کرتے ہوئے گھبرا تا تھا۔“

نذر علی نے کہا ”تھانے دار صاحب میرا بھائی بہت شرمیلا تھا۔“

میں نے کہا ”میں اپنے طور پر اس انگوٹھی والے معاملے کی پوری چھان بین کروں گا۔ اگر

ضرورت پڑی تو کسی کو بھیج کر اس دکان سے بھی تصدیق کروں گا جہاں سے یہ خریدی گئی تھی۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے خالدہ پروین سے پوچھا ”خالدہ بی بی! تم نے اپنے دیور کو کوئی رومال دیا تھا؟“

”کیسا رومال جی؟“

”ریشمی رومال۔“ میں نے کہا ”ہاتھ کی کڑھائی والا؟“

اس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے جیب سے وہ رومال نکال کر خالدہ پروین کی جانب بڑھا دیا جو مقتول کی جامہ تلاشی سے ملا تھا۔ میں نے پوچھا ”اس رومال کو پہچانتی ہو؟“

وہ الٹ پلٹ کر رومال کو دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ رومال اس نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ رومال کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد اس نے پوچھا ”کیا یہ رومال بھی آپ کو عارف علی کے پاس سے ملا ہے؟“

”ہاں“ یہ رومال اس کی جیب میں موجود تھا۔“ میں نے کہا ”اور اس قسم کے رومال بازار میں فروخت نہیں ہوتے بلکہ اپنے ہاتھ سے کاڑھ کے تھپے میں دیے جاتے ہیں۔ اتنا اندازہ تو تمہیں بھی ہوگا؟“

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی ”یہ رومال میں نے تو اسے دیا نہیں تھا پھر کس نے دیا ہوگا!“

میں نے کہا ”مجھے تو یہ سارا عشق کا معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح کے تھپے تحائف کا تبادلہ بے معنی نہیں ہو سکتا۔ بہر حال بہت جلد میں معاملے کی تک پہنچ جاؤں گا۔“

نذر علی نے پوچھا ”تھانے دار صاحب میرے بھائی کا قاتل گرفتار ہو جائے گا؟“

”انشاء اللہ قاتل ضرور گرفتار ہوگا۔“ میں نے یقین سے کہا پھر نذر علی سے پوچھا ”نذر علی تمہارے گھر میں کوئی لاشی وغیرہ تو ہوگی؟“

یہ سوال میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا تھا۔ نذر علی نے میرے سوال پر چونک کر مجھے دیکھا اور کہا ”لاشی کا کیا کریں گے آپ؟“

”تم میرے سوال کا جواب دو۔“ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

”جی..... جی۔“ وہ انک انک کر بولا ”دو تین لاشیاں ہیں گھر میں رکھی ہوئی۔“

”وہ لاشیاں مجھے لا کر دکھاؤ۔“

وہ ہنسنایا ”کہیں آپ مجھ پر شک تو نہیں کر رہے!“

”میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں نذر علی کہ تم پر شک کیا جاسکتا ہے۔“ میں اسے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے بولا ”میرے شک کو دور کرنے کے لیے مجھ سے تعاون کرو۔ میں جو کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرو اور خواہ مخواہ سوالات نہ کرو۔“

”اچھا جی۔“ وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا ”میں ابھی لائیشیاں لے کر آتا ہوں۔“

وہ اٹھ کر گھر کے اندرونی حصے میں چلا گیا تو میں نے خالدہ بی بی سے کہا ”خالدہ بی بی! میں تو اپنے در پر تفتیش کر رہی رہا ہوں۔ تمہیں بھی اس سلسلے میں میری مدد کرنا ہوگی۔“

”میں بھلا کیا کر سکتی ہوں جی۔“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا ”یہ گاؤں زیادہ بڑا نہیں ہے پھر یہاں ہر ایک شخص دوسرے کو جانتا ہے خاص طور پر عورتیں تو ایک ایک گھر کی خبر لیتی ہیں۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تمہارے دیور نے کسی لڑکی سے محبت کا معاملہ چلا رکھا تھا۔ تم ذرا کوشش کرو تو اس لڑکی کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتی ہو۔ تمہارے لیے زیادہ مشق نہیں ہوگا۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ گزشتہ رات اسی مفروضہ لڑکی سے ملاقات کرنے گھر سے نکلا ہوگا۔ اگر لڑکی کا پتا چل جائے تو قتل کی اس واردات کے پوشیدہ گوشے وا ہو سکتے ہیں۔“

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی ”میں پوری کوشش کروں گی جی۔“

اسی دوران میں نذر علی تین عدد لائیشیاں لے کر بیٹھک میں داخل ہوا۔ عمران لائیشیوں کو میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا ”لیں جناب! میرے گھر میں یہی تین لائیشیاں ہیں۔“

ایک کائیشیل نے آگے بڑھ کر وہ لائیشیاں تھام لیں۔ میں نے مذکورہ کائیشیل سے کہا ”لائشی لے کر اس کا بغور معائنہ کیا۔ وہ اچھی خاصی مضبوط لائشی تھی۔ اس کے ایک سرے پر تم چڑھا ہوا تھا۔ میں نے لائشی کے دونوں سروں کا تفصیلی جائزہ لیا۔ لائشی کے کسی بھی سرے پر کوئی نشان وغیرہ نہیں تھا اور نہ ہی کوئی انسانی بال سم ٹیر۔ چھنسا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے باری باری تینوں لائیشیاں دیکھ ڈالیں۔ مجھے ایسا کوئی سراغ نہ ملا جس سے ظاہر ہوتا کہ ان میں سے کسی لائشی سے عارف علی کے سر کو نشانہ بنایا گیا ہوگا۔ تاہم مجھے یقین تھا کہ عارف علی کے سر پر کسی ایسی ہی مضبوط لائشی سے داریے گئے ہوں گے۔“

میں نے نذر علی سے سوال کیا ”ان کے علاوہ بھی تمہارے گھر میں کوئی لائشی ہے؟“

”نہیں جناب! جو تھیں میں نے وہ آپ کو دکھا دی ہیں۔“ نذر علی نے جواب دیا ”اگر آپ کو

میری بات کا یقین نہ ہو تو آپ میرے گھر کی تلاشی بھی لے سکتے ہیں۔“

”ضرورت پڑی تو تلاشی بھی لے لوں گا۔“

میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ نذر علی یا اس کی بیوی سے مزید کام کی کوئی بات معلوم نہیں ہو سکتی تھی اس لیے چند سوالات کے بعد میں وہاں سے واپس تھانے آ گیا۔

وہ پورا دن تھانے میں بہت مصروفیت رہی۔ میں نے سوچا تھا کہ شام کو گرد اور ارشاد حسین سے ملنے جاؤں گا لیکن مجھے ایک لمحے کی فرصت نہ مل سکی لہذا اگر داور سے ملاقات کو میں نے دوسرے روز تک ملتوی کر دیا۔

دوسرے روز پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آ گئی۔ میری توقع کے عین مطابق عارف علی کی موت کا سبب سر کے عقبی حصے میں لگنے والی چوٹ تھی۔ رپورٹ میں موت کا وقت رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان بتایا گیا تھا۔ میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کو دو تین مرتبہ پڑھنے کے بعد اپنے پاس محفوظ کر لیا اور اے ایس آئی نزاکت علی کے ساتھ گرد اور ارشاد حسین کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

گرد اور ارشاد حسین کا دو منزلہ پکا گھر جو ہد رنی شہادت علی کی حویلی کے قریب ہی تھا۔ دروازے پر پہنچ کر اے ایس آئی نے دستک دی۔ اس وقت ہم دونوں سرکاری وردی میں تھے۔

دستک کے جواب میں ایک ادھیڑ عمر عورت نے دروازہ کھولا۔ وہ شکل و صورت سے ملازمہ دکھائی دیتی تھی۔ ہماری وردیوں پر نظر پڑتے ہی وہ خوف زدہ نظر آنے لگی تاہم دروازہ بند کرنے کے بجائے اس نے سوال کیا۔

”جی آپ کس سے ملنے آئے ہیں؟“

اے ایس آئی نے پوچھا ”گرد اور صاحب گھر پر ہیں؟“

”نہیں جی، گلد اور (گرد اور) صاحب تو کئی دن سے لائل پور (موجودہ فیصل آباد) گئے ہوئے ہیں۔“ اس عورت نے جواب دیا۔

اسی وقت مجھے دروازے کے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ پھر نوانی آواز میں پوچھا ”گیا

”ساجدہ دروازے پر کون ہے؟“

ساجدہ نامی اس عورت نے جواب دیا ”بی بی جی باہر پولیس آئی ہے۔ گلد اور صاحب کا پوچھ

رہے ہیں۔“

”میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔“ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے اپنا تعارف کروایا

”میں گرد اور صاحب سے ملاقات کرنے آیا ہوں۔“

دروازے کی اوٹ سے جواب آیا ”میں ارشاد حسین کی بیوی ہوں۔ وہ لائل پور گئے ہوئے ہیں۔ آپ کس سلسلے میں ان سے ملنا چاہتے ہیں؟“

”میں اس علاقے کا تھانے دار ہوں۔“ میں نے کہا ”ایک قتل کے بارے میں ان سے تھوڑی پوچھ بچھ کرنا تھی۔ وہ لائل پور سے کب واپس آئیں گے؟“

”ہو سکتا ہے آج ہی آجائیں۔“ گرد اور کی بیوی نے کہا ”کوئی خطرے والی بات تو نہیں ہے نا؟“

میں نے کہا ”آپ کو پتا ہوگا کل آپ کے کھیتوں میں سے ایک لاش ملی تھی۔ میں اسی سلسلے میں گرد اور صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”آپ عارف علی کی لاش کا ذکر کر رہے ہیں؟“

”جی ہاں آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا۔“

”اس عارف کی وجہ سے نہ جانے اور کون کون سی مصیبت آئے گی۔“ وہ بڑبڑانے والے انداز میں بولی۔

میرے ذہن میں خطرے کی کھنٹی بج اٹھی۔ میں نے جلدی سے پوچھا ”عارف کی وجہ سے آپ پر کون سی مصیبت نازل ہوئی ہے؟“

وہ دلکشت زدہ لہجے میں بولی ”جی..... کچھ نہیں..... میں پریشانی میں خدا جانے کیا کہہ گئی ہوں۔ بس کوئی خاص بات نہیں ہے۔“

میں نے پوچھا ”ایسی کیا پریشانی ہے؟“

گرد اور کی بیوی کے بجائے ملازمہ ساجدہ نے جواب دیا ”تھانے دار صاحب چوہلی بی بی جی سخت بیمار ہیں۔ بڑی بی بی جی اسی لیے پریشان ہیں۔“

”اوہ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو تکلیف دی۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا ”میں پھر کسی وقت گرد اور صاحب سے ملنے آ جاؤں گا۔“

واپسی پر میرے ذہن میں مختلف خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ گرد اور کی بیوی نے بتایا تھا کہ عارف علی کی وجہ سے ان پر کوئی مصیبت آ گئی تھی۔ میرے استفسار پر اس نے ٹال مٹول سے کام لیا تھا۔ مجھے صاف محسوس ہو گیا تھا کہ وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ملازمہ ساجدہ نے اپنی مالکن کی

پریشانی کا سبب چھوٹی بی بی کی بیماری بتایا تھا۔ ساجدہ نے یہ بھی بتایا تھا کہ گرد اور صاحب کئی دن سے لائل پور گئے ہوئے تھے۔ چھوٹی بی بی سے ساجدہ کی مراد گرد اور کی بیٹی ہی ہو سکتی تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر گرد اور کی بیٹی سخت بیمار تھی تو گرد اور صاحب کئی روز سے لائل پور میں کیا کر رہے تھے۔ کہیں وہ بیٹی کے علاج کے سلسلے ہی میں تو نہیں گئے ہوئے تھے؟ گرد اور کی گاؤں میں غیر موجودگی سے یہ بھی ثابت ہوتا تھا کہ وہ عارف علی کے قتل سے آگاہ نہیں ہوگا۔

اچانک اے ایس آئی کی آواز نے مجھے چونکا دیا ”ملک صاحب! کیوں نہ چوہدری صاحب کی حویلی کا ایک چکر لگالیں۔“

”وہاں کیا ہے بھئی؟“

”ہو سکتا ہے گرد اور صاحب کا کچھ پتا چل جائے!“

”گرد اور کا چوہدری کی حویلی سے کیا تعلق؟“

”جناب آپ تو جانتے ہی ہیں چوہدریوں کا پٹوار یوں اور قانون گوؤں سے کیا تعلق ہوتا ہے۔“ اے ایس آئی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ پھر بولا ”لیکن ارشاد حسین اور چوہدری شہادت علی کے درمیان ایک رشتہ بھی قائم ہونے والا ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں چلتے چلتے رک گیا۔

اے ایس آئی نے کہا ”جناب میں نے سنا ہے کہ چوہدری شہادت علی اپنے بیٹے چوہدری عشرت کا رشتہ گرد اور کی بیٹی سے کرنا چاہتا ہے۔“

”اچھا!“ اے ایس آئی کے انکشاف نے مجھے واقعی حیران کر دیا تھا۔ میں نے پوچھا ”زرا کت علی تمہیں یہ بات کس نے بتائی ہے؟“

”میری گھر والی نے جناب۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا ”آپ تو جانتے ہی ہیں کہ عورتیں ایسے معاملات کی ٹوہ میں رہتی ہیں۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ”لیکن اس دنیا میں خالدہ پروین جیسی عورتیں بھی موجود ہیں جنہیں یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ ان کے دیور کن سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔“

”تو پھر چلیں چوہدری صاحب کی طرف؟“

میں نے اے ایس آئی کے ساتھ چوہدری کی حویلی کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے پوچھا ”گرد اور ارشاد حسین کی کتنی اولادیں ہیں؟“

خاطر مدارت کے دوران میں ہمارے درمیان گفتگو بھی ہوتی رہی۔

چوہدری شہادت علی نے ہمارا یرتیاک استقبال کیا۔ وہ ہمیں اپنی جوہلی کی شان دار اور وسیع

”ملک صاحب آپ کو یہ بات تو معلوم ہوگی کہ میں اپنے بیٹے چوہدری عشرت کا رشتہ ارشاد حسین کی بیٹی سلمیٰ سے کرنا چاہتا ہوں۔“

میں نے کہا ”ہاں میں نے کچھ ایسا سنا تو تھا شاید۔“

وہ بولا ”ملک صاحب! آپ تو ہمارے گھر کے افراد کی طرح ہیں۔ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور مناسب الفاظ کی تلاش میں سوچ کے گھوڑے دوڑانے لگا۔“

میں نے کہا ”چوہدری صاحب! آپ بالکل بے فکر ہیں۔ آپ مجھے ہر مرحلے پر ہم درد اور غم گسار پائیں گے۔“

اس نے ممنون نظر سے مجھ سے دیکھا میں نے اضافہ کیا ”آپ مجھ پر اعتماد کریں اور ارشاد حسین کی بیٹی کی بیماری کے بارے میں کھل کر بتائیں۔“

”بات دراصل یہ ہے ملک صاحب۔“ وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں گویا ہوا ”سلمیٰ نے کل رات خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔“

”کیا؟“ مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔

”چوہدری سنبھل کر بیٹھ گیا۔ میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ چند لمبے خاموش رہنے کے بعد تفصیل بتانے لگا ”سلمیٰ نے کل شام کے وقت ڈی۔ڈی۔ٹی (کیزے مارڈوا) پی کر اپنی جان لینے کی کوشش کی تھی۔“

میں نے سوال کیا ”اس نے ایسا کیوں کیا چوہدری صاحب؟“

”ابھی تک اس کے اس فعل کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی ہے۔“ چوہدری شہادت علی نے خلا میں گھورتے ہوئے جواب دیا ”سلمیٰ آخری اطلاع آنے تک اسپتال میں بے ہوش تھی۔ ڈاکٹروں نے اس کے معدے کو صاف تو کر دیا ہے لیکن اس کی حالت ابھی خطرے سے باہر نہیں ہے۔ زہریلی دوا نے اس کے اعضائے ریبر کو خاصا متاثر کیا ہے۔“

”اوہ!“ میں نے تشویش ناک انداز میں کہا اور خاموش ہو گیا۔

چوہدری گنیمیر لہجے میں بولا ”میں کل ارشاد حسین کے ساتھ ہی اسپتال گیا تھا۔ میں واپس آ گیا۔ وہ ابھی تک وہیں ہے۔ اگر سلمیٰ کی طرف سے کوئی تسلی بخش اطلاع ملی تو وہ ہمیں خبر کرے گا پھر ممکن ہے مجھے دوبارہ جانا پڑے۔ ہو سکتا ہے ارشاد حسین کی بیوی بھی جائے اور ہماری حویلی سے بھی کچھ خواتین کو جانا پڑے گا۔“

چوہدری شہادت علی نے جب ہماری آمد کی غرض دعایت دریافت کی تو میں پہنچے کہا۔
”چوہدری صاحب! دراصل ہم عارف علی کے قتل کے کیس کے سلسلے میں گرد اور ارشاد حسین سے ملنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان کے گھر سے پتا چلا ہے کہ وہ کئی دن سے لائل پور گئے ہوئے ہیں چنانچہ ہم آپ کی طرف آئے۔ سوچا ممکن ہے آپ ہی کچھ ہماری راہ نمائی کریں گے۔“
چوہدری نے پوری بات سننے کے بعد پوچھا ”آپ کو یہ کس نے بتایا کہ ارشاد حسین کئی روز سے لائل پور گئے ہوئے ہیں؟“

میں نے جواب دیا ”اس کی ملازمہ ساجدہ ہے۔“

”اچھا۔“ چوہدری نے حیرت کا اظہار کیا ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس نے یہ جھوٹ کیوں بولا ہے۔“

”تو کیا ارشاد حسین لائل پور نہیں گیا ہوا؟“ میں نے پوچھا ”اس کی بیوی نے تو یہ بھی کہا تھا کہ وہ ممکن ہے آج واپس آ جائے۔“

چوہدری بولا ”ارشاد حسین لائل پور تو گیا ہوا ہے لیکن کئی روز سے نہیں بلکہ کل رات سے اور یہ بات بھی درست ہے کہ وہ آج رات واپس آ جائے گا۔ اپنی بات ختم کر کے چوہدری کچھ افسردہ نظر آنے لگا۔“

میں نے پوچھا ”کیا بات ہے چوہدری صاحب! آپ پریشان نظر آ رہے ہیں؟“

وہ ایک طویل سانس چھوڑتے ہوئے بولا ”ہاں ملک صاحب! بات تو واقعی پریشانی کی ہے۔“

میں نے کہا ”مجھے گرد اور صاحب کے گھر سے پتا چلا کہ ان کی بیٹی سخت بیمار ہے؟“

”چوہدری خاصی دیر خاموش رہ کر کچھ سوچتا رہا پھر بولا ”آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔ سلمیٰ کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہے اور ارشاد حسین اسی سلسلے میں لائل پور گیا ہوا ہے۔ سلمیٰ وہاں اسپتال میں داخل ہے۔ میں بھی وہاں سے ہو کر آیا ہوں۔“

میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا ”مجھے سلمیٰ کی بیماری کا سن کر بہت دکھ ہوا ہے چوہدری صاحب۔“

بیٹی (سلمیٰ) کی بیماری کی نوعیت کیا ہے؟“

چوہدری نے جواب دینے سے پہلے مجھے ایسی نظر سے دیکھا جیسے وہ اس بات کا فیصلہ کر رہا ہوں کہ مجھے اصل بات سے آگاہ کرنا چاہیے یا نہیں۔ چند لمبے تذبذب کا شکار رہنے کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔

میں نے کہا ”چوہدری صاحب! میں تو قتل کی تفتیش کے سلسلے میں ادھر آ نکلا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کسی حادثے سے گزر چکے ہیں۔ اگر میری آمد سے.....“

اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے مزید بولنے سے روک دیا پھر خود بولا ”مجھے خوشی ہے کہ آپ اپنے فرائض کے سلسلے میں اس قدر فعال ہیں۔ مجھے خود بھی عارف علی کی موت کا افسوس ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا اس کا قاتل کون ہو سکتا ہے؟“

میں نے کہا ”آپ کو پتا چل گیا ہوگا کہ اس کی لاش گئے کے جن کھیتوں سے ملی ہے وہ زمین ارشاد حسین کی ملکیت ہے۔ میرا خیال تھا ممکن ہے اس عقدے کو حل کرنے کے لیے ارشاد حسین ہماری کچھ مدد کرنا لیکن وہ بے چارہ تو خود ایک ناگہانی مصیبت میں گرفتار ہے۔“

”آپ نے بالکل بجا فرمایا ملک صاحب۔“ چوہدری میری تائید کرتے ہوئے بولا ”صرف ارشاد حسین ہی کیا، ہم سب اس وقت پریشانی میں گھرے ہوئے ہیں۔ اب ایک حوالے سے ہم رشتے دار بنی ہوئے نا“

اس وقت اچانک میرے ذہن میں گرد اور ارشاد حسین کی بیوی کے الفاظ پھر تازہ ہو گئے۔ میں نے چوہدری سے اس کا تذکرہ کرنا ضروری اور مناسب نہ سمجھا لیکن خود سوچنے لگا۔ گرد اور ارشاد حسین کی بیوی کا کہنا تھا کہ عارف علی کی وجہ ان پر کوئی مصیبت آئی پڑی تھی اور انی الوقت ان کے لیے سب سے بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ ان کی بیٹی نے ڈی ڈی ٹی پٹی کر خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔ کوئی بھی شخص..... خواہ مخواہ اپنی جان نہیں لینا چاہتا۔ خودکشی کرنے والا جب ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے۔ اسے زیت کرنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا یا اسے زندگی بے مصرف دکھائی دینے لگتی ہے تو وہ انتہائی قنوطیت کے عالم میں اپنی جان لینے کے بارے میں سوچتا ہے۔ میرے ذہن میں اس وقت ایک فلم سی چل رہی تھی اور مختلف خیالات یلغار کر رہے تھے۔ عارف حسین کو بڑی بے دردی سے کیوں قتل کیا گیا؟

سلسلی نے زہریلی دوا پی کر اپنی جان لینے کی کوشش کیوں کی؟ جس طرح ابھی تک میں اتر ہیرے میں تھا کہ عارف علی کا بہمانہ قتل کیوں ہوا اسی طرح سلسلی کے لواحقین اور چوہدری شہادت وغیرہ بھی لاعلم تھے کہ سلسلی نے خودکشی کی کوشش کیوں کی۔ میرے ذہن میں بار بار یہ سوال ابھر رہا تھا کہ آیا سلسلی اور عارف علی کے معاملے میں کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ عارف علی کے قتل کی تفتیش کے سلسلے میں ابھی تک جو معلومات مجھے حاصل ہوئی تھیں ان کی کچھ کڑیاں اگر سلسلی سے ملا دی جاتیں تو بات بنتی ہوئی نظر آتی تھی۔ ایسا ہو سکتا تھا کہ وہ سلسلی ہی ہو جو عارف علی کے گاؤں میں مستقل قیام کا سبب بن رہی تھی اور

عارف علی کی دردناک موت کے بعد اسے اپنی زندگی کا کوئی مقصد نظر نہ آیا ہو چنانچہ اس نے خودکشی کے راستے نجات پانے کی کوشش کی۔

ابھی بہت سی باتیں جواب طلب تھیں اس لیے میں حتمی طور پر کوئی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ تاہم میں نے ان سارے امکانات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اسی وقت یہ سوچ لیا تھا کہ اب پہلی فرصت میں مجھے سلسلی سے ملنے لاکل پور کے اسپتال جانا ہوگا۔

میں کافی دیر سے خیالات کی نگری میں بھٹک رہا تھا کہ چوہدری شہادت علی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہا تھا ”ملک صاحب! آپ کہاں پہنچ گئے جناب؟“

میں نے کہا ”چوہدری صاحب! عارف علی قتل کیس کی کچھ کڑیاں گم شدہ ہیں۔ انہیں ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”کیا آپ نے اس سلسلے میں کچھ گرفتاریاں بھی کی ہیں؟“

”نہیں جناب۔“ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا ”میں ان تھانے داروں میں سے نہیں ہوں جو اپنی شان دکھانے اور رعب جمانے کے لیے خواہ مخواہ غیر مشتبہ افراد کو گرفتار کر کے حوالات کا پیٹ بھرتے ہیں۔ ابھی تک بہت سی باتیں مجھے الجھا رہی ہیں پھر مقتول کے لواحقین نے کسی شخص پر اپنے شک کا اظہار بھی نہیں کیا۔ میں نے جن افراد کا بیان لیا ہے وہ بھی مقتول کے بارے میں مثبت رائے رکھتے ہیں۔ آج تک کسی سے اس کا بھگڑا وغیرہ بھی سننے میں نہیں آیا اس لیے میں خود بھی ایسے صلح جو اور امن پسند شخص کے قتل پر حیران ہوں۔“

چوہدری شہادت علی نے کہا ”ملک صاحب! آپ نے عارف علی کی تعریف میں جو کچھ سنا ہے وہ بالکل درست ہے۔ وہ واقعی اس قابل تھا کہ اس کی تعریف کی جائے۔ میں خود بھی اس کا معترف تھا۔“

”اور ایسا بندہ اچانک قتل ہو جائے تو گرفتاریاں کرنے کے لیے بہت کچھ سوچنا سمجھنا پڑتا ہے چوہدری صاحب۔“

”ہاں یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ چوہدری نے اثبات میں سر ہلایا پھر بولا ”میں اگر سلسلی کے سلسلے میں پریشان نہ ہوتا تو آپ کے پاس تھا نہ ضرور آتا۔ میں خود بھی یہی چاہتا ہوں کہ عارف علی کا قاتل جلد از جلد گرفتار ہو جائے۔ آپ کو اس سلسلے میں جب بھی میری مدد کی ضرورت پڑے میں حاضر ہوں۔“

”یہ تو آپ کی محبت ہے چوہدری صاحب۔“ میں نے تشکر آمیز لہجہ میں کہا ”ورنہ چوہدری حضرات تو عام طور پر میری تفتیش کے راستے میں روڑے اٹکانے کی کوشش ہی کرتے رہے ہیں۔“

”پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں ملک صاحب!“

میں نے کہا ”آپ کا کہنا درست لیکن اگر انگوٹھا ساتھ دینے پر تیار ہو جائے تو وہ برابر ہو جاتی ہیں۔“

”واہ واہ! کیا دانش مندی کی بات کی ہے آپ نے ملک صاحب۔“ چوہدری نے سر اٹھائے اور انداز میں کہا پھر بولا ”میں تو اس موقع پر بس اتنا ہی کہوں گا کہ اللہ بڑے وقت سے بچائے۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔ یہ اللہ کی بنائی ہوئی ایسی مخلوق ہے جو کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتی ہے۔“

میں نے بے ساختہ کہا ”اور یہی مخلوق عارف علی جیسے ہر دل عزیز انسان کے خون میں ہاتھ رنگنے سے بھی نہیں چمکتی۔ انسان واقعی بہت پیچیدہ مشین کا نام ہے۔“

چوہدری نے ٹھوڑی دیر کے بعد پوچھا ”ملک صاحب! ابھی تک آپ کی تفتیش اور پوچھ گچھ سے قاتل کے بارے میں کوئی چھوٹا سا سراغ بھی ملا ہے یا نہیں؟“

”آپ اسے سراغ تو نہیں دے سکتے چوہدری صاحب۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ”البتہ ابھی تک میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس قاتل کے خراکات میں عورت کی ذات ضرور ملوث ہے۔“

”یہ بھی عجیب بات کہی ہے آپ نے۔“ چوہدری نے کہا ”جب کہ میری معلومات کے مطابق مقتول عارف علی اس لائن کا آدمی نہیں تھا۔“

میں نے چوہدری کی بات پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے کہا ”ویسے مقتول کا بڑا بھائی بھی میری نظر میں شک سے بری نہیں ہے۔“

”نذر علی تو بڑا بی باک و بے رحم ہے ملک صاحب۔“

”وہ بی باک و بے رحم تو ضرور ہے چوہدری صاحب۔“ میں نے چوہدری کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا ”لیکن بعض اوقات بی بے بندے بھی ایسا ہند رکھا جاتے ہیں کہ کوئی ایسی بات کی توقع بھی نہیں کر سکتا۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا ”زن‘ زور اور زین‘ انسانی تاریخ میں کیا کیا گل کھلاتی رہی ہیں یہ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہوں گے؟“

”زن..... زن..... زن۔“ چوہدری نے پُر سوچ انداز میں تینوں الفاظ تھوڑے وقفے سے دہرائے پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”دونوں بھائیوں کے درمیان کوئی زن تو وجہ نزاع ہوئی نہیں

سکتی۔ کیا آپ زور اور زین کے بارے میں سوچ رہے ہیں ملک صاحب؟“

”آپ کا اندازہ درست ہے چوہدری صاحب۔“ میں نے کہا ”میں خاص طور پر زین کے بارے میں سوچ رہا ہوں اور زور تو زین کے ساتھ مشروط ہے۔“

”ہوں۔“ اتنا کہہ کر چوہدری کسی گہری سوچ میں دوں گیا۔

میں نے کہا ”چوہدری صاحب! مجھے پتا چلا کہ مقتول نے مستقل گاؤں میں رہنے کا فاصلہ کر لیا تھا اور وہ اب پوری توجہ سے کھیتی باڑی کرنا چاہتا تھا۔“

”ہاں! ایسا میں نے بھی سنا تھا۔“ چوہدری نے سر کو اٹھائی جنبش دی ”جب کہ پہلے اس کا خیال تھا کہ وہ شہر میں کوئی کاروبار کرے گا۔ میں نے اس کے آخری فیصلے کو سراہا تھا۔ جو عزت اور مزہ زین داری میں ہے وہ بھلا شہر کے کاروبار میں کہاں لیکن تعلیم یافتہ نسل عام طور پر یا تو سرکاری نوکری ڈھونڈتی ہے یا پھر اسے کاروبار کی جوہتی ہے۔“

”ہاں! یہ تو ہے۔“ میں نے کہا ”ویسے میرے خیال میں اگر کسی اچھے اور اونچے عہدے کی سرکاری نوکری مل جائے تو اس کا بھی اپنا ہی مزہ ہے۔“

”بس جی! یہ تو اپنی اپنی پسند اور شوق کی بات ہے۔“

مجھے محسوس ہوا کہ چوہدری شہادت علی‘ عارف علی کے قاتل کے بارے میں مجھے مفید معلومات فراہم نہیں کر سکتا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا ”اچھا چوہدری صاحب! اب ہمیں تو اجازت دیں۔“

”جناب! اتنی جلدی بھی کیا ہے۔“ چوہدری بھی اٹھ گیا۔

”اب دوپہر کا کھانا تو کھا کر ہی جائیں۔“

میں نے کہا ”ابھی تو تھانے میں بہت کام ہے۔ عارف علی کا قاتل گرفتار ہو جائے پھر آپ سے کھانا بھی کھائیں گے اور سکون سے بیٹھ کر بات چیت بھی ہوگی۔“

”تو آپ کی دعوت مجھ پر ادھار رہی ملک صاحب۔“ چوہدری شہادت علی نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ہم تھانے پہنچے تو دیوار گیر کلاک ساڑھے بارہ کا وقت بتا رہا تھا۔

اگلے روز میں صبح ہی صبح لاکل پور کے لیے روانہ ہو گیا۔ میں نے کل چوہدری شہادت علی کو یہ بات نہیں بتائی تھی کہ میں سلمیٰ کو دیکھنے اسپتال جاؤں گا۔ سلمیٰ نے خود کشی کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کا یہ فیصل قابل دخل اندازی پولیس تھا تاہم میں نے پریشان چوہدری کو مزید پریشان کرنا مناسب نہیں

سمجھا تھا۔ میں دراصل ان خدشات کی تصدیق چاہتا تھا جو میرے دل میں سکنی کے حوالے سے پیدا ہو چکے تھے۔ اس وقت میں سادہ لباس میں تھا اور خالد احمد خان میرے ساتھ تھا۔

ہسپتال کے احاطے ہی میں گرد اور ارشاد حسین سے ملاقات ہو گئی۔ جمعہ خان اسے پہچانتا تھا۔ ہم دونوں اس کے پاس چلے گئے۔ میں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

”مجھے ملک صفدر حیات کہتے ہیں۔ میں آپ کے علاقے کا نیا تھا نے دار ہوں۔“

ارشاد حسین کی حالت سے انداز ہوتا تھا کہ گزشتہ ایک دو راتیں اس نے جاگ کر گزاری ہوں گی۔ وہ آگ بھگ پچاس سال کا ایک دراز قامت شخص تھا۔ اس کی کانٹھی اور صحت قابل رشک تھی لیکن حالیہ واقعے نے اسے پڑمردہ کر رکھا تھا۔

اس نے سرسری انداز میں مجھ سے مصافحہ کیا ”بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر“ پھر وہ چاروں طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے بولا ”آپ سے ملاقات ایسے وقت میں ہو رہی ہے کہ میں آپ کی کوئی خاطر مدارات بھی نہیں کر سکتا۔“

”مجھے آپ کی پریشانی کا اندازہ ہے قانون گو صاحب۔“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے کہا ”آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔ آپ کی صاحبزادی ٹھیک ہو جائے گی۔“

پھر ہم ایک بیچ پر بیٹھ گئے۔ وہ بے اختیار انداز میں بولا ”آپ کو کیسے بتا چلا کہ سلی نے.....“

”میں نے کہا تھا آپ فکر نہ کریں۔“ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بولنے سے روک دیا اور کہا ”اگرچہ یہ سیدہ سیدہ پولیس کیس ہے لیکن میں یہاں کسی تفتیش کے سلسلے میں نہیں آیا۔ آپ اطمینان رکھیں اور مجھے اپنا دوست سمجھیں۔“ میں نے اسے تسلی دی حالانکہ میں چاہتا تھا کہ اسے پورے اختیارات استعمال کرتے ہوئے اس سے سخت رویہ اپنا سکتا تھا لیکن میں نے ایک دھکی باب کو مزید رنجیدہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔

”گرد اور ارشاد حسین کی آنکھوں میں منویت جھلکنے لگی۔ میں نے مزید کہا ”قانون گو صاحب“

میں خاص طور پر سادہ لباس میں یہاں آیا تھا تاکہ آپ کو کسی ہنک کا احساس نہ ہو۔ مجھے نیک اور عزت دار لوگوں کی عزت کا بہت خیال رہتا ہے۔“

یہ ساری باتیں میں یوں بھی کر رہا تھا کہ اس کے ذہن کو تعاون کے لیے ہموار کر سکوں۔ اگر وہ

عدم تعاون کا اظہار کرتا تو میرے یہاں آنے کا مقصد فوت ہو جاتا۔ ارشاد حسین کے بارے میں مجھے اچھی رپورٹ ملی تھی اس لیے بھی میں اپنے دل میں اس کے لیے نیک خواہشات رکھتا تھا۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ کھوئے لہجے میں بولا ”میں نے تو کوشش کی تھی کہ گاؤں میں اس واقعہ کا کسی کو علم نہ ہو لیکن آپ تو خیر پولیس والے ہیں آپ سے بھلا کب تک یہ بات پوشیدہ رہ سکتی تھی۔“

میں نے کہا ”بس اسے ایک اتفاق ہی سمجھیں۔ میں عارف علی کے قتل کے سلسلے میں آپ سے ملنے آپ کے گھر گیا تھا تو پتا چلا کہ آپ لائل پور گئے ہوئے ہیں۔“

”کیا آپ کو میری بیوی نے یہ سب کچھ بتایا تھا؟“

”نہیں۔“ میں نے دونوں لہجے میں کہا۔

”پھر؟“ وہ سوالیہ نظروں سے مجھے نکلنے لگا۔

میں نے کہا ”آپ کے گھر سے تو بس اتنا ہی پتا چلا کہ آپ لائل پور گئے ہوئے ہیں۔ اس واقعے کے بارے میں مجھے چوہدری شہادت علی نے بتایا تھا۔“

”اوہ!“ وہ پریشان نظر سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”آپ کسی تشویش میں نہ پڑیں قانون گو صاحب۔“ میں نے تشفی آمیز لہجے میں کہا ”آپ کے گھر کا معاملہ سمجھیں میرے گھر کا معاملہ ہے۔“

وہ ایک مرتبہ پھر شکر گزار انداز میں میری جانب دیکھنے لگا۔ میں نے معتدل لہجے میں کہا ”ارشاد حسین صاحب بات دراصل یہ ہے کہ عارف علی کو جس کھیت میں قتل کیا گیا تھا وہ زمین آپ کی ملکیت ہے۔ اسی وجہ سے میں آپ سے ملنے آپ کے گھر گیا تھا لیکن آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔“ اس نے پوچھا ”یہاں بھی آپ عارف علی کے قتل کے سلسلے میں مجھ سے پوچھ گچھ کرنے آئے ہیں ملک صاحب؟“

”بالکل نہیں جناب۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”یہاں تو میں خاص طور پر آپ کی صاحبزادی کی خیریت معلوم کرنے آیا ہوں۔“

”آپ دوسرے تھے تھے داروں سے بہت مختلف ہیں۔“

میں نے کہا ”یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“

”مجھے ابھی تک اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا۔“ وہ پُر حیرت لہجے میں بولا ”بہر حال اپنی

سوچنے کی مہلت لی ہے۔

میں نے پوچھا ”آپ نے تو اب تک اچھی طرح سوچ سمجھ لیا ہوگا۔ چوہدری صاحب آپ کے دیکھے بھالے ہیں اور ان کا بیٹا بھی آپ کی نظروں کے سامنے ہے؟“

”ہم میاں بیوی نے تو آپس میں مشورہ کر لیا ہے۔“ قانون گو نے بتایا۔ ”اور ہم اس رشتے پر متفق ہیں۔“

”آپ نے سلمیٰ سے اس کی رائے بھی لے لی ہوگی؟“

”یہ ڈیوٹی میں نے اپنی بیوی کو سونپ رکھی تھی لیکن۔“

وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ میں نے کہا ”قانون گو صاحب! اگرچہ مجھے آپ کے گھریلو معاملات میں دخل دینے کا کوئی اختیار نہیں ہے لیکن اگر آپ کو ناگوار نہ گزرے تو ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں؟“

وہ سوالیہ نظر سے مجھ سے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا ”آپ کی صاحبزادی نے اس رشتے کے لیے ”ہاں“ کہہ دی تھی یا.....؟“

ایک لمحے کو وہ متذبذب نظر آیا پھر بولا ”اس نے نہ تو ”ہاں“ کہی تھی اور نہ ہی واضح طور پر اس رشتے سے انکار کیا تھا۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں!“

”سلمیٰ نے کہا تھا کہ وہ بھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔“

قانون گو نے میری بات کا جواب بھی دے دیا تھا اور اصل بات کو چھپا بھی گیا تھا۔ میں نے بھی اس سلسلے میں اسے زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے ان حالات و واقعات سے اپنے طور پر جو نتیجہ اخذ کیا تھا، وہ یہ تھا کہ سلمیٰ کی ماں نے جب اس سے چوہدری عشرت کے رشتے کی بات کی تھی تو اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ ماں باپ چونکہ راضی تھے اس لیے اپنی بیٹی کا فیصلہ کچھ زیادہ پسند نہیں آیا ہوگا تاہم لاڈلی ہونے کے سبب وہ اس پر کچھ دباؤ بھی نہیں ڈالنا چاہتے ہوں گے۔ قانون گو کی بیوی کا وہ جملہ کہ عارف علی کی وجہ سے اور کون کون سی مصیبت آئے گی بے معنی نہیں ہو سکتا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ سلمیٰ اور عارف علی کے درمیان کوئی کھچڑی پک رہی تھی جس کی ابھی تک انہوں نے کسی کو ہوا نہیں لگنے دی تھی۔ مائیں بیٹیوں سے زیادہ قریب ہوتی ہیں۔ عشرت کے رشتے سے انکار کے بعد ممکن ہے سلمیٰ کی ماں نے اسے بہلا پھسلا کر یہ بات معلوم کر لی ہو کہ وہ عارف علی سے شادی کا ارادہ رکھتی تھی۔

آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں اس لیے یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ واقعی پولیس کے ٹکے میں بھی اچھے لوگ نظر آ ہی جاتے ہیں۔“

میں نے کہا ”معاف کیجئے گا قانون گو صاحب۔ محکمہ مال بھی کچھ کم ”شہرت یافتہ“ نہیں ہے مگر آپ جیسے لوگ بھی تو اسی ٹکے میں موجود ہیں۔“

”یہ میں اپنی تعریف سمجھوں یا۔۔۔؟“

اس نے دانستہ جملہ ادھر اچھوڑ دیا اور زیر لب مسکرانے لگا۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ وہ مجھ سے خاصا بے تکلف ہو گیا تھا۔ میں چاہتا بھی یہی تھا کہ وہ مجھے اپنا ہمدرد اور مونس سمجھے۔

میں نے کہا ”میں نے تو آپ کی بات کا جواب دیا ہے۔ ویسے میں نے کسی شخص سے آپ کی برائی نہیں سنی۔“

اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میں نے پوچھا ”سلمیٰ کی طبیعت کیسی ہے؟“

وہ اچانک طول نظر آنے لگا۔ ”ابھی وہ خطرے سے باہر نہیں ہے ملک صاحب۔“ اس نے گلوگیر آواز میں بتایا ”آپ دعا کریں، سر پٹی بچ جائے۔ ہماری تو وہ اکلوتی اولاد ہے۔“

”اللہ مہربانی کرے گا۔“ میں نے کہا پھر پوچھا ”میں نے تو چوہدری شہادت علی سے سنا تھا کہ ڈاکٹروں نے سلمیٰ کا معدہ صاف کر دیا ہے؟“

”آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔“ وہ بولا ”لیکن ڈاکٹروں کا کہنا یہ ہے کہ زہریلی دوا کے اثرات بہت گہرائی تک پہنچ چکے ہیں جس کی وجہ سے سلمیٰ کا دماغ متاثر ہوا ہے۔ وہ ابھی پوری طرح ہوش میں نہیں آئی۔“

میں نے پوچھا ”ارشاد صاحب! خدا نخواستہ سلمیٰ کے ساتھ کوئی پریشانی تھی؟“

جواب دینے سے پہلے وہ ایک لمحے کو ہنسیکا پھر بولا ”نہیں ایسی تو کوئی خاص پریشانی نہیں تھی۔“

میں نے کہا ”یہ عریزی جذباتی ہوتی ہے۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں چھوٹی سی بات کہ بہت زیادہ محسوس کرتے ہیں اور بعض اوقات انتہائی قدم اٹھانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔“

”سلمیٰ بہت حساس ہے ملک صاحب۔“ ارشاد حسین نے بتایا پھر اکلوتی ہونے کے سبب وہ ہماری لاڈلی بھی ہے۔“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا ”اب آپ سے کیا چھپانا ملک صاحب! آج کل سلمیٰ کے رشتے کی بات چل رہی ہے۔ چوہدری شہادت علی اپنے بیٹے عشرت کے لیے سلمیٰ کا رشتہ مانگ رہے ہیں۔ ابھی تک کوئی بات طے تو نہیں ہوئی۔ ہم نے چوہدری صاحب سے

ظاہر ہے یہ بات دونوں میاں بیوی کو پسند نہیں آ سکتی تھی۔ عارف علی حیثیت اور خاندانی پس منظر کے حوالے سے قانون گو کا ہم پلا نہیں تھا۔ (گاؤں دیہات میں خاندانی پس منظر اور حیثیت و مرتبے کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے) یہ بھی ممکن ہے میاں بیوی نے بیٹی کو سمجھانے کی کوشش کی ہو اور اونچ نیچ کا فرق بتایا ہو۔ بہر حال یہ میرا قریں قیاس اندازہ تھا جو ازاں بعد غلط بھی ثابت ہو سکتا تھا لیکن موجودہ حالات میں اس سے زیادہ صحیح تجربہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

میں نے قانون گو سے پوچھا ”میں آپ کی بیٹی سلٹی کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو؟“

”نہیں نہیں! مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ وہ جلدی سے بولا ”آپ آئیں میرے ساتھ۔“ ایک لمحے کو راس نے کہا ”اے تھوڑی دیر پہلے تک تو وہ بے ہوش تھی۔ اب اللہ جانے۔“

میں نے جمعہ خان کو دہلیں رکھنے کا اشارہ کیا اور قانون گو ارشاد حسین کے ساتھ اسپتال کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔ جب ہم برآمدے میں سے گزر رہے تھے تو سامنے سے چوہدری شہادت علی آتے ہوئے نظر آیا۔ اس وقت اس کے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ ان میں ایک تو چوہدری شہادت علی کی بیوی تھی اور دوسری سلٹی کی والدہ۔ میں نے گذشتہ روز سلٹی کی والدہ سے اس کے گھر پر کچھ باتیں تو کی تھیں لیکن ہمارا سامنا نہیں ہوا تھا ورنہ میں اسے دیکھنے ہی پہچان جاتا۔ میں نے چوہدری شہادت علی سے مصافحہ کیا تو وہ بولا ”ملک صاحب! آپ یہاں۔ مجھے حیرت ہو رہی ہے!“

”آپ کو حیرت کیوں ہو رہی ہے چوہدری صاحب۔“ میں نے معتدل لہجے میں کہا ”کیا اس اسپتال میں میرے داخلے پر کوئی پابندی ہے؟“

وہ عداامت آمیز انداز میں بولا ”میرا یہ مطلب نہیں تھا جناب۔ کل آپ نے یہاں آنے کے بارے میں کوئی تذکرہ جو نہیں کیا تھا۔“

میں نے کہا ”بس آج صبح اچانک ہی پروگرام بن گیا تھا۔“ وہ میرے جواب سے مطمئن نظر نہیں آتا تھا ”تک آمیز لہجے میں بولا ”خیریت ہی سے آئے ہیں نا آپ؟“ بات ختم کر کے وہ سوالیہ انداز میں گرو اور ارشاد حسین کو دیکھنے لگا۔

ارشاد حسین اس کی نگاہ میں پوشیدہ سوال کو سمجھ گیا ”کھنکار بولا“ چوہدری صاحب پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ملک صاحب سلٹی کو دیکھنے آئے ہیں۔“

چوہدری مزید الجھ گیا۔ سلٹی کے ذکر سے وہ چونک اٹھا تھا۔ وہ تو یہی سمجھا ہو گا کہ میں سلٹی کا بیان لینے آیا ہوں گا۔ ارشاد حسین نے چوہدری کی پریشانی کو بھانپ لیا اور کہا ”چوہدری صاحب! آپ خواہ مخواہ کسی الجھن کا شکار نہ ہوں۔ میں نے ملک صاحب کو ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا ہے۔“

”اچھا! چوہدری نے نے اطمینان بھری سانس خارج کی۔“ چوہدری کا الجھنا اور پریشان ہونا بجا تھا، سلٹی مستقبل قریب میں اس کی بہو بننے والی تھی لیکن شادی کی بات طے ہونے سے پہلے ہی وہ خودکشی کی کوشش کر کے اسپتال پہنچ گئی تھی۔ ان گھریلو معاملات میں میرا زیادہ عمل دخل چوہدری کو تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔

چوہدری نے ارشاد حسین سے پوچھا ”سلٹی بیٹی اب کیسی ہے؟“

”کوئی خاص بہتری نہیں آئی۔“ ارشاد حسین کی بیوی صفیہ بیگم نے کہا ”یہاں کھڑے ہو کر باتیں کرنے سے بہتر ہے کہ ہم سلٹی کے پاس چلیں۔“

ہم سب باتیں کرتے ہوئے سلٹی کے کمرے میں پہنچ گئے۔ سلٹی اسپتال کے بستر پر چت لیٹی ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں اسے پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ وہ انیس بیس سال کی ایک خوب صورت لڑکی تھی لیکن اس وقت اس کی شکل مرجھائی ہوئی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ صدیوں سے بیمار ہو۔ خودکشی کی کوشش نے اسے موت کی ولایت پر لا کھڑا کیا تھا۔

اسی اثناء میں ڈاکٹر زراؤنڈ شروع ہو چکا تھا۔ جب ڈاکٹر سلٹی کے کمرے میں آیا تو صفیہ بیگم نے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ ڈاکٹر نے کسی بھی سوال کا جواب دینے سے پہلے سلٹی کا تفصیلی معائنہ کیا۔ سلٹی کے ایک بازو میں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے ڈرپ کی رفتار کو کم کیا اور نرس کو ضروری انجکشن لگانے کی ہدایات دے دیں۔ پھر وہ سلٹی کے لواحقین کی جانب متوجہ ہوا۔

اس نے ارشاد حسین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”ہم نے مریضہ کے جسم سے تمام زہریلا مواد نکال دیا ہے لیکن ڈی ڈی ٹی پاؤڈر نے اس کے دل و دماغ کو بُری طرح متاثر کر رکھا ہے۔ جراثیم کش دوا کے اثرات رفتہ رفتہ زائل ہوں گے۔“

”میری بچی کب تک ٹھیک ہو جائے گی؟“ صفیہ بیگم نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے کہا ”میں آپ کے سوال کا حتمی جواب نہیں دے سکتا۔ دراصل زہریلی دوا نے مریضہ کے دماغ کے نازک حصوں کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ہم اپنی سی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ ایک مرتبہ

یہ مکمل ہوش میں آجائے پھر ہی کوئی واضح صورت حال سامنے آئے گی۔“

چوہدری نے کہا ”ڈی ڈی ٹی پاؤڈر کا اثر تو معدے پر ہونا چاہیے تھا۔ آپ بتا رہے ہیں کہ اس کے دماغی حصے متاثر ہوئے ہیں۔ یہ کیا ماجرا ہے ڈاکٹر صاحب؟“

”جناب اگر آپ فوری طور پر مریضہ کو اسپتال لے آتے تو معاملہ اتنا نہ بگڑتا۔“ ڈاکٹر نے تحمل لہجے میں جواب دیا ”ایسی صورت میں ہم جلد از جلد معدے کو صاف کر دیتے اور اب تک مریضہ بھلی چنگم ہوتی لیکن تاخیر کے باعث زہر خون میں شامل ہو کر پورے بدن میں پھیل چکا ہے۔ دماغ جسم کا سب سے زیادہ نازک اور حساس حصہ ہوتا ہے اسی لیے وہ سب سے زیادہ متاثر بھی ہوا تھا۔ اگر چاہا مریضہ کے جسم سے تمام زہریلا مادہ نکالا جا چکا ہے لیکن اس کی تباہ کاری باقی ہے اور یہ کوئی معمولی تباہ کاری نہیں ہے۔“

ڈاکٹر مزید کچھ ور تک ارشاد حسین اور چوہدری شہادت علی کو تفصیلات بتاتا رہا پھر واپس چلا گیا۔ صفیہ بیگم نے ڈاکٹر کے جانے کے بعد ارشاد حسین سے کہا ”میں بہت پریشان ہوں۔ میرا خیال ہے سسلی کو لاہور کے بڑے اسپتال میں لے چلتے ہیں۔“

”ہمیں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے صفیہ۔“ ارشاد حسین نے مدبرانہ انداز میں کہا ”لاہور کے بڑے اسپتال والے بھی وہی علاج کریں گے جو یہاں ہو رہا ہے۔“

چوہدری شجاعت علی سے بھی مشورہ کیا گیا۔ وہ بھی مریضہ کو لاہور لے جانے کے حق میں نہیں تھا۔ اس نے مجھ سے استفسار کیا ”ملک صاحب! آپ کیا کہتے ہیں اس سلسلے میں؟“

میں نے کہا ”آخری فیصلہ تو آپ لوگ ہی کریں گے لیکن میرے خیال میں ارشاد صاحب نے خاصی معقول بات کی ہے۔“

”یعنی آپ یہاں کے علاج سے مطمئن ہیں؟“

”میں پہلے بھی ایسے کئی کیس دیکھ چکا ہوں۔“ میں نے کہا ”اگر فوری طور پر معدہ صاف کر دیا جائے تو خطرے کی بات نہیں رہتی۔ جہاں تک علاج سے مطمئن ہونے والی بات ہے تو اس سلسلے میں میں یہی کہوں گا کہ علاج تو ہو ہی رہا ہے۔ اس کے ساتھ آپ سب لوگ سسلی کی صحت یا بی کے لیے بھرپور دعا بھی کریں۔“

”میں تو رات بھر لٹے پر بیٹھی رہی ہوں۔“ صفیہ بیگم نے روہانے لہجے میں کہا ”اب اللہ میری سن ہی نہیں رہا تو میں کیا کر سکتی ہوں۔“

میں نے کہا ”صفیہ بیگم! اللہ سب کی سنتا ہے۔ یہ سوچنا کہ وہ ہم سے بے خبر ہے یا ہماری طرف توجہ نہیں دے رہا سراسر گناہ کی بات ہے۔ وہ وہی کچھ کرتا ہے جو ہمارے لیے زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اس سے کچھ مانگتے ہوئے اپنی کوتاہیوں اور نالائقیوں کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے۔“

ارشاد حسین نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا ”مجھے نہیں معلوم اور نہ ہی آپ لوگوں نے مجھے بتایا ہے کہ سسلی نے ڈی ڈی ٹی پاؤڈر پینا کیوں گوارا کیا۔ اگر آپ مجھے بتانا نہیں چاہتے تو میں زیادہ اصرار بھی نہیں کروں گا حالانکہ میں ایسا کر سکتا ہوں اور۔۔۔“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا ”چوہدری شہادت علی نے جلدی سے کہا ”اور کیا ملک صاحب؟“

میرے جواب دینے سے پہلے ہی سسلی کے وجود میں جنش پیدا ہوئی۔ شاید وہ ہلکا سا کراہی بھی تھی۔ ارشاد حسین اور صفیہ بیگم اس کی طرف لپک گئے۔ میں نے واضح طور پر دیکھا کہ سسلی اپنے ایک بازو کو ہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ وہ بازو نہیں تھا جس میں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔

صفیہ بیگم سسلی کے بستر کے قریب ایک بیچ پر بیٹھ گئی اور اس کے بازو کو ہاتھ میں لے کر سہلانے لگی۔ ارشاد حسین نے کہا ”شاید یہ ہوش میں آ رہی ہے۔“

چوہدری بولا ”میں ڈاکٹر کو بلا کر لاتا ہوں۔“

چوہدرائیں بھی صفیہ بیگم کے ساتھ ہی بیچ پر جا بیٹھی۔ میں ارشاد حسین کے برابر جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سسلی کے سر ہانے کھڑا اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھ رہا تھا ”بیٹی! آنکھیں کھولو۔ مجھے بتاؤ تم کیا محسوس کر رہی ہو؟“

سسلی دھیمی آواز میں ایک مرتبہ کراہی اور پھر پہلے کی طرح بے سدھ ہو گئی۔ ارشاد حسین نے مایوسی سے میری طرف دیکھا۔ صفیہ بیگم کے ہاتھ میں سسلی کا بازو تھا۔ اچانک میری نگاہ سسلی کے ہاتھ پر لگی اور میرے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔

اس ہاتھ میں مجھے ایک طلائی انگلی نظر آئی تھی۔ لڑکی کے ہاتھ میں انگلی ہونا کوئی اچھبھے کی بات نہیں تھی لیکن نہ جانے کیوں وہ انگلی میرے دل میں کھلبلی مچا رہی تھی۔ وہ ایک بالکل نئی کھنڈ انگلی تھی۔ میں نے شعوری طور پر اس انگلی کی ساخت کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔

صفیہ بیگم سسلی کے بازو کو تھامے تھامے آنسو بہا رہی تھی ”میری بچی کونہ جانے کس کی نظر لگ گئی ہے۔ اچھی خاصی ہنسی مسکراتی تھی۔ اب تو آنکھ کھول کر بھی نہیں دیکھ رہی۔“

میں نے کہا ”میرا نام ملک صفدر حیات ہے اور میں مریضہ کا ایک خیر خواہ ہوں۔“
میں نے دانستہ اپنا ادھورا تعارف کروایا تھا۔ میں ایک خاص مقصد کے تحت ابھی پردے میں رہ کر کام کرنا چاہتا تھا۔ میں چوہدری اور قانون گو کو محسوس کرائے بغیر اپنے شکوک کی تصدیق کر لینا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے سلی کی کاہوش میں آنا بہت ضروری تھا۔
ڈاکٹر کمرے سے چلا گیا تو میں نے قانون گو ارشاد حسین سے کہا ”میں آپ کی بیوی سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”ہاں ہاں ضرور۔“ وہ صفیہ بیگم کی طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا ”میں تنہائی میں ان سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔“

میری اس بات پر چوہدری اور چوہدرائیں کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ دونوں سوالیہ نظروں سے مجھ دیکھنے لگے۔

صفیہ بیگم نے خیف آواز میں کہا ”میں بہت پریشان ہوں۔ جب تک سلی ہوش میں نہیں آ جاتی، میں کسی سے کوئی بات نہیں کروں گی۔“

چوہدری نے پوچھا ”ایسی کون سی خاص بات ہے ملک صاحب؟“

”وہ بات صرف صفیہ بیگم ہی سے کی جاسکتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیا اس بات کا تعلق سلی سے ہے؟“

میں نے ٹھوس لہجے میں کہا ”صرف سلی سے بلکہ اس کی اس حالت سے بھی ہے۔“

صفیہ بیگم تمام نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ چوہدری اور چوہدرائیں پہلے ہی میری جانب متوجہ تھے۔ ارشاد حسین نے پوچھا ”ملک صاحب! کیا آپ وہ بات مجھے نہیں بتا سکتے؟“

”بتا سکتا ہوں۔“ میں نے کہا ”لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں جو کچھ پوچھنا چاہتا ہوں اس کا

جواب صفیہ بیگم ہی دے سکتی ہیں۔“

اب وہاں پر موجود تمام افراد صفیہ بیگم کی طرف دیکھ رہے تھے۔ چوہدری شہادت علی نے میرے

کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”ملک صاحب! آپ ذرا میرے ساتھ آئیں۔“

میں اس کے ساتھ کمرے سے باہر آ گیا۔ چوہدرائیں بھی ہمارے پیچھے کمرے سے نکل آئی۔

چوہدری نے کہا ”تم اندر ہی ٹھہرو۔“

وہ نراسمانہ بنا کر واپس چلی گئی۔

ارشاد حسین نے بیوی کو سنبھالا دیا اور اسے وہاں سے اٹھا کر ایک طرف لے گیا۔ چوہدرائیں البتہ وہیں بیٹھی رہی اور زدیدہ نظر سے باری باری کبھی سلی کو اور کبھی اس کے ماں باپ کو دیکھتی رہی۔ ارشاد حسین سرگوشیانہ انداز میں اپنی بیوی کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اسی دوران میں چوہدری شہادت علی ڈاکٹر کو لے کر آ گیا۔ ڈاکٹر نے دوبارہ سلی کا تفصیلی معائنہ کیا پھر پوچھا ”اس نے ہوش میں آنے کے بعد کوئی بات وغیرہ کی تھی؟“

ارشاد نے جواب دیا ”نہیں جناب کوئی بات نہیں کی۔ بس ایک آدھ بار ہلکا سا کراہی پھر دوبارہ بے ہوش ہو گئی۔“

”چلیں یہ بھی غنیمت ہے کہ اس نے جنبش کی۔“ ڈاکٹر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا ”اس کا مطلب ہے یہ بہتری کی طرف آرہی ہے۔“

میں نے پوچھا ”ڈاکٹر صاحب! آپ کے خیال میں یہ کب تک بات کرنے کے قابل ہو جائے گی؟“

میں سلی سے بات کرنے کے لیے بہت بے چین ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں انگوٹھی دیکھ کر مجھے بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ اس انگوٹھی کا کوئی نہ کوئی تعلق نزول عارف علی سے ضرور ہوگا۔ عارف علی کی جامہ تلاشی سے جو انگوٹھی والی ڈبیا اور ریشمی رومال برآمد ہوا تھا وہ اس وقت بھی میرے پاس موجود تھا۔ میرے یہاں آنے کا واحد مقصد یہی تھا کہ میں اس سلسلے میں اس سے بات کروں گا لیکن وہ بات کرنے کے قابل نہیں تھی۔ ایک بات یقینی تھی کہ اگر سلی کے ہاتھ میں موجود انگوٹھی کا تعلق عارف علی کے ساتھ تھا تو پھر سلی عارف علی کے قاتل سے بھی ضرور واقف ہوگی۔ اگرچہ ابھی تک سلی اور عارف علی کے مابین کسی تعلق کو میں ثابت نہیں کر سکا تھا تاہم اس امکان میں مجھے خاصا وزن دکھائی دے رہا تھا۔

ڈاکٹر نے کچھ چنے کے بعد جواب دیا ”فی الحال تو میں کوئی بات وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ ویسے مجھے امید ہے کہ جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کے وجود میں حرکت پیدا ہوئی ہے اگر ایسا دوبارہ ہوتا ہے تو مریضہ کے ہوش میں آنے کی توقع کی جاسکتی ہے۔“

”میں نے پوچھا تھا یہ کب تک بات کرنے کے قابل ہو جائے گی؟“

”آپ کون ہیں۔“ ڈاکٹر نے اس مرتبہ سنجیدگی سے میرا جائزہ لیا ”آپ مریضہ سے کس قسم کی بات کرنا چاہتے ہیں؟“

کاریڈور کے ایک دور افتادہ کونے میں آکر چوہدری نے مجھ سے پوچھا ”ملک صاحب! میں ایک حقیقت پسند آدمی ہوں۔ مجھے بتائیں وہ کیا بات ہے؟“

میں نے کہا ”چوہدری صاحب! آپ تو جانتے ہیں میں عارف علی کے قتل کے سلسلے میں تفتیش کر رہا ہوں۔ اس روز جب میں آپ کی حویلی میں آیا تھا تو اس سے پہلے میں ارشاد حسین سے ملنے بھی گیا تھا۔“

”آپ نے مجھے بتایا تھا۔“ چوہدری جلدی سے بولا۔ ”ارشاد حسین سے آپ کی بات نہیں ہو سکی تھی۔“

”لیکن ان کی بیوی سے مختصری بات ہوئی تھی۔“ میں نے چوہدری کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔

”میں سمجھا نہیں۔“

”میں قبل از وقت یہ بات کرنا تو نہیں چاہتا تھا لیکن میرا خیال ہے آپ سے چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ چوہدری نے دوستانہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا ”چوہدری صاحب! مجھے امید ہے آپ سر دست اس بات آگے نہیں بڑھائیں گے۔“

چوہدری نے کہا ”آپ فکر نہ کریں۔“

میں نے کہا ”اس روز جب میں نے صفیہ بیگم کو بتایا کہ میں عارف علی کے قتل کے سلسلے میں ارشاد حسین سے بات کرنے آیا ہوں تو اس نے بے ساختہ ایک جملہ کہا تھا۔“

چوہدری کی بے قراری ویدنی تھی ”صفیہ نے کیا کہا تھا؟“

میں نے بتایا ”اس نے کہا تھا..... اس عارف کی وجہ سے نہ جانے اور کون کون سی مصیبت آئے گی۔“

”اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟“

”اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عارف علی کی وجہ سے پہلے بھی اس گھرانے پر کوئی مصیبت آ چکی ہے۔“

”ہوں۔“ چوہدری کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا ”اس وقت تو آپ نے مجھے یہ بات نہیں بتائی تھی؟“

”شاید اب بھی نہ بتاتا اگر میں سلی کی ہاتھ میں سونے کی وہ انگوٹھی نہ دیکھ لیتا۔“

”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“ چوہدری نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

میں نے جواب میں اپنی جیب سے ریشمی رومال اور انگوٹھی والی خالی ڈبیا نکال کر چوہدری کو دکھائی ”یہ دونوں چیزیں مقتول کے لباس سے برآمد ہوئی تھیں۔“

چوہدری نے رومال اور ڈبیا کو الٹ پلٹ کر دیکھا پھر پوچھا ”آپ نے اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا ہے؟“

”ابھی تک کوئی واضح نتیجہ تو اخذ نہیں کیا۔“ میں نے وہ دونوں چیزیں چوہدری کے ہاتھ سے لے کر واپس جیب میں رکھتے ہوئے کہا ”لیکن بہت جلد حقیقت حال سامنے آ جائے گی میں کل ہی لاہور جاؤں گا اور ایک خاص بات کی تصدیق کروں گا۔“

”کسی خاص بات کی تصدیق سے آپ کی مراد ہے؟“

میں نے کہا ”مجھے مقتول کی جیب سے سونے کی ایک انگوٹھی کی خریداری کی رسید بھی ملی ہے۔ مذکورہ انگوٹھی ایک ماہ قبل لاہور کے صرافہ بازار کے ”محبوب جیولرز“ نے فروخت کی تھی۔ رسید پر خریدار کا نام عارف علی درج ہے۔ اس انگوٹھی کا وزن پانچ ماشہ اور قیمت پینتالیس روپے ہے۔“

چوہدری نے کھردرے لہجے میں کہا ”آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عارف نے جو انگوٹھی خریدی تھی وہ سلی کے ہاتھ میں ہے؟“

”یہ میں نہیں کہہ رہا“ حالات اس جانب اشارہ کر رہے ہیں۔“

”اگر ایسا ہے تو ابھی تصدیق کر لیتے ہیں۔“ چوہدری نے کہا ”میں ارشاد حسین سے سلی کی انگوٹھی کے بارے میں پوچھ لیتا ہوں۔“

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”نہیں، چوہدری صاحب! ابھی اس کا وقت نہیں آیا اور آپ نے وعدہ کیا ہے کہ فی الحال آپ یہ بات آگے نہیں بڑھائیں گے۔ میں یہ اس لیے بھی کہہ رہا ہوں کہ آپ کے خاندان آگے چل کر ایک ہونے والے ہیں۔“

چوہدری نے کہا ”ملک صاحب! اگر آپ کے خدشات درست ثابت ہوئے تو پھر یہ خاندان کبھی ایک نہیں ہو سکیں گے۔“

”آپ حیدر بانی ہووے ہیں چوہدری صاحب۔“ میں نے جلدی سے کہا ”ہمیں تفتیش کے سلسلے میں ہر قسم کی خوشگوار اور ناگوار صورت حال سے گزرنا پڑتا ہے مجھے افسوس ہے میری بات نے آپ کو دکھ پہنچایا ہے۔“

ڈاکٹر آتے ہی سلمیٰ کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ دوسریں اس کی ہدایت پر عمل کر رہی تھیں اور ڈاکٹر خود بھی نہایت مہارت کے ساتھ سلمیٰ کی سانس بحال کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سلمیٰ کو اوپر تلے تین انکشن لگائے گئے لیکن ہرگز رتے لمبے کے ساتھ اس کی حالت مزید بگڑتی جا رہی تھی۔

پھر اچانک اس کے جسم نے جھٹکے لینا شروع کر دیے۔ اس کے ساتھ ہی وہ کراہنے لگی۔ ارشاد حسین 'کان اس کے منہ کے قریب لے گیا۔ سلمیٰ کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ارشاد حسین پوری توجہ سے سننے کی کوشش کرنے لگا۔

سلمیٰ نے دھیمی آواز میں ایک دو لفظ ادا کیے پھر اس کے جسم کو ایک خاصا بڑا جھٹکا لگا اور وہ ساکت ہو گئی۔ ڈاکٹر نے سلمیٰ کی نبض ٹولی پھر دل کی دھڑکن محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

ڈاکٹر نے مایوسی سے گردن ہلائی اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

سلمیٰ کی ماں نے دہائی دینا شروع کر دی۔ میں ارشاد حسین کے قریب پہنچا اور پوچھا "سلمیٰ کیا کہہ رہی تھی گر داور صاحب؟"

چوہدری ہمارے نزدیک ہی کھڑا تھا۔ وہ بولا "ہاں ہاں ارشاد حسین بتاؤ۔ سلمیٰ نے اکھڑی اکھڑی ہوئی سانسوں میں کیا کہا تھا؟"

گرداور کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولا "وہ کہہ رہی تھی..... عارف پیچھے مڑ کر دیکھو..... راجوراکٹ....."

"عارف پیچھے مڑ کر دیکھو راجوراکٹ؟" چوہدری نے زیر لب دہرایا "اس کا مطلب کیا ہوا؟" میں نے کہا "میں اس کا مطلب بخوبی سمجھ گیا ہوں۔"

"کچھ مجھے بھی تو بتائیں؟" صفیہ خاتون آنسو بہاتے ہوئے بولی۔

میں خاموشی سے کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہاں رکنے کی اب مجھے ضرورت نہیں تھی۔ میرے علم میں تین نام آچکے تھے۔ عارف علی سلمیٰ اور راجوراکٹ۔ عارف علی قتل ہو چکا تھا۔ سلمیٰ کی خودکشی کی کوشش بھی آخر کامیاب ہو گئی تھی اور راجوراکٹ کو میں نے تلاش کرنا تھا۔

سلمیٰ کی موت نے اسپتال کے کمرے میں کھرام برپا کر دیا تھا۔ ارشاد حسین اور صفیہ بیگم کا برا حال تھا۔ چوہدری شہادت علی اور چوہدرائیں بھی صدمے کی سی کیفیت سے دوچار تھے۔ کسی نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

چوہدری نے کہا "سلمیٰ نے ڈی ڈی ٹی پاؤڈر کیوں پیا؟ یہ بات لب کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی ہے۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا "ایک بات مجھے انھن میں جھلا کر رہی ہے اگر ایسی کوئی بات تھی تو ارشاد حسین کو چاہیے تھا کہ مجھے بتا دیتا۔ ہمارے بڑے گہرے دوستانہ مراسم ہیں۔"

میں نے کہا "چوہدری صاحب! آپ ابھی کسی بات کو حتمی نہ سمجھیں اس طرح خواہ مخواہ غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔ پہلے مجھے اپنی تفتیش مکمل کر لینے دیں۔"

وہ کچھ سوچنے لگا۔ میں نے کہا "میں ایک بار پھر آپ کو یاد دلا دوں کہ ابھی آپ اس سلسلے میں سلمیٰ کے والدین سے کوئی بات نہیں کریں گے۔"

"وعدہ کر کے میں نے خود کو پابند کر لیا ہے۔" چوہدری بولا "ورنہ جی تو چاہ رہا ہے کہ ابھی جا کر صفیہ بیگم سے پوچھوں اس نے عارف علی کے حوالے سے کس مصیبت کا ذکر کیا تھا اور یہ بھی کہ سلمیٰ کے ہاتھ کی انگوٹھی کا جنازہ افیاد اور تاریخ کیا ہے۔"

میں نے کہا "مجھے اس بار اپنے وعدے کے پابند رہیں گے۔"

چوہدری کے جواب دے سے پہلے ہی میں نے دیکھا ارشاد حسین بوکھلاہٹ کے انداز میں کمرے سے نکلا تھا۔ اس کے کارڈیٹر میں چاروں جانب نگاہ دوڑائی پھر ہماری طرف آنے لگا۔ وہ بڑی تیزی میں تھا۔

ہم دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا اور ارشاد حسین کا جانب بڑھ گئے۔

وہ ہمارے قریب آ کر بولا "چوہدری صاحب! سلمیٰ کی خبر ڈرپ رہی ہے۔ وہ اکھڑی اکھڑی سانس لے رہی ہے اور ڈرپ بھی چلنا بند ہو گئی ہے۔"

میں نے کہا "فوری طور پر ڈاکٹر کو مطلع کیا جائے۔"

"میں بلاتا ہوں ڈاکٹر کو۔" چوہدری نے کہا "آپ دونوں اندر جاؤ۔"

میں ارشاد حسین کے ساتھ سلمیٰ والے کمرے میں پہنچا۔ وہاں رونا دھونا جا رہا تھا۔ صفیہ بیگم باقاعدہ آنسوؤں سے رو رہی تھی۔ چوہدرائیں کی حالت بھی دگرگوں تھی۔ وہ دونوں سلمیٰ کے بہت قریب تھیں اور اسے ہلانے جلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

سلمیٰ کے سینے کے زیر و بم سے اندازہ ہوتا تھا کہ سانس بہت دشواری سے چل رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سرسوں پھولی ہوئی تھی اور ڈرپ واقعی رک چکی تھی۔ میں نے ایک ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ وہ لب دم ہے۔ اس کے زندہ بچ رہنے کے امکانات معدوم ہو چکے تھے۔

میں سیدھا حوالدار جمعہ خان کے پاس آ گیا ”جمعہ خان!“
میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ”اپنا تو کام ختم ہو گیا۔ چلو واپس چلتے ہیں۔“
”کیا ہوا ملک صاحب۔“ جمعہ خان نے کہا ”آپ خاصے تھکے ہوئے نظر آ رہے ہیں؟“
میں نے کہا ”میری تھکاوٹ کو بھول جاؤ۔ یہ بتاؤ راجوراکٹ کون ہے؟“
”راجوراکٹ؟“

”ہاں جمعہ خان۔“ میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا ”راجوراکٹ مجھے فوری طور پر
مطلوبہ ہے۔ تم جانتے ہو اسے؟“

”اے کون نہیں جانتا جناب۔“ جمعہ خان نے کہا ”وہ ہمارے علاقے کا مشہور غنڈا ہے آپ
چونکہ اسی اس تھانے میں لٹے آئے۔۔۔“

”یہ راکٹ کہاں پایا جاتا ہے؟“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”چوہدری دوست علی کے چنڈ میں ملک صاحب۔“

”یعنی تینوں کردار ایک ہی گاؤں کے ہیں!“

”کون تینوں جناب؟“

حوالدار کو پوری صورت حال سے آگاہ نہیں ہوئی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ سہیلی نے آخری
سانوں میں کتنا بڑا انکشاف کیا تھا۔ میں نے اسے مختصر طور پر بتا دیا تو بولا ”جناب پھر تو سارا کیس ہی
حل ہو گیا۔“

”کسی حد تک کہہ سکتے ہو۔“

”کسی حد تک کیوں جناب۔“ جمعہ خان بڑے جوش لہجے میں بولا ”سید علی کی بات ہے، عارف علی کو
راجوراکٹ نے قتل کیا ہو گا۔“

میں نے اس کے تجزیے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تو وہ خود ہی بولا ”ملک صاحب مقتول عارف علی کا
متوفی سہیلی کے ساتھ ضرور کوئی تعلق تھا۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی کہ راجوراکٹ کالان دونوں سے
کیا تعلق تھا۔“

میں نے کہا ”جمعہ خان بہت جلد سب کچھ تمہاری سمجھ میں آ جائے گا۔ قبل از وقت ذہن کو
تھکانے کی کوشش نہ کرو۔“

”آپ کی تفتیش کا انداز نرالا ہے ملک صاحب۔“ جمعہ خان نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا ”آپ

سے پہلے جو تھانے دار صاحب اس تھانے میں متعین تھے وہ تو دو منٹ میں پکڑ کر بندے کو لائے حاضر کر
دیجئے تھے جب کہ آپ بڑے بڑے معاملات کو بھی بڑی سہولت سے لیتے ہیں۔“

”میں تمہاری بات نہیں سمجھ سکا جمعہ خان۔“ میں نے چونک کر اسے دیکھا ”میں نے کہاں
رعایت سے کام لیا ہے؟“

وہ بولا ”خود کشی اور خود سوزی قابلِ دخل اندازی پولیس معاملات ہیں لیکن آپ نے کوئی ایکشن
نہیں لیا۔“

”تمہارا اشارہ سہیلی کی طرف ہے؟“

”جی ملک صاحب۔“

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ”جمعہ خان مجھے بخوبی علم ہے کہ کون سا معاملہ قابلِ دخل
اندازی پولیس ہے اور کون سا نہیں لیکن میرا کام کرنے کا اپنا انداز ہے۔ میرے درپیش اس وقت سب
سے اہم معاملہ عارف علی کے قاتل کی تلاش تھا اور میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اس معاملے میں سہیلی کی
ذات بھی ملوث ہے۔ میں نے سہیلی کے لواحقین کو دانستہ ڈھیل دی تھی اور اس سے مجھے بہت زیادہ فائدہ
بھی ہوا ہے۔ رفتہ رفتہ تم میرے انداز سے واقف ہو جاؤ گے۔“

”تو اب آپ گرد اور اور اس کی بیوی کو شامل تفتیش کر لیں گے؟“

میں نے کہا ”ضرورت پڑی تو چوہدری اینڈ کمپنی کو بھی نہیں بخشوں گا۔“ ایک لمحے کو رک کر میں
نے ناصحانہ انداز میں کہا ”جمعہ خان! ایک بات میری کان کھول کر سن لو۔ ہمیشہ ٹھنڈا کر کے کھانا
چاہیے۔ گرم گرم کھانے سے منہ جل جاتا ہے۔“

”یہ تو آپ واقعی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

میں نے مزید کہا ”اور مصیبت میں گرفتار افراد کے ساتھ تھوڑی بہت رعایت کر دینے سے کوئی
فرق نہیں پڑتا۔ میں گرد اور اور اس کی بیوی کو سہیلی کی خود کشی کی کوشش کے سلسلے میں تنگ کر کے وہ مفید
معلومات حاصل نہیں کر سکتا تھا جو میں نے دوستانہ فضا قائم کر کے حاصل کی ہیں۔ ویسے بھی سہیلی کی
حالت ایسی نہیں تھی کہ میں تھانے دار انداز میں اس کا بیان لینے کے لیے ان پر مسلط ہو جاتا۔“

”ملک صاحب! آپ تھانے دار کم اور سوشل ورکر زیادہ لگتے ہیں۔“ جمعہ خان نے سرسری سے
لہجے میں کہا۔

”جمعہ خان! تھانے دار دراصل ایک سوشل ورکر ہی ہوتا ہے۔“ میں نے تائیدی انداز میں سر

ہلاتے ہوئے کہا ”اس کے پیچھے قانون کی طاقت ہوتی ہے اور وہ سرکاری وردی پہن کر اپنے علاقے کے لوگوں کے مسائل حل کرنے میں شب و روز مصروف رہتا ہے۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے اضافہ کیا ”جب کوئی تھانے دار ایسا نہیں کرتا تو پھر انصاف ناپید ہو جاتا ہے۔ مظلوم کمزور سے کمزور تر اور ظالم مضبوط سے مضبوط تر بن جاتا ہے اور یہ بات اس قادر مطلق کو سخت ناپسند ہے۔“

خوالدار مجھ سے خاصا متاثر نظر آ رہا تھا جذباتی لہجے میں بولا ”ملک صاحب! میری دعا ہے کہ اس ملک کے سارے تھانے دار آپ جیسے خیالات کے مالک ہو جائیں۔“

واپسی کے سفر کے دوران میں خوالدار جمعہ خان کو میں جائز و ناجائز غلط و صحیح اور اچھائی و برائی کے درمیان واضح فرق سے بالتفصیل آگاہ کرتا رہا۔ جب ہم تھانے پہنچے تو رات کے آٹھ بج چکے تھے۔

میں اپنے کمرے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ اے ایس آئی نزاکت علی نے آ کر اطلاع دی ”ملک صاحب! آپ کے لیے ایک خوش خبری ہے۔“

”وہ کیا نزاکت سی؟“

”میری گھروالی نے بہت کامیابی سے بات معلوم کر لی ہے۔“ وہ ہر جوش لہجے میں بولا ”اب عارف علی کے قتل کا معاملہ زیادہ آسانی سے منٹ جائے گا۔“

نزاکت علی نہیں جانتا تھا کہ اب یہ کیس کون سا رخ اختیار کر چکا تھا۔ بہر حال میں نے پوچھ لیا ”تمہاری گھروالی کیا خبر لائی ہے؟“

”ملک صاحب! آپ کا اندازہ درست تھا۔ عارف علی کا گردار کی بیٹی سلٹی سے عشق والا معاملہ تھا۔ دونوں کے درمیان بڑے خفیہ انداز میں چکر چل رہا تھا۔ دونوں راتوں کی تاریکی میں چپ چپ کر ملتے تھے۔“

”اب وہ نہ چھپ کر مل سکیں گے اور نہ سب کے سامنے۔“ میں نے کہا ”اس کہانی کا انجام بہت دردناک ہوا ہے نزاکت علی۔“

پھر میں نے اسے ”انجام“ سے آگاہ کیا تو وہ افسردہ نظر آنے لگا ”ملک صاحب! دونوں حرام موت مارے گئے۔“

میں نے کہا ”سلٹی نے کیڑے مار دو اپنی کرجس حماقت کا ثبوت دیا تھا اس کا نتیجہ بہر حال حرام موت کی صورت ہی میں نکلتا تھا۔ ہاں! البتہ وہ مرنے سے پہلے عارف علی کے قاتل کی طرف ایک

واضح اشارہ کر گئی ہے۔“

نزاکت علی کے اصرار پر میں نے اسے سلٹی کی زبان سے ادا ہونے والے آخری الفاظ کے بارے میں بتایا تو وہ بولا ”ملک صاحب! راجوراکٹ کی شہرت واقعی بہت خراب ہے۔ پہلے والے تھانے دار صاحب اس کے ساتھ خاصی رعایت کرتے تھے۔ اس وجہ سے وہ خاصا شیر ہو گیا تھا اور سن مانی کرتا پھرتا تھا۔“

میں نے کہا ”نزاکت علی! میں ایسے غنڈوں کی غنڈا گردی ناک کے راستے نکالنے کے ایک سو ایک طریقے جانتا ہوں۔ تم چند سپاہیوں کو ساتھ لے کر جاؤ اور راجوراکٹ کو فوری طور پر گرفتار کر کے میرے پاس لے آؤ۔“

”جو حکم جناب۔“ اے ایس آئی نے سلیوٹ کرتے ہوئے کہا ”آپ نے دل خوش کر دیا ہے۔ اس تھانے سے راجو کی گرفتاری کا پہلی مرتبہ حکم نامہ جاری کیا جا رہا ہے۔ میں ابھی اس پچھے خان کو آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔“

میں نے کہا ”اور سنو! اگر راجو گرفتاری دینے میں کوئی پس و پیش کرے تم سختی سے بھی درپنچ نہ کرنا۔ اس کی من مانیوں میں ناک کے راستے نکال دوں گا۔“

”آپ فکر ہی نہ کریں ملک صاحب۔“ اے ایس آئی نے خوش ہوتے ہوئے کہا ”راجو کی مرمت کر کے مجھے دلی مسرت ہوگی۔“

اے ایس آئی کے جانے کے بعد میں نے دوسرے اے ایس آئی سلیمان شاہ کو اپنے پاس کمرے میں بلایا۔

”جی حکم ملک صاحب!“

میں نے کہا ”سلیمان شاہ! تم کل صبح ذرا جلدی تھانے پہنچ جانا۔“

”کسی خاص مشن کی تیاری ہے جناب؟“

”ہاں! خاص ہی سمجھو۔“ میں نے کہا ”میں کل لاہور جا رہا ہوں اور تم بھی میرے ساتھ چلو گے۔“

”ٹھیک ہے! میں کتنے بجے تک آ جاؤں جناب؟“

”ٹھیک آٹھ بجے۔“ میں نے کہا ”سیدھے میرے سرکاری کوارٹر میں آنا۔ اور ہاں! ہم سادہ لباس میں لاہور جائیں گے۔“

میں آج کا پورا دن تھانے سے باہر رہا تھا اور کل کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ میں ”محبوب جیولرز“ جا کر تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ جو انگوٹھی میں نے سلسلی کی انگلی میں دیکھی تھی کیا وہ وہی انگوٹھی تھی جو عارف علی نے ایک ماہ قبل خریدی تھی۔ اگرچہ عارف علی اور سلسلی کے تعلقات اب میرے علم میں آچکے تھے لیکن میں ہر قسم کی تسلی کرنا چاہتا تھا۔ ویسے تو یہ بات ارشاد حسین سے بھی پوچھی جاسکتی تھی کہ سلسلی کی انگلی میں پانی جانے والی انگوٹھی کہاں سے آئی تھی لیکن اس کے گھر میں پہلے ہی ایک قیامت ٹوٹی ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اے ایس آئی نزاکت علی خالی ہاتھ واپس آ گیا۔

میں نے پوچھا ”راجوراکٹ کو نہیں لائے نزاکت علی؟“

”ملک صاحب! وہ گاؤں سے باہر کہیں گیا ہوا ہے۔“ اس نے بتایا ”میں نے ہوشیار قسم کے چند سپاہیوں کی ڈیوٹی لگائی ہے کہ جیسے ہی وہ گاؤں میں نظر آئے فوری طور پر اطلاع دیں۔“

”یہ تم نے ٹھیک ہی کیا ہے نزاکت علی۔“ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا ”لیکن اس کی واپسی کے انتظار میں وقت ضائع نہیں کیا جاسکتا۔“ پھر میں نے اے ایس آئی کو ہدایت دی کہ گاؤں سے باہر بھی جہاں جہاں وہ پایا جاتا ہو اسے تلاش کیا جائے۔ میں نے اسے چھاپا مار نہیں تشکیل دینے کا مشورہ دیا۔

اگلے روز میں حسب پروگرام اے ایس آئی لیسان شاہ کے ساتھ لاہور گیا۔ صرافہ بازار میں ”محبوب جیولرز“ کی دکان تلاش کرنے میں مجھے ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ خاصی بڑی اور مشہور دکان تھی۔

دکان کا مالک محبوب خان خاصا خوش مزاج اور شائستہ انسان تھا۔ وہ بڑی بہت سے ملا اور پوچھا ”فرمائیں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

میں نے اپنے تعارف کروانے کے بعد کہا ”محبوب خان صاحب! میں قتل کے ایک کیس کی تفتیش کے سلسلے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔“

وہ مجھے دکان کے اوپری حصے میں لے گیا۔ یہ ایک الگ تھلگ حصہ تھا۔ ہم بیٹھ گئے تو اس نے پوچھا ”کون قتل ہو گیا ہے اور میرا اس قتل سے کیا تعلق ہے؟“

میں نے کہا ”آپ کی دکان کا تعلق اس قتل سے بڑا گہرا ہے۔“

وہ سراسیمہ نظر آنے لگا ”جناب ذرا کھل کر بتائیں۔“

میں نے پوچھا ”قریب قریب ایک ماہ قبل آپ کی دکان سے ایک انگوٹھی خریدی گئی تھی۔ آپ کو کچھ یاد ہے؟ خریدار کا نام عارف علی تھا؟“

”جناب! ایک ماہ میں تو ہم نے سینکڑوں انگوٹھیاں فروخت کی ہوں گی۔“ محبوب خان نے کہا ”آپ کس انگوٹھی کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟“

میں نے اپنی جیب میں سے انگوٹھی کی خالی ڈبیا نکال کر اس کی طرف بڑھادی اور کہا ”میں اس انگوٹھی کی بات کر رہا ہوں۔“

”ڈبیا تو ہماری ہی دکان کی ہے۔“ وہ بولا ”ہم انگوٹھیوں کے لیے مخصوص ڈبیا بنواتے ہیں۔“

”اور یہ ہے رسید اس انگوٹھی کی۔“ میں نے عارف حسین کی جیب سے ملنے والی رسید اسے دکھائی۔

وہ رسید لے کر پڑھنے کے بعد بولا ”ملک صاحب! یہ رسید میرے ہاتھ کی بنی ہوئی ہے۔ آخر معاملہ کیا ہے۔“

”گھبرانے کی بات نہیں ہے۔“ میں تسلی آمیز لہجے میں بولا ”آپ پریشان نہ ہوں۔ میں بس ایک بات کی تصدیق کے لیے یہاں آیا ہوں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس انگوٹھی کا ڈیزائن کس قسم کا تھا؟“

”یہ کون سی مشکل بات ہے۔“ وہ جلدی سے بولا پھر دکان کے اندر موجود ایک ملازم کو آواز دے کر اپنے پاس بلا لیا۔

”مشتاق محمد۔“ اس نے ملازم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”اس رسید والی انگوٹھی کا جو مخصوص ڈیزائن تم نے بنایا تھا وہ یاد ہے تمہیں۔“

وہ رسید کو دیکھنے کے بعد بولا ”مجھے اچھی طرح یاد ہے خان صاحب۔ عارف علی نے مجھ سے خصوصی فرمائش کی تھی کہ انگوٹھی زبردست ہونا چاہیے۔“

”تم عارف علی کو جانتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا ”جناب! عارف علی اپنے محلے میں رہتا تھا پر پتا نہیں کیا ہوا وہ شہر چھوڑ کر واپس

گاؤں چلا گیا ہے۔“

میں نے کہا ”اب اس نے گاؤں بھی چھوڑ دیا ہے۔“

”اچھا جی! پھر کہاں گیا ہے؟“

میں نے چھت کی طرف اشارہ کیا "اب وہ وہاں سے واپس نہیں آئے گا۔" پھر میں نے مختصر الفاظ میں مشتاق محمد اور محبوب خان کو عارف علی کے قتل کے بارے میں بتایا۔ مشتاق محمد افسردہ لہجے میں بولا "عارف علی بہت اچھا آدمی تھا جناب۔ محلے میں میرا صرف اسی سے اٹھنا بیٹھنا تھا۔ یہ بات اس نے مجھے بڑے رازدارانہ انداز میں بتائی تھی کہ وہ کسی لڑکی کو سونے کی انگوٹھی کا تحفہ دینا چاہتا تھا۔ میں نے خان صاحب سے سفارش کر کے انگوٹھی کی قیمت میں خاصی رعایت بھی کروادی تھی۔"

محبوب خان نے کہا "مشتاق محمد اسی نمونے کی ایک انگوٹھی لا کر ملک صاحب کو دکھاؤ۔" مشتاق محمد گیا اور تھوڑی ہی دیر میں خوب صورت ڈیا میں بھی ایک انگوٹھی لے آیا۔ میں نے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا۔ وہ وہی ہوئی ہی انگوٹھی تھی جیسی میں نے متوفیہ سہیلی کے ہاتھ میں دیکھی تھی۔ "یہ لیں، اچھی طرح دیکھ لیں ملک صاحب۔" محبوب خان نے انگوٹھی والی ڈیا مشتاق محمد کے ہاتھ سے لے کر مجھے عادی "اس انگوٹھی اور عارف علی والی انگوٹھی میں بس ایک ہی فرق ہے۔" اس نے مجھے آگاہ کیا۔

میں نے کہا "کیا میں اسے ڈیا سے باہر نکال کر دیکھ سکتا ہوں؟" "ضرور دیکھیں جناب۔"

میں نے انگوٹھی کو ڈیا سے باہر نکال لیا پھر اس کا چھٹی طرح معائنہ کرنے کے بعد اپنی رائے ظاہر کی "میرا خیال ہے نمایاں فرق تو یہ ہے کہ انگوٹھی پانچ مائٹس سے زیادہ وزن کی ہے۔" "آپ کا خیال صدی صدی درست ہے۔" محبوب خان نے سنا کی انداز میں کہا "یہ انگوٹھی بارہ ماشہ یعنی پورے ایک تو لے کی ہے۔ شاہی محلے کی ایک بانی نے خاص طور پر بنوائی ہے۔" میرا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ دو چار رسی باتوں کے بعد میں نے محبوب خان کے ساتھ دکان کا شکریہ ادا کیا اور سلیمان شاہ کے ساتھ دکان سے باہر نکل آیا۔

اب اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ عارف علی اور سہیلی کے درمیان محبت کی کہانی بڑے خفیہ انداز میں چل رہی تھی اور وہ چھپ چھپ کر ملتے تھے۔ ایسی ہی ایک ملاقات کے دوران میں عارف علی نے سہیلی کو طلائی انگوٹھی کا تحفہ پیش کیا لیکن یہ ملاقات عارف علی کی زندگی کی آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ اب حل طلب بات یہ تھی کہ اگر واقعی راجو راکٹ ہی عارف علی کا قاتل تھا تو اسے عارف سے کیا دشمنی تھی۔ کہیں وہ سہیلی کا طلب گار تو نہیں تھا؟ راجو راکٹ کی گرفتاری بہت

ضروری ہوگئی تھی۔ بہت ضروری اور بہت جلد۔

میں تھا نے پہنچا تو پتا چلا چوہدری شہادت علی مجھ سے ملنے آیا تھا۔ اس نے کافی انتظار کیا پھر دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس چلا گیا تھا۔ مجھے تھانے آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ چوہدری شہادت علی کی آمد کی اطلاع آگئی۔ میں نے فی الفور اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ رسی علیک سلیک کے بعد چوہدری نے پوچھا "ملک صاحب! آپ کی تفتیش کہاں تک پہنچی ہے؟"

"کون سی تفتیش چوہدری صاحب؟"

"عارف علی کے قتل کی تفتیش۔"

میں نے کہا "آخری مرحلے میں ہے۔"

"آپ نے قاتل کو گرفتار کر لیا ہے؟"

میں نے کہا "میں نے راجو کی گرفتار کے لیے اپنے بندے دوڑا دیے ہیں۔ انشاء اللہ آپ بہت جلد اسے جوا لات کے اندر دیکھیں گے۔"

چوہدری نے پوچھا "کیا یہ بات ثابت ہوگئی کہ قاتل راجو ہی بنے کیا ہے؟"

"فی الحال تو یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ عارف علی اور سہیلی ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا "جس انگوٹھی کا ذکر میں نے آپ سے کیا تھا وہ عارف علی نے سہیلی کو محبت کے تحفے میں دی تھی۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ "اور جہاں تک راجو راکٹ کے قاتل ہونے کا سوال ہے تو اس کا صحیح پتا تو اس وقت چلے گا جب وہ ہمارے قابو میں آئے گا۔"

"اچھا ہوا، مجھے وقت سے پہلے معلوم ہو گیا۔" چوہدری خیال افروز لہجے میں گویا ہوا "اگر میں اپنے بیٹے کا رشتہ وہاں کر دیتا تو نہ جانے وہ لڑکی شادی کے بعد کیا گل کھلاتی۔"

میں نے چوہدری کی بات پر تبصرہ کرنے کے بجائے اپنے طور پر کہا "چوہدری صاحب! اللہ کا کوئی کام خالی از مصلحت نہیں ہوتا۔"

"یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

میں نے کہا "عارف علی اپنی جان سے گیا، سہیلی نے اپنے محبوب کے غم میں خودکشی کر لی۔ اگر سہیلی یہ سنگین قدم نہ اٹھاتی تو ممکن ہے عارف علی کا قاتل اسے بھی ٹھکانے لگا دیتا۔ یعنی دونوں صورتوں میں اس کی موت یقینی تھی لیکن وہ اپنے مقررہ وقت اور طریقے سے ہی آتی ہے۔"

”میرا خیال ہے قاتل سہیلی کے خون میں ہاتھ رنگنے کی کوشش نہ کرتا۔“ چوہدری نے کہا
 ”عارف علی کو راستے سے ہٹانے کے لیے تو وہ یہ انتہائی قدم اٹھا سکتا تھا مگر سہیلی کو تو وہ حاصل کرنا چاہتا
 تھا اس کی جان کیسے لے سکتا تھا۔“

میں نے کہا ”ابھی تک یہ بات ثابت نہیں ہوئی کہ قاتل نے سہیلی کے حصول کے لیے عارف علی
 کو قتل کیا ہے اور نہ ہی یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ راجو راکٹ ہی عارف علی کا قاتل ہے۔“
 ”راجو راکٹ کی گرفتاری کے سلسلے میں اگر آپ کو میرے تعاون کی ضرورت ہو تو میں حاضر
 ہوں۔“ چوہدری نے دوستانہ انداز میں کہا۔

”آپ کی اس مخلصانہ پیش کش کا بہت بہت شکریہ چوہدری صاحب۔“ میں نے کہا ”اگر آپ
 کے تعاون کی ضرورت پڑی تو میں آپ کو ضرور تکلیف دوں گا۔“
 ہمارے درمیان کافی دیر تک راجو راکٹ، سہیلی اور عارف علی کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی پھر
 چوہدری واپس چلا گیا۔ میں اپنے دردمرہ کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔

تیسرے روز رات میں راجو راکٹ کی گرفتاری عمل میں آسکی۔ میں اس وقت تھانے سے اٹھنے
 کی تیاری کر رہا تھا۔ نزاکت علی نے آکر اطلاع دی۔
 ”ملک صاحب! راجو راکٹ گرفتار کر لیا۔“
 ”کہاں ہے وہ؟“ میں یہ خبر سن کر اچھل پڑا تھا۔
 نزاکت علی نے کہا ”ابھی حاضر کرتا ہوں جناب۔“

تھوڑی دیر کے بعد راجو راکٹ میرے سامنے موجود تھا۔ وہ صورت سے ہی مسکند غنڈا دکھائی
 دیتا تھا۔ اس نے خاصی صحت مند موٹپنیں رکھ چھوڑی تھیں اور گراں ذیل تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھ
 کڑی لگی ہوئی تھی لیکن وہ کچھ زیادہ خوف زدہ نظر نہیں آتا تھا۔
 ”تو تم ہو راجو راکٹ؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ مسکین سے لہجے میں بولا ”جناب نام تو میرا ریاض احمد ہے لیکن لوگوں نے راجو راکٹ مشہور
 کر دیا ہے۔ آپ نے مجھے کیوں گرفتار کرایا ہے کیا آپ کو مجھ سے کوئی شکایت پیدا ہو گئی ہے؟“

میں نے اس کے گال پر ایک زوردار چھڑ رسید کرتے ہوئے کہا ”سواری اولاد! کیا تم سمجھتے ہو کہ
 تیسوں والی صورت بنا کر تم مجھے دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ اس غلط فہمی کو تم اپنے ذہن سے
 نکال دو۔ میں تھانے دار ہوں ذرا دوسری قسم کا۔“

”وہ تو مجھے آپ کے چھڑ ہی سے اندازہ ہو گیا ہے جناب۔“ وہ سادگی سے بولا ”پہلے والے
 تھانے دار صاحب میرا بہت خیال رکھتے تھے۔“

اے ایس آئی نے اس کی کمر میں لات رسید کرتے ہوئے کہا ”سیدھا ہو کر کھڑا ہو راکٹ کی
 اولاد۔ ملک صاحب بھی تمہارا بہت خیال کریں گے مگر ذرا دھڑکھڑا کرے انداز میں۔“

”راجو راکٹ!“ میں نے اپنی چھڑی (رولر) اس کے سینے میں چبھوتے ہوئے کہا ”میں ان
 لوگوں کا بہت خیال رکھتا ہوں جو میرے سامنے بچ بولتے ہیں۔“

”میں تو ہمیشہ سچ ہی بولتا ہوں جناب۔“ وہ بنیدگی سے بولا ”آپ کے سامنے بھی سچ ہی بولوں
 گا۔ آپ پوچھیں کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔“

میں نے پوچھا ”تم نے عارف علی کو کیوں قتل کیا تھا؟“
 ”کون عارف علی؟“

اے ایس آئی نزاکت علی نے اس کی گردن پر ایک زوردار ہاتھ جماتے ہوئے غصیلے لہجے میں
 کہا ”تمہاری ماں کا خھم عارف علی جسے تم نے گرد اور ارشاد حسین کی زمین پر قتل کیا تھا!“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب۔“ وہ روئی صورت بنا کر بولا ”میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔“
 ”یہ ایسے نہیں مانے گا ملک صاحب۔“ اے ایس آئی نے کہا ”اس کے ساتھ دوسرا طریقہ
 آزمانا پڑے گا۔“

میں نے ایک سپاہی کو بھیج کر حوالدار جمعہ خان کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ جمعہ خان نے آکر
 مجھے سلیوٹ کیا۔ میں نے کہا ”جمعہ خان تمہیں مجھ سے شکایت تھی تاکہ میں بڑے بڑے معاملات کو

بھی بڑی سہولت سے لیتا ہوں جب کہ سابق تھانے دار صاحب دو منٹ میں بندے کو پکڑ کر لائن
 حاضر کر دیتے تھے۔“ پھر میں نے راجو راکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”اس بندے کو

تمہارے سابق تھانے دار صاحب نے کتنی مرتبہ لائن حاضر کیا تھا؟“
 جمعہ خان فحالت آمیز انداز میں بولا ”میری سوچ غلط تھی جناب۔“

”میں نے جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔“ میں نے کہا ”راجو راکٹ آج سے پہلے کتنی مرتبہ
 گرفتار ہوا ہے؟“

”ایک بار بھی نہیں۔“

”تمہارے خیال میں یہ ایک نہایت ہی معزز انسان ہے؟“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“

”اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو پھر یہ آزاد کیوں تھا؟“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا ”اس کے نامہ اعمال پر تو بد معاشی اور غنڈا گردی کی اتنی داستانیں رقم ہیں کہ اسے اس وقت جیل میں ہونا چاہیے تھا۔“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ حوالدار نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

جمہ خان ’میں راجوراکٹ کو آج کی رات تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ”اب تمہاری صلاحیت کا امتحان ہے۔ اسے یقین دلادو کہ حارے پاس کیسے کیسے راکٹ موجود ہیں۔ مجھے بس ایک سوال کا جواب چاہیے۔ عارف علی کو کون قتل کیا گیا؟“

”آپ فکرنہ کریں ملک صاحب۔“ جمہ خان نے راجو کو بازو سے پکڑ کر جھکا دیا ”اس سورما کو آج پناہ مل جائے گا۔ ہمارا کس جگہ کا نام ہے۔“ نانی ’دادی خواب میں نہ آگئی تو میرا نام بھی جمہ خان نہیں۔“

میں جمہ خان اور اے ایس آئی نزاکت علی کو ضروری ہدایات دینے کے بعد اپنے کوارٹر میں آ گیا۔ مجھے امید تھی کہ جمہ خان راجو کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ یہ فرض محال اگر راجو نے عارف علی کو قتل نہیں بھی کیا تھا تو پھر بھی اس کی ”آؤ بھگت“ بہت ضروری تھی۔ وہ ایک طویل عرصے سے آزادانہ اپنی بد معاشی چکارہا تھا۔ میں نے اس کو زنجیر ڈالنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

دوسری صبح میں تھا نے پہنچا تو صورت حال خاصی حوش وارتھی۔ اس اپنے کمرے میں جا کر بیٹھا تو جمہ خان نے خوش خبری سنائی ”ملک صاحب! راجو نے عارف علی کے قتل کا اعتراف کر لیا ہے۔“

”اسے میرے پاس لے کر آؤ۔“

تھوڑی سی دیر بعد راجوراکٹ میرے سامنے موجود تھا۔ اس کے شانے ڈھلکے ہوئے تھے اور شکل پر بارہ بج رہے تھے۔ جمہ خان نے دلی کھول کر اس کی درگت بنائی تھی۔ جمہ خان واقعی ایک ”باصلاحیت“ حوالدار تھا۔

میں نے کڑے تیروں سے اسے گھورا اور پوچھا ”راجوراکٹ! تم نے ایک معصوم اور بے گناہ انسان کے خون میں ہاتھ کیوں رنگے؟“

”جناب! میں لالچ میں آ گیا تھا۔“ وہ گڑ گڑایا۔

”کیا لالچ؟“

”فیکے ڈوگر نے مجھے اس کام کے لیے پورے پانچ سو روپے دیے تھے۔“

”تو تم نے پانچ سو روپے کی خاطر ایک انسان کی جان لے لی؟“

”جناب! پانچ سو روپے اچھی خاصی رقم ہوتی ہے۔“ وہ نظر چراتے ہوئے بولا ”لالچ نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور میں نے۔۔۔۔۔“

”یہ فیکے ڈوگر کون ہے؟“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”چوہدری شہادت علی کی حویلی میں ملازم ہے۔“

”کیا؟“ میں چونک اٹھا۔

جمہ خان نے تصدیقی لہجے میں کہا ”ملک صاحب! رفیق حسین عرف فیکا ڈوگر چوہدری شہادت علی کا ایک پرانا ملازم ہے۔“

میرا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ میں نے جمہ خان سے کہا ”اس راکٹ کی اولاد کو لے کر جا کر حوالات میں بند کر دو اور اس کی سخت نگرانی کرو۔ کسی بھی شخص کو اس سے ملنے نہ دیا جائے۔“

حوالدار راجو کو لے کر چلا گیا تو میں نے اے ایس آئی سلیمان شاہ کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ جب سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ عارف علی کو قتل کرنے کے احکامات چوہدری شہادت علی کی حویلی سے جاری کیے گئے تھے میں کسی اور ہی زاویے سے سوچنے لگا تھا۔ ظاہر ہے فیکا ڈوگر اتنی بڑی رقم اپنی جیب سے تو نہیں نکال سکتا تھا (اس زمانے میں پانچ سو روپے اچھی خاصی رقم ہوتی تھی) اگر راجوراکٹ کی یہ بات سچ تھی کہ فیکے نے اسے عارف علی کو قتل کرنے کا معاوضہ پانچ سو روپے دیا تھا تو پھر یہ بات یقینی تھی کہ کسی اور شخص نے فیکے کو اس ذیل کا حکم دیا ہوگا اور اس شخص کا تعلق حویلی کے مالکان سے ہو سکتا تھا۔

میرے ذہن میں تین نام چمکنے لگے۔ چوہدری شہادت علی! اس کی بیوی اور چوہدری عشرت۔ چوہدری کے گھر کے باقی افراد بچوں اور بچیوں پر مشتمل تھے جو ظاہر ہے اس معاملے میں ملوث نہیں ہو سکتے تھے۔ میں نے فوری طور پر چوہدری شہادت علی کی حویلی جانے کا فیصلہ کر لیا۔

اے ایس آئی سلیمان شاہ کمرے میں آیا تو میں نے اس سے کہا ”ہم ابھی چوہدری شہادت علی کی حویلی میں جا رہے ہیں۔ تم پوری تیاری کر لو۔ ممکن ہے گرفتاریاں بھی کرنا پڑیں۔“

ایک گھنٹے بعد میں اے ایس آئی سلیمان شاہ اور دو سپاہیوں کے ساتھ چوہدری شہادت علی کی

میں نے معلوم کر لیا ہے چوہدری صاحب۔“ ملازم نے وضاحت کی ”فیکا اس وقت ڈیرے پر ہے۔“

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا ”ہم ڈیرے پر چلتے ہیں۔“ پھر میں نے چوہدری سے پوچھا ”ڈیرا کس طرف ہے چوہدری صاحب؟“

”نہیں، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔“ چوہدری بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

ہم سب باجماعت ڈیرے کی طرف روانہ ہو گئے۔ ملازم نے جس ڈیرے کا ذکر کیا تھا وہ دریا کے کنارے مغربی جانب واقع تھا۔ اس ڈیرے کے آس پاس چوہدری شہادت علی نے باغات لگا رکھے تھے۔ ہم تھوڑی ہی دیر میں ڈیرے پر پہنچ گئے۔

رفیق حسین عرف فیکا ڈوگر اس وقت ڈیرے پر موجود تھا۔ میں نے اسے ایس آئی سلیمان شاہ کو حکم دیا ”اے گرفتار کر لو۔“

اے ایس آئی اور دو صحت مند سپاہی فیکے کی طرف بڑھے۔ دونوں سپاہیوں نے بغلوں میں ہاتھ پھنسا کر فیکے کو تباہ کیا اور اے ایس آئی نے پلک جھپکتے میں اسے جھکڑی پہنادی۔

فیکا حیرت زدہ نظر سے ہم سب کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے چوہدری شہادت علی سے فریاد کی ”چوہدری صاحب مجھے پھانسیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔“

میں نے کہا ”الو کے پٹھے اگر تم نے کچھ نہیں کیا تو ”ریں ریں“ کیوں کر رہے ہو۔“

چوہدری نے آگے بڑھ کر فیکے کے منہ پر ایک چائنا سید کیا اور خونخوار لہجے میں بولا ”یہ میں کیا سن رہا ہوں فیکے، تم نے ملک صاحب کے سامنے مجھے شرمندہ کر دیا ہے۔“

”میں نے کوئی جرم نہیں کیا چوہدری صاحب۔“

”جرم تم نے کیا کیا کیے ہیں یہ تو تمہیں تھانے چل کر پتا چلے گا۔“ سلیمان شاہ نے اس کی پندلی پر ایک زوردار ٹھنڈا سید کیا۔ ”وہ تمہاری ماں کا یار راجو راکٹ بھی ادھر ہی بند ہے۔“

”راجو راکٹ گرفتار ہو گیا۔“ راجو راکٹ کا نام سن کر فیکے کا رنگ زرد پڑ گیا۔

”اور اس نے ہمیں سب کچھ بتا بھی دیا ہے۔“ میں نے اسے تیز نظر سے گھورتے ہوئے کہا ”اب تم شرافت سے اپنے جرم کا اقرار کر لو ورنہ ہمیں جج اگلو انے کے سوڈھنگ آتے ہیں۔“

چوہدری نے غصیلے لہجے میں فیکے سے پوچھا ”فیکے، ملک صاحب بتا رہے ہیں تم نے پانچ سو روپے دے کر راجو راکٹ سے عارف علی کو قتل کر دیا ہے۔ بولو تم نے ایسا کیوں کیا۔ عارف علی سے

حوالی میں موجود تھا۔ چوہدری نے حسب سابق خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا اور ملازم سے بیٹھک کا دروازہ کھلوانے کو کہا۔

میں نے کہا ”چوہدری صاحب! آج میں بیٹھنے نہیں آیا۔ آپ کا ملازم فیکا کہاں ہے؟“

”فیکا ادھر ہی ہوگا۔“ چوہدری نے جواب دیا ”آپ کو فیکے کی کیا ضرورت پڑ گئی ملک صاحب؟“

میں نے کہا ”چوہدری صاحب! باقی باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ پہلے آپ فیکے کو یہاں بلوائیں۔“

”آپ اندر تو بیٹھیں جناب۔ فیکا بھی آ جاتا ہے۔ چوہدری کا ملازم اس وقت تک بیٹھک کھلوچکا تھا۔ چوہدری نے کہا ”تشریف لائیں ملک صاحب اور مجھے ساری بات بتائیں۔“

ہم چوہدری کی بیٹھک میں آ گئے۔ میں نے چوہدری سے کہا ”ساری بات یہ ہے چوہدری صاحب کہ راجو راکٹ کو ہم نے گرفتار کر لیا ہے اور اس نے عارف علی کے قتل کا اعتراف بھی کر لیا ہے۔“

”یہ تو بہت اچھا ہوا۔“ چوہدری اطمینان بخش لہجے میں بولا ”پھر تو سارا مسئلہ ہی حل ہو گیا۔ آپ فیکے کو کیوں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں؟“

”ابھی یہ مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہوا چوہدری صاحب۔“ میں نے کہا ”راجو راکٹ نے قتل کا اقرار تو کر لیا ہے لیکن اس نے یہ قتل فیکے کے ایما پر کیا ہے۔ وہ شخص اچھا قاتل ہے۔“

”فیکے کی بھلا عارف علی سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟“

”یہ تو فیکا ہی بتائے گا۔“ میں نے کہا ”آپ فوری طور پر اسے یہاں بلا لیں۔ راجو نے بتایا ہے کہ فیکے نے اس قتل کے لیے اسے پورے پانچ سو روپے دیے تھے۔“

”میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“ چوہدری الجھن آمیز لہجے میں بولا ”بہر حال میں فیکے کو بلاتا ہوں۔“

پھر اس نے ایک ملازم کو فیکے کے لیے بھیج دیا۔ اس کے ملازم نے تھوڑی دیر بعد آ کر بتایا ”چوہدری صاحب فیکا حوالی میں نہیں ہے۔“

”حوالی میں نہیں ہے تو پھر کہاں ہے؟“ چوہدری غصے سے دہانزا ”کسی سے پوچھو اس کے بارے میں۔“

تھیں کیا پر غاش تھی؟“

وہ گھٹیانے لگا ”راجوراکٹ جھوٹ بولتا ہے جناب۔ میں تو اس سے ملتا جلتا بھی نہیں ہوں اور..... اور میرے پاس اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے گی۔“

جھوٹ اور سچ کا فیصلہ کرنا ہمیں یہ خوبی آتا ہے۔“ اے ایس آئی سلیمان شاہ نے تیز لہجے میں کہا ”تم تھانے جا کر فر فر بولنے لگو گے۔“

”فیکے نے خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھا پھر چوہدری سے التجا آمیز لہجے میں بولا ”چوہدری جی! خدا کے واسطے مجھے بچالیں۔ میں نے راجوراکٹ سے کوئی بات نہیں کی تھی اور قتل والے معاملے سے تو میرا ذرا سا بھی تعلق نہیں ہے۔“

”پھر کس کا تعلق ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جی..... وہ..... میرا مطلب ہے میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ وہ لکنت آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ وہ کوئی بات کہتے کہتے اچانک بات بدل گیا تھا اس کا مطلب یہی تھا کہ دال میں کچھ کالا تھا۔ کوئی ایسی بات فیکے کی زبان تک آتے آتے رک گئی تھی جو اس کے لیے یا کسی اور کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔

میں نے اے ایس آئی سے کہا ”تم اسے لے کر تھانے پہنچو۔ میں ذرا چوہدری صاحب سے بات کر کے آتا ہوں۔“

سلیمان شاہ اور دونوں سپاہی فیکے کو لے کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ میں چوہدری کے ساتھ واپس اس کی حویلی میں آ گیا۔

چوہدری نے کہا ملک صاحب اگر فیکا واقعی قصود ثابت ہو گیا تو میں خود اسے آپ کے حوالے کروں گا۔ آپ جو چاہیں اس کے ساتھ سلوک کریں۔“

میں نے کہا ”چوہدری صاحب آپ فیکے کو میرے حوالے تو جب کریں گے جب وہ آپ کے پاس ہوگا۔ فیکا تو اب میرے قبضے میں آ چکا ہے۔ دیسے آپ بے فکر رہیں۔ اگر اس نے کوئی جرم نہیں کیا تو میں اس کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔ بہ صورت دیگر میں اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کروں گا۔“

”اللہ آپ کا بھلا کرے۔“ وہ معتدل لہجے میں بولا ”میں ناجائز رہایت کرنے کے لیے آپ

سے کبھی نہیں کہوں گا۔ ویسے میری سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی کہ فیکے کے پاس پانچ سو روپے کہاں سے آئے اور اس نے راجوراکٹ سے عارف علی کو کیوں قتل کر دیا۔ میرے علم میں یہ بات بھی نہیں ہے کہ فیکے کا کوئی تعلق سسلی سے رہا ہو پھر عارف علی سے اس کی دشمنی سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔“

”آپ بہت بھولے ہیں چوہدری صاحب۔“ میں نے کہا ”آپ تو یہ بات بھی نہیں جانتے تھے کہ سسلی اور عارف علی کے سچ کون سی کھڑی پک رہی تھی۔“

وہ ندامت آمیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا ”آپ کی اس بات سے میں اتفاق کرتا ہوں کہ فیکے کے پاس اتنی رقم نہیں ہو سکتی لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ اسے کسی نے یہ رقم مہیا کر دی ہو۔“

”مثال کے طور پر؟“

میں نے کہا ”معاف کیجئے گا چوہدری صاحب میرے خیال میں یہ کام حویلی ہی کے کسی بااثر فرد کا ہو سکتا ہے۔“

”یعنی آپ ہم پر شک کر رہے ہیں؟“

”شک کے بغیر ہمارا کام نہیں چلتا چوہدری صاحب۔“ میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا ”تفتیش کی گاڑی شک کے پٹرول ہی سے رفتار پکڑتی ہے۔“

چوہدری نے کہا ”آپ بلاوجہ ہم پر شک کر رہے ہیں۔ ہم اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ کرائے کے قاتل کے ذریعے کسی بے گناہ شخص کا خون بہائیں۔“

میں نے کہا ”چوہدری صاحب آپ بدگمانی میں مبتلا نہ ہوں۔ میں اپنے فرائض سے مجبور ہوں۔ حالات و واقعات حویلی کے کینوں کو میری نظر میں مشکوک ٹھہرا چکے ہیں۔ اگر راجو راکٹ کا کہنا درست ہے کہ فیکے نے اسے پانچ سو کے عوض عارف علی کو موت کے گھاٹ اتارنے کا کام سونپا تھا تو اس کا واضح مطلب یہی ہوگا کہ فیکے نے حویلی ہی کے کسی شخص کے حکم پر ایسا کیا ہوگا۔“

”حویلی میں تو میں میری بیوی اور میرا بیٹا چوہدری عشرت ہی ہوتے ہیں۔“ چوہدری نے کہا ”باقی سب تو چھوٹے بچے ہیں۔“

”میرا شک بھی تین افراد تک ہی محدود ہے۔“

”ہوں۔“ چوہدری کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ”میں اپنے

بارے میں تو یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ایسا کوئی حکم فیکہ کو نہیں دیا۔ البتہ چوہدری راجن اور عشرت سے میں خود کچھ پریت کر لوں گا۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ آپ کا شک شک ہی ثابت ہوگا۔ راجو راکٹ نے اپنی جان بچانے کے لیے خواہ مخواہ فیکہ نام لے لیا ہوگا۔

”چوہدری صاحب!“ میں نے سنسنائی ہوئی آواز میں کہا ”راجو تو اپنے جرم کا اقبال کر چکا ہے۔ اس کی جان تو اب کسی صورت چھوٹ ہی نہیں سکتی۔ اس لیے اس امکان کو تو خارج ہی کر دیں البتہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ اگر راجو کا بیان غلط ثابت ہوا تو میں فیکہ کو چھوڑ دوں گا۔“

چوہدری کاٹی دیر تک مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ میں حویلی کے کینوں پر خواہ مخواہ شک کر رہا ہوں۔ اس کے جواب میں میں نے اسے یقین دلایا کہ اگر حویلی کے کینوں کے ہاتھ اس معاملے میں صاف ہیں تو انشاء اللہ ان کا بال بھی بانٹا نہیں ہوگا۔

میں داخل ہاتھ پہنچا تو جب تک دوپٹے کئے سپاہی فیکہ کی اچھی خاصی مٹی جھاڑ چکے تھے۔ میں نے اسے اپنے کمرے میں بلالیا اور ساتھ ہی ایک جلا صورت کا نشیل کو بھی طلب کر لیا۔

میں نے فیکہ سے پوچھا ”ہاں“ ”چوہدری کے نمک خوار کچھ یاد آتا ہے؟“

”جناب آپ کے سپاہیوں نے مجھے بہت مارا ہے۔“ وہ گریہ و زاری کرنے لگا ”میں بے قصور ہوں جناب۔ میں نے کسی قتل نہیں کیا۔“

”میں نے کب کہا ہے کہ تم نے اپنے ہاتھ سے قتل کیا ہے۔“ میں نے کانٹیل کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ کانٹیل نے اس کی پندلیوں پر جوتے کی نوک سے نمب لگائی۔ فیکہا بلبلاتا تھا۔ میں نے کہا ”میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ تم نے پانچ سو روپے راجو کو دے کر عارف کی قتل کروایا ہے۔“

”جناب راجو راکٹ جھوٹ بولتا ہے۔“

”جھوٹ بولنے میں اس کا کیا فائدہ ہے؟“

”یہ تو میں نہیں جانتا جناب۔“

”لہٰذا لیے تو میں کہہ رہا ہوں کہ اس نے جھوٹ نہیں بولا۔“ میں نے کہا ”جھوٹ انسان اس وقت بولتا ہے جب وہ کوئی بہت بڑا فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہو یا پھر کسی بہت بڑی بات کو چھپانے کی خاطر جھوٹ کا سہارا لیا جاتا ہے۔ راجو کے معاملے میں یہ دونوں باتیں نہیں ہیں۔ اس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا ہے۔ وہ تو اب سیدھا پھانسی کے تختے پر جا بیچے۔ تمہارا فائدہ اسی میں ہے کہ ہمیں سب کچھ سچ بتا دو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ قتل کا حکم دینے والا بھی قانون کی

نظر میں قاتل ہی گردانا جاتا ہے۔ میں تمہیں سچے کا ایک موقع دے رہا ہوں۔ اگر تم نے کسی کے حکم پر یہ فریضہ سرانجام دیا ہے تو اس کا نام بتا دو۔ ورنہ موت کا پھندا تمہارے گلے میں بھی ڈٹ ہو جائے گا۔“

وہ تھوڑی دیر کے لیے خوف زدہ نظر آیا پھر منت سماجت کرنے لگا ”تھانے دار صاحب۔ میں بالکل بے قصور ہوں۔ مجھے معاف کر دیں۔“

”تم قصور دار کا نام بتا دو میں تمہیں جانے دوں گا۔“

وہ آئیں بائیں شاخیں کرنے لگا۔ فیکہ کے سر پر سوار جلا صورت کا نشیل نے کہا ”ملک صاحب! لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ آپ اسے میرے حوالے کریں۔ میں اس کی زبان کھلواتا ہوں۔“

”مجبوری ہے اب تو یہی کرنا پڑے گا۔“ میں نے فیکہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”یہ ہاتھ پاؤں کی زبان ہی سمجھے گا۔“

کانٹیل نے فیکہ کو کالہ کرتے پکڑا اور ایک زوردار جھکادیتے ہوئے کہا ”چل ادے آگے لگ۔ میں دیکھتا ہوں چوہدریوں کی حویلی میں رہ کر تم پر کتنے سوت چربی چڑھی ہے۔“

میں نے تنبیہی لہجے میں کہا ”فیکہ تم جس کے ساتھ جا رہے ہو اس کے سامنے پتھر بھی بولنے لگتے ہیں۔ اگر تمہاری زبان بھی کھل گئی تو پھر تمہارا چوہدری بھی تمہیں نہیں بچا سکے گا۔ اب جاؤ۔“

”تھانے دار صاحب۔“ وہ ہلچلی لہجے میں بولا ”میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔ مجھے اور نہ ماریں۔“

”اوئے اپنی بے بے کے یا رابھی ہم نے تمہیں مارا ہی کتنا ہے۔“ کانٹیل نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا ”مار کیا ہوتی ہے یہ تمہیں اب پتا چلے گا۔“

میں نے کہا ”اگر تم سچ بولنے کا وعدہ کرو تو میں تمہارے ساتھ رعایت کا وعدہ کرتا ہوں۔“

پھر میں نے کانٹیل کو وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کیا۔ کانٹیل کمرے سے نکل گیا تو میں نے قدرے نرم لہجے میں فیکہ سے کہا ”تم بے فکر ہو کر بولنا شروع کر دو۔“

وہ بولا ”چوہدری صاحب میری کھال کھینچ لیں گے۔“

میں نے کہا ”چوہدری صاحب تو تمہاری کھال بعد میں کھینچیں گے میں تمہیں اس سے پہلے ہی

جیل بھجوادوں کا تم چوہدری صاحب کی فکر نہ کرو۔ اپنی جان کی فکر کرو اور یہ بتاؤ کہ تمہیں پانچ سو روپے کس نے مہیا کیے تھے۔ چوہدری شہادت علی نے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا ”چوہدرائیں نے؟ یا چوہدری عشرت نے؟“

وہ متذنب کا شکار نظر آنے لگا۔ میں نے کہا ”میں تمہیں صرف ایک منٹ دیتا ہوں۔ اگر تم نے مطلوبہ شخص کا نام نہ بتایا تو پھر میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔“

وہ بولا ”جب دونوں طرف موت کھڑی ہے تو پھر میں حرام موت نہیں مڑوں گا۔ اتنا کہہ کر وہ رگ گیا۔

میں نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا ”شاہاش بولتے جاؤ۔“

”تھانے دار صاحب!“ وہ لرزیدہ لہجے میں بولا ”چوہدری عشرت کے حکم پر میں نے راجو راکٹ کو پانچ سو روپے دیے تھے۔“

”اور ساتھ ہی اسے یہ بھی یاد دیا تھا کہ یہ رقم اسے کس مقصد کے لیے دی جا رہی ہے؟“

”جی تھانے دار صاحب۔“ وہ خوف زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ پھر بولا ”آپ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ مجھے بچالیں گے۔“

میں نے کہا ”اگرچہ تمہارا جرم قابل معافی نہیں ہے لیکن میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں۔ میں تمہیں وعدہ معاف گواہ بناؤں گا۔ تمہیں عدالت میں جج کے سامنے بھیجا ہوا نہ رہنا ہوگا۔“

”چوہدری صاحب مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ وہ قاعدہ روئے لگا۔

میں نے کہا ”چوہدری شہادت علی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ میں تمہاری حفاظت کروں گا۔“

پھر میں نے ایک کانسٹیبل کو بلا کر فیکے کو اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا ”اس کو حوالات میں بند کر دو“ وہ فیکے کو لے کر جانے لگا تو میں نے تاکید کی ”اور ہاں اسے راجو سے الگ رکھنا۔“

اسی روز میں چوہدری عشرت کو گرفتار کرنے ایک مرتبہ پھر چوہدری شہادت علی کی جہلی پہنچ گیا۔ چوہدری شہادت علی کو جب پتا چلا کہ عارف علی کے قتل کے احکامات اس کے اپنے فرزند ارجمند نے جاری کیے تھے تو اسے یقین نہیں آیا۔

”یہ نہیں ہو سکتا ملک صاحب۔“ چوہدری نے شپٹائے ہوئے لہجے میں کہا ”عشرت بھلا ایسا کیوں کرنے لگا؟“

”یہ تو میں عشرت سے خود پوچھ لوں گا۔“ میں نے کہا ”فی الحال تو حالات و واقعات اس کے

خلاف جارہے ہیں۔ فیکے نے آپ کے بیٹے کا کچا چٹھا کھول دیا ہے۔“

”اگر ایسا ہے تو میں خود عشرت سے پوچھتا ہوں۔“ چوہدری کی آواز میں لرزش نمایاں تھی۔

میں نے کہا ”چوہدری صاحب! اب یہ معاملہ باپ بیٹے کے درمیان سے قانون اور مجرم کے درمیان چلا گیا ہے۔ آپ خود خواہ پوچھ گچھ کی زحمت نہ کریں۔ ہم ہیں نا اس کام کے لیے۔“

”تو آپ عشرت کو گرفتار کر کے تھانے لے جائیں گے؟“

”ظاہر ہے۔“ میں نے کہا ”میں اسے گرفتار کرنے ہی آیا ہوں۔“

یہ ساری باتیں میرے اور چوہدری کے درمیان حویلی کی بیٹھک میں ہو رہی تھیں۔ اس وقت میرے ساتھ حوالدار جمعہ خان بھی تھا۔

میں نے چوہدری سے کہا ”چوہدری صاحب! آپ عشرت کو یہاں بلا رہے ہیں یا ہمیں حویلی کے اندر جا کر اسے گرفتار کرنا ہوگا؟“

”آپ بیٹھیں، میں اسے یہیں لے کر آتا ہوں۔“

چوہدری کے اٹھنے کے بعد میں نے حوالدار جمعہ خان کو خبردار کیا کہ وہ حویلی کے بیرونی گیٹ پر نظر رکھے۔ چوہدری شہادت علی اگرچہ دوسرے روایتی چوہدریوں کے بالکل خاصا معقول اور انصاف پسند چوہدری تھا۔ تاہم معاملہ اس کے بیٹے کا تھا اس لیے میں اس پر آنکھ بند کر کے بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسی احتیاط کے پیش نظر میں نے پہلے ہی دوسرا لباس سپاہیوں کو حویلی کے عقبی حصے میں بھی متعین کر دیا تھا تاکہ اگر چوہدری عشرت فرار ہونے کی کوشش کرے تو وہ اسے قابو کر لیں۔ دونوں سادہ لباس سپاہی پوری طرح مسلح تھے۔

چوہدری کے بیٹھک سے اٹھ کر حویلی کے اندرونی حصے میں جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی اندر سے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے چوہدرائیں کی آواز کو پہچان لیا۔ وہ چوہدری شجاعت علی سے کہہ رہی تھی ”میں اپنے بیٹے کو نہیں جانے دوں گی۔ آپ تھانے دار کو خریدنے کی کوشش کریں۔“

میں اور حوالدار جمعہ خان بھرمار کر حویلی کے اندرونی حصے میں پہنچ گئے۔ چوہدری عشرت ہمیں اپنے سامنے دیکھ کر بوکھلا گیا اور اس نے ایک جانب بھاگنے کی کوشش کی۔

”جانے نہ پائے جمعہ خان۔“ میں نے گرج کر کہا ”اسے فی الفور گرفتار کر لو۔“

جمعہ خان نے برق رفتاری سے چوہدری عشرت پر چھلانگ لگائی اور آن واحد میں اسے جالیا۔

چوہدری عشرت نے جمعہ خان کی گرفت سے نکلنے کی کوشش میں ہاتھ پاؤں پھینکنا شروع کر دیئے۔ جب کوئی بس نہ چلا تو اس نے حوالدار کی کلائی پر دانت گاڑ دیئے۔ حوالدار جمعہ خان کے طلق سے ایک سسکاری برآمد ہوئی۔ اسی اثنا میں اس نے آگے بڑھ کر عشرت کو لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر جمعہ خان نے عشرت کو تھکڑی پہنا دی۔

میں نے چوہدرائیں کی طرف رخ کر کے زہریلے لیجے میں کہا ”آپ ابھی تھوڑی دیر پہلے کیا فرما رہی تھیں۔ مجھے خریدنے کے لیے کتنی رقم ہے تمہارے پاس؟“

چوہدری شہادت علی گنگ کھڑا یہ تماشا دیکھا ہاتھ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے کھڑے کھڑے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ اس کی حالت کسی ہارے ہوئے جواری سے مختلف نہیں تھی۔

چوہدرائیں میری امت ساجت کرنے لگی ”تھانے دار صاحب! آپ جتنی رقم طلب کریں گے میں دینے کو تیار ہوں۔ آپ میرے بیٹے کو چھوڑ دیں۔ یہ پہلے ہی بہت بڑا صدمہ اٹھا چکا ہے۔“

میں نے کہا ”اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ جو کسی کے لیے گڑھا کھودتا ہے اسے ایک روز خود کھائی میں گرفتار ہوتا ہے۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا ”اور اس بھول میں نہ رہنا چوہدرائیں کی کہ میں رشوت لے کر تمہارے بیٹے کو چھوڑ دوں گا۔ یہ تو گردن تک پھنس چکا تھا..... اور یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر کے اس نے اپنے مجرم ہونے کا ثبوت پیش کر دیا ہے۔ اگر یہ قصور وار نہیں تھا تو اسے پولیس کو دیکھ کر یوں بدکنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”کچھ بھی ہے۔“ چوہدرائیں مصالحت آمیز انداز اختیار کرتے ہوئے بولی ”اگر آپ تھوڑی گنجائش نکالیں تو یہ معاملہ یہیں پر رفع دفع ہو سکتا ہے۔ سب کچھ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ چاہیں تو گھر کی بات گھر میں رہے گی۔ قاتل تو گرفتار ہو ہی چکا ہے۔ عارف علی بھی اب دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتا۔ آپ ہمارے گھر کو برباد ہونے سے بچالیں۔“

اس وقت چوہدری شہادت علی نے گھیر لیجے میں کہا ”ملک صاحب! میں آپ سے یہ تو نہیں کہوں گا کہ آپ کوئی بڑی رقم لے کر معاملے کو ختم کر دیں لیکن میری آپ سے درخواست ہے کہ کوئی دفعہ لگانے سے پہلے اچھی طرح چھان بین ضرور کر لیں۔“

”آپ نکر نہ کریں! میں انصاف کے تقاضے ضرور پورے کروں گا۔“

چوہدرائیں رونے لگی ”چوہدری صاحب! آپ کیسے باپ ہیں۔ اپنے بیٹے کو خود پولیس کے

حوالے کر رہے ہیں۔ آپ کی دولت کس کام آئے گی؟“

”تم اپنی بیکواس بند کرو۔“ چوہدری شہادت علی نے بیوی کو ڈانٹا ”اگر ہمارا بیٹا بے گناہ ہے تو دنیا

کی کوئی طاقت اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ میں سپریم کورٹ تک جاؤں گا۔“

”آپ کہیں نہیں جائیں گے۔“ چوہدرائیں نے پاؤں بیچ کر کہا ”اسی حویلی میں بیٹھے باتیں بناتے رہیں گے۔“

میں چوہدری اور چوہدرائیں کو وہیں چھوڑ کر حویلی سے نکل آیا۔ چوہدری عشرت کی تھکڑی کا دوسرا سرا حوالدار جمعہ خان کے ہاتھ میں تھا۔ سادہ لباس پولیس اہل کاروں نے ہمیں دیکھا تو ہمارے قریب آ گئے۔ ہم گاؤں ہی کے تانگے میں سوار ہوئے اور تھانے آ گئے۔

چوہدری عشرت پر مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ اس نے حوالات میں راجوراکٹ اور ٹیکے کو بھی دیکھ لیا تھا۔ دو چار تھپڑ کھانے کے بعد اس نے سب کچھ قبول کر لیا۔ چوہدری عشرت کے بیان کا خلاصہ یوں ہے۔

کسی طرح چوہدری عشرت کو عارف علی اور سلمیٰ کے تعلقات کا پتا چل گیا تھا۔ عشرت کے لیے سلمیٰ کے رشتے کی بات چل رہی تھی اور عشرت خود بھی اس سے شادی کا خواہاں تھا مگر وہ کہیں اور ہی دل لگائے بیٹھی تھی اور وہ بھی اتنی راز داری کے ساتھ کہ کسی کو مدت تک اس کی خبر ہی نہ ہو سکی تھی۔ چوہدری عشرت کو جب یقین ہو گیا کہ سلمیٰ اس کے ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے تو اس نے ایک روز عارف علی سے بات کی اور اسے اپنا راستہ بدلنے کو کہا مگر عارف علی اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ چوہدری نے پہلے تو اسے لوٹوں کی جھلک دکھائی پھر ڈراپا دھمکایا مگر عارف علی سلمیٰ سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ ہر طرف سے بے بس ہونے کے بعد چوہدری عشرت نے کہا ”ٹھیک ہے اب میں تمہیں دوسرے طریقے سے سمجھاؤں گا۔“

چوہدری عشرت نے عارف علی کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا اس نے تین گھروں کو اجاڑ کر رکھ دیا۔ محبت کرنے والے دودل پیوند خاک ہوئے اور چوہدری عشرت ایک لمبی مدت کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا گیا۔

ٹیکے نے وعدہ معاف گواہ بن کر اپنے سر پر پڑنے والی افتاد سے نجات حاصل کر لی تھی۔ ویسے چوہدری عشرت کا اقبالی بیان بھی کافی تھا۔ چوہدری شجاعت علی نے اپنے بیٹے کے لیے بہت بڑا دیکل کیا تھا لیکن سیشن کورٹ نے راجوراکٹ اور چوہدری عشرت کو سزائے موت کا حکم سنادیا۔ چوہدری

شہادت نے ہائی کورٹ میں اپیل کر دی اور بہ وقت تمام بیٹے کی سزائے موت کو عرقید میں تبدیل کروانے میں کامیاب ہو گیا۔ البتہ راجو راکٹ کا مقدمہ سیشن کورٹ تک ہی محدود رہا اور اس نے پھانسی کی سزا پائی۔

بعض اوقات رقابت کی چنگاری اتنی شدت سے بھڑکتی ہے کہ ایک دیکھتے ہوئے الاؤ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس الاؤ کی آگ جہاں تک پھلتی ہے سب کچھ جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ چودہری عشرت کے دل میں بھڑکنے والی رقابت کی آگ نے کئی افراد کو عبرت ناک انجام سے روکا کر دیا تھا۔



برائے خلش:

کنگن کی چوری کی رپورٹ کنگن پور کے تھانے میں درج کروائی گئی تھی مگر اے ایس آئی مشکور علی تفتیش کرتے ہوئے میرے علاقے میں پہنچ گیا تھا۔ ان دنوں میں بصیر پور (ضلع اوکاڑہ) کے تھانے میں تعینات تھا جبکہ کنگن پور ضلع قصور میں واقع تھا۔

اے ایس آئی مشکور علی کے ساتھ دو افراد اور بھی تھے جن میں ایک کانسٹیبل محمد نذیر اور دوسرا کھوجی خوشی محمد تھا۔ کھوجی خوشی محمد کی عمر پچیس اور ساٹھ کے درمیان رہی ہوگی مگر اس عمر میں بھی وہ خاصا صحت مند اور چاق و چوبند دکھائی دیتا تھا۔ اس کے چہرے پر سب سے زیادہ اہم چیز اس کی آنکھیں تھیں جن سے ذہانت اور بردباری ٹپکتی تھی۔ اسی کے لہجے میں بھی ایک خاص قسم کا اعتماد پایا جاتا تھا۔ اے ایس آئی مشکور علی خوشی محمد کھوجی ہی کی راہنمائی میں بصیر پور پہنچا تھا۔

رسی علیک سلیک کے بعد میں نے اے ایس آئی سے پوچھا ”مشکور علی! کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ تمہارا مطلوبہ بندہ میرے تھانے کی حدود میں موجود ہے؟“

مشکور علی متذبذب لہجے میں بولا ”ملک صاحب! آپ نے خاصا پیچیدہ سوال کر دیا ہے تاہم میں یہی کہوں گا کہ چور آپ کے علاقے میں پہنچا ضرور ہے۔“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا ”اب اس وقت بھی وہ یہاں موجود ہے یا نہیں اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا۔“

خوشی محمد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”تھانے دار صاحب! میری ساری عمر چوروں، ڈکیتوں اور دوسرے مجرموں کا کھڑا اٹھاتے ہوئے گزر گئی ہے۔ میں نے ایسے ایسے مجرم گھڑسواروں کا بھی سراغ لگایا ہے جنہوں نے اپنے گھوڑوں کے پاؤں پر مخصوص قسم کے چرمی تھیلے چڑھا رکھے تھے تاکہ کھرانہ اٹھایا جاسکے۔“ اتنا کہہ کر وہ چند ساعتوں کے لیے خاموش ہوا پھر پُر دھوک لہجے میں بولا ”میرا

تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ننگن پور آنے والا چور آپ کے علاقے میں ہی پہنچا ہے۔ اب یہاں پر بندے کو کیسے تلاشنا ہے تو آپ ہی فیصلہ کریں گے۔ بہر حال میری خدمات ہر وقت حاضر ہیں۔“

میں نے کہا ”خوشی محمد! تمہاری صلاحیتوں سے کام لے کر مجھے خوشی ہوگی۔“

”ملک صاحب! چور کا کھرا اٹھانے کے علاوہ بھی میں نے کچھ تفتیش کی ہے۔“ اے ایس آئی مشکور علی سے بتایا ”واقعات! شواہد اور چند لوگوں کے بیانات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ننگن پور کے تھانے میں جو رپورٹ درج کروائی گئی ہے اس میں مطلوب شخص بذریعہ ترین یہاں پہنچا ہے۔“

میں نے پرسوج انداز میں سر ہلایا اور ٹھوس لہجے میں کہا ”اگر آپ کا مطلوبہ چور میرے علاقے میں ہے تو پھر آپ مطمئن ہو جائیں۔ وہ بچ کر کہیں نہیں جائے گا۔ اس سلسلے میں مجھے آپ کا بھرپور تعاون بھی درکار ہے۔“

”ہم ہر قسم کے تعاون کے لیے سر تاپا تیار ہیں ملک صاحب۔“ اے ایس آئی نے جلدی سے کہا ”آپ سے تعاون کرنے میں سراسر جادہ فائدہ ہے جناب۔“

میں نے سرسری انداز میں پوچھا ”شاہ جی کا کیا حال ہے؟“

”کون شاہ جی۔“ اے ایس آئی نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

اس موقع پر خوشی محمد بول اٹھا ”آپ ولایت شاہ کی بات کر رہے ہیں ملک صاحب!“

”ہاں ہاں وہی شاہ جی۔“ میں نے تصدیق کی۔

خوشی محمد نے کہا ”کچھ عرصہ پہلے شاہ جی کا تبادلہ ہو گیا ہے۔ اب وہ بھکر کے ایک تھانے میں تعینات ہیں۔ آج کل ہمارے تھانے کے انچارج رانا جشید صاحب ہیں۔“ پھر وہ اے ایس آئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ”مشکور علی کو ننگن پور کے تھانے میں آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا اس لیے یہ شاہ جی کے ذکر پر الجھ گیا تھا۔“

ولایت شاہ سے میری اچھی خاصی تعلق داری تھی۔ مجھے اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ اے ایس آئی نے از خود اس کا ذکر نہیں کیا تھا اسی وجہ سے میں نے ولایت شاہ کے بارے میں استفسار کیا تھا۔

ولایت شاہ ایک جی دار اور نڈر پولیس افسر تھا۔ ایک مرتبہ اس نے تن توہا پانچ ڈاکوؤں سے دست بدست مقابلہ کر کے انہیں خاک چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا اور وہ ڈاکو بھی خاصے بڑے کٹھارے پر مشورہ مجرم تھے۔ اس کارنامے پر ولایت شاہ کو حکومت کی طرف سے خصوصی انعام بھی ملا تھا۔ تھانہ ننگن پور کے حوالے سے

میرا ذہن ولایت شاہ کی طرف چلا گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں ولایت شاہ کے تذکرے سے واپس موجود صورت حال کی طرف لوٹ آیا تھا۔

میں نے اے ایس آئی سے سوال کیا ”مشکور علی! تم نے بتایا ہے کہ تمہارے تھانے میں کسی جڑاؤ ننگن کی چوری کی رپورٹ درج کروائی گئی ہے۔ ذرا اس کے بارے میں تفصیلاً بتاؤ۔“

”تفصیل بس اتنی سی ہے جناب۔“ وہ کھٹک کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا ”مسرودہ جڑاؤ ننگن بہت قیمتی ہے۔ اس طلائی ننگن میں بیش قیمت جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔ جن میں نیلم یا قوت زمررد اور یکھراج وغیرہ شامل ہیں اس سے آپ ننگن کی وقعت کا اندازہ لگالیں۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے

ایک گہری سانس لی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”ملک صاحب! میں جس ننگن کا ذکر کر رہا ہوں اسے رکھنے کے لیے اس کی مالک نے ایک خصوصی بکس بنوایا تھا۔ صندوق کی لکڑی سے تیار کردہ وہ نقش بکس بہت ہی خوب صورت اور دیدہ زیب ہے۔ تذکرہ بکس کی لمبائی چوڑائی ایک جیسی ہے جو کہ چھ انچ ہے یعنی وہ ایک چوکور بکس ہے البتہ اس کی اونچائی چار انچ ہے۔“

اے ایس آئی ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا تو میں نے سوال کیا ”مشکور علی! تمہارے ایک جملے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ مذکورہ مسرودہ ننگن کسی عورت کی ملکیت ہے؟“

”آپ کا اندازہ بالکل درست ہے جناب۔“ وہ اثبات میں بولا ”ننگن کی مالک ایک صاحب حیثیت بیوہ ہے جس کا نام دلشاد بیگم ہے۔ وہ ننگن پور کے ایک نزدیکی گاؤں شام کوٹ کی رہنے والی ہے۔ دلشاد بیگم کے مطابق مسرودہ ننگن کی مالیت کم از کم آٹھ ہزار روپے ہوگی۔“

قارئین کی معلومات کے لیے واضح کر دوں کہ اس زمانے کے آٹھ ہزار روپے بہت بڑی رقم تھی۔ آپ آج کل کے پانچ لاکھ روپے سمجھ لیں۔ یہ جن دنوں کا ذکر ہے اس وقت بڑا استادور تھا۔

اول درجے کا سونا نوے روپے تولل جاتا تھا۔ ایک عام آدمی کی ماہانہ آمدنی ساٹھ روپے تک ہوتی تھی۔ ایک متوسط گھر کا پورے مہینے کا سودا تیس پینتیس روپے میں آ جاتا تھا۔ آٹا دو آنے سیر یعنی پانچ

روپے کا من اور اعلیٰ درجے کی صاف ستھری گندم لگ بھگ پونے پانچ روپے سن کے حساب سے

دستا ب تھی۔ ڈیڑھ دو سو روپے میں تو شادی ہو جایا کرتی تھی۔ اب یہ سب باتیں خواب و خیال ہو کر رہ گئی ہیں۔

میں نے اے ایس آئی مشکور علی سے استفسار کیا ”کیا بیوہ دلشاد بیگم نے خود تھانے آ کر رپورٹ درج کروائی تھی یا اس کی طرف سے کوئی اور شخص آیا تھا؟“

”یہ کام اس نے خود ہی کیا تھا جناب۔“ اے ایس آئی نے جواب دیا ”البتہ اس کے ساتھ شام کوٹ ہی کارہنے والا تانگا بان محمد بونا بھی تھانے پہنچا تھا۔ دلشاد بیگم بونا ہی کے تانگے میں بیٹھ کر شام کوٹ سے نکلن پور آئی تھی۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے مزید بتایا ”ہماری معلومات کے مطابق دلشاد بیگم اپنے شوہر کے انتقال کے بعد بالکل تنہا ہو گئی ہے۔ اس کے نہ تو کوئی اولاد ہے اور نہ ہی کوئی قریبی رشتے دار۔ اس کا شوہر امتیاز علی شام کوٹ کا ایک باحیثیت زمین دار تھا۔ کوئی تین سال پہلے ہی اس کا انتقال ہوا ہے۔“

”ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی مشکور علی۔“ میں نے کہا ”اتنے باحیثیت زمین دار کی بیوہ اکیلی کون کیوں کر آ سکتی ہے۔ یقیناً اس کے گھر میں دو چار ملازم تو ضرور ہوں گے۔“

اے ایس آئی نے جواب دیا ”جناب! میں جہاں تک جانتا ہوں شوہر کی وفات کے بعد سے دلشاد بیگم تنہا ہی پسندی کا کار ہو گئی ہے۔ اس نے یکے بعد دیگرے تمام ملازمین کی چھٹی کر دی۔ اس وقت اس کے عالی شان حویلی نما مکان میں صرف ایک ملازمہ ہے۔ جیواں نامی اس عورت کی عمر لگ بھگ چالیس سال ہوگی۔“

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا ”بیوہ دلشاد بیگم کی عمر کیا ہوگی؟“

”وہ پینتیس چھتیس سے زیادہ کی نہیں لگتی جناب۔“

میں نے کہا ”کیا دلشاد بیگم نے کسی شخص پر اپنا شک ظاہر کیا ہے؟“

”ہم نے یہ سوال اس سے پوچھا تھا۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”مگر اس نے کسی خاص آدمی کا نام نہیں لیا، کوئی ایسا اشارہ نہیں دیا جس سے ہمیں تفتیش میں کوئی خاص مدد مل سکتی البتہ اس نے چور کا حلیہ بڑی حد تک بیان کر دیا تھا۔“

میں چونک اٹھا ”کیا دلشاد بیگم نے چور کو دیکھا تھا؟“

”جی ہاں، کسی حد تک۔“ اے ایس آئی نے جواب دیا ”جی تو اس نے چور کا حلیہ بتایا ہے۔“

”اور تم کہہ رہے تھے کہ اس نے کوئی ایسا اشارہ نہیں دیا جو تفتیش میں معاون ثابت ہو۔“ میں نے اے ایس آئی کو گھورا ”بجرم خصوصاً چور اور دزیت کا حلیہ انتہائی اہم ہوتا ہے۔ پچاس فیصد کیس تو اسی سے حل ہو جاتا ہے۔“

وہ بدامت آئیر لہجے میں بولا ”جناب! شاید میں کچھ غلط کہہ گیا تھا۔“

میں نے اے ایس آئی سے اب تک ہونے والی گفتگو سے بخوبی اندازہ لگالیا تھا کہ وہ ایک

روایتی پولیس والا تھا۔ اس میں مجھے ”ٹیلنٹ“ کہیں دکھائی نہیں دیا تھا جبکہ اس کے برخلاف کھونٹی خوشی محمد جہاں دیدہ اور تجربے کا شخص نظر آتا تھا۔ اے ایس آئی ابھی تک خوشی محمد کے بنائے ہوئے رستے پر ہی چل رہا تھا۔ خوشی محمد کی اس عادت نے بھی مجھے متاثر کیا کہ اس نے ایک مرتبہ بھی ہماری بات چیت کے دوران میں مداخلت نہیں کی تھی۔

میں نے خوشی محمد سے پوچھا ”چوری کی یہ واردات کب پیش آئی؟“

”تین دن پہلے جناب۔“ اس نے جواب دیا۔

اس دن اگست کی اٹھارہ تاریخ تھی۔ تین دن پہلے کا مطلب پندرہ اگست تھا۔ پچھلے مہینے یعنی ساون میں بہت زیادہ بارشیں ہوئی تھیں۔ تاہم بھادوں شروع ہوتے ہی برسات کی شدت میں واضح کمی آگئی تھی۔ برسات کے موسم میں کھراٹھانا نامکن کی حد تک مشکل ہو جاتا ہے۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ خوشی محمد کی پیشہ ورانہ مہارت کو کتنے بڑے امتحان سے گزرنا پڑا ہوگا۔ اسی حوالے سے میں نے اس سے سوال کیا۔

”خوشی محمد! تمہیں کھراٹھانا تلاش کرنے میں وقت تو ہوئی ہوگی؟“

”کوئی وقت سی وقت جناب۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”یہ تو اچھا ہوا کہ ساون ختم ہو گیا ورنہ.....“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر چند سیکنڈ تک اے ایس آئی کو دیکھا پھر بولا ”ملک صاحب! ہمیں یہاں تک پہنچانے میں کھرے سے زیادہ چور کے حلیے نے مدد دی ہے۔ اگرچہ دلشاد بیگم نے چور کی ایک ہی جھلک دیکھی تھی تاہم اس کا مشاہدہ حیرت انگیز ہے کیونکہ اس نے بڑی وضاحت کے ساتھ چور کا حلیہ بیان کیا تھا۔“

میں نے اے ایس آئی سے مبینہ چور کے حلیے کے بارے میں استفسار کیا۔ مشکور علی اس کیس میں تفتیشی افر تھا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔

”ملک صاحب! جڑاؤ نکلن چوری کرنے والا شخص دراز قامت ہے۔ اس کا قد لگ بھگ سوا چھ فٹ ہے ہاتھ پاؤں بڑے، صحت مند وجود گھونگر یا لے بال وائیں گال پر سیاہ مساپنے کے برابر گلے میں تین طلائی تعویذ والی سیاہ ڈوڑی سفید چکن کرت لٹھے کا تہ بند اور پاؤں میں دھکی کھسا۔“

اے ایس آئی خاموش ہوا تو میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا ”کیا چوری کی یہ واردات دن دھاڑے ہوئی تھی..... اگر واقعی ایسا ہے تو پھر یہ.....“

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا ”چوری کی واردات تو رات کے آخری پہر ہوئی تھی جناب۔“

پندرہ اگست کی رات کو یعنی سولہ اگست کی صبح۔

”اور تھوڑی دیر قبل تم بتا چکے ہو کہ چور کے طبعی کے بارے میں دلشاد بیگ سے پتا چلا تھا جس نے اتفاق سے چور کی ایک جھلک دکھ لی تھی۔“ میرے لہجے میں طنز اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت تھی ”اگر واقعی ایسا ہی ہے تو پھر تمہاری یہ دلشاد بیگم بڑی حیرت انگیز قوت مشاہدہ کی مالک ہے۔ یہ خدا مجھے یقین نہیں آ رہا۔ کیا تم واقعی سچ کہہ رہے ہو؟“

وہ میری کیفیت کو سمجھتے ہوئے اور اپنی حماقت کو فوراً محسوس کرتے ہوئے جلدی سے بولا ”بات دراصل یہ ہے جناب کہ دلشاد بیگم نے تو ہمیں صرف اتنا بتایا تھا کہ چور اونچے لمبے قد کا مالک اور ایک صحت مند پہلوان نما شخص ہے جس کے بال گھونگھریالے ہیں اور یہ کہ اس نے کرتہ و تہ بند پہن رکھا ہے۔“

”اور طبعی کی باتی بیان کردہ جزئیات؟“

”وہ میری اپنی تفسیر ہے جناب۔“ اے ایس آئی نے جواب دیا۔

اس موقع پر خوشی محمد نے مجھے بتایا ”ملک صاحب! مشکور علی پہلی مرتبہ کسی کیس کی تفتیش تھا کر رہا ہے یعنی اس کیس کا تفتیشی افراد ل آ کر ہیں۔ شاید اسی لیے بڑا گھبراہٹ کا شکار ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں کچھ باتیں آپ کو بتاؤں۔“

”بہتر ہے کہ تم ہی بتاؤ۔“ میں نے کہا۔

وہ بولا ”جناب! جیسا کہ آپ کو بتایا گیا ہے پندرہ اور سولہ تاریخ کی درمیانی رات کے آخری پہر چوری کی واردات ہوئی تھی۔ شام کوٹ کی وسنیک دلشاد بیگم نے دوسری صبح سولہ تاریخ کو تھانہ نگن پور میں چوری کی رپورٹ درج کر دالی اور چور کا سرسری سا حلیہ بھی بیان کر دیا۔ اگلے روز یعنی سترہ تاریخ کو اے ایس آئی اور میں نگن پور ریلوے اسٹیشن پہنچے جہاں سے ایک روز پہلے مبینہ چور ٹرین میں سوار ہوا تھا۔“

میں نے پوچھا ”آپ لوگ سترہ اگست کو کیوں نگن پور ریلوے اسٹیشن پہنچے سولہ تاریخ ہی کو یہ کام کیوں نہ کر ڈالا؟ اور آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ مبینہ چور شام کوٹ کے ایک گھر سے جزاؤ طلائی نگن چور اگر نگن پور کے ریلوے اسٹیشن سے ٹرین میں سوار ہوا تھا؟“

”میں اسی طرف آ رہا ہوں جناب۔“ کھوجی بابا خوشی محمد تھم لہجے میں بولا ”جناب! سولہ تاریخ کو شام تک ہم چور کا کھراٹھاٹھانے میں مصروف رہے تھے۔ شام کوٹ میں واقع دلشاد بیگم کے گھر

سے لے کر ریلوے اسٹیشن نگن پور تک میں نے بڑی محنت کی اپنا پورا تجربہ کام میں لایا اور یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ ہمارا مطلوبہ بندہ اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوا تھا۔“

اے ایس آئی نے کہا ”اس کے بعد کی تفصیل میں بتاتا ہوں جناب!“

اے ایس آئی کی مداخلت پر خوشی محمد خاموش ہو گیا۔ مشکور علی نے کہا شروع کیا ”ملک صاحب! سولہ اگست کی تاریخ میں ہم نے یہ پتا چلا لیا تھا کہ مبینہ چور شام کوٹ سے نگن پور ریلوے اسٹیشن پہنچا تھا۔ میں نے رات کو اپنی کارگزاری کی رپورٹ رانا صاحب (رانا جمشید) کو تھانے جا کر دی۔

انہوں نے مجھے کم دیا کہ ریلوے اسٹیشن جا کر وہاں لوگوں سے پوچھ گچھ کروں۔“

”حالانکہ اس کام کے لیے کسی حکم کی ضرورت نہیں تھی۔“ میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا ”تمہیں چاہیے تھا کہ اس شام واپس تھانے جانے کے بجائے تم ریلوے اسٹیشن پر پوچھ تاچہ کرتے۔“

وہ میرے لہجے کی کاٹ کو محسوس کرتے ہوئے شرمندہ لہجے میں بولا ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب۔“ بولتے ہوئے وہ ایک ایسا شخص دکھائی دیتا تھا جس کی حماقت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو ”تھانے دار رانا جمشید صاحب نے مجھے ڈانٹ بھی پلائی تھی اور کہا تھا کہ اگلی صبح میں ضرور اسٹیشن جا کر مبینہ چور کا سراغ لگانے کی کوشش کروں۔“

اے ایس آئی نے اپنی بات مکمل کی تو مجھے ایک شب گزرا۔ پتا نہیں کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دانستہ خود کو احق ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کی آنکھیں بعض اوقات چغلی کھاتی تھیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں بلکہ وہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ایک ایک قدم آگے بڑھ رہا ہو۔ میں نے اس سلسلے میں کافی سوچا لیکن اپنے محسوسات کی تصدیق کے لیے مجھے کوئی واضح اشارہ نہ ملا چنانچہ میں نے سردست اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور اے ایس آئی مشکور علی کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”ملک صاحب! رات کو مجھے خود بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ واقعی مجھے اس شام پلیٹ فارم پر موجود ٹھیلے والوں سے اور قلیوں وغیرہ سے مبینہ چور کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیے تھا۔ تاہم یہ سوچ کر میں نے خود کو مطمئن کر دیا کہ اگلی صبح میں سیدھا نگن پور کے ریلوے اسٹیشن کا رخ کروں گا۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا ”ملک صاحب! کچھ بات یہ ہے کہ میں کچھ نزوس ہو گیا تھا۔ دراصل پہلا پہلا کیس ہے نا اس لیے۔“

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر ہونٹوں کی طرح مجھے دیکھنے لگا۔ میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا۔ میں نے عام سے لہجے میں دریافت کیا ”اچھا یہ بتاؤ اگلی صبح یعنی کل صبح ننگن پور کے ریلوے اسٹیشن پر تم نے کون سا تیر مارا؟“ کل صبح سے میری مراد گزری ہوئی سترہ تاریخ کی صبح تھی۔

وہ بولا ”جناب! میں نے دلشاد بیگم کا بیان کردہ حلیہ جب منظور احمد کو تفصیلاً بتایا تو اس کا چہرہ روشن ہو گیا۔ میں سمجھ گیا کہ منظور احمد نے ہمارے مطلوبہ بندے کو ضرور دیکھا ہوگا۔“

”یہ منظور احمد کون ہے؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”منظور احمد ٹیڑھا پرنا یا ربیلی ہے۔“ اے ایس آئی نے بتایا ”ادھر ننگن پور کے ریلوے اسٹیشن کے ایک فارم پر اس کا چائے کا اشال ہے۔ ایک پیسٹری اور بسکٹ وغیرہ بھی ملتے ہیں اس کے اشال پر۔۔۔۔۔“

وہ منظور احمد کی مزید تفصیل میں جانا چاہتا تھا لیکن میں نے اس کی بات قطع کی اور پوچھا ”منظور احمد سے تمہیں کیا معلوم تھا؟“

”منظور احمد نے تصدیق کی تھی کہ ایسا ایک شخص سولہ اگست کو صبح وہاں آیا تھا۔“ مشکور علی نے بتایا ”اس شخص نے منظور احمد سے چائے اور ایک پیسٹری خریدا تھا۔ رواروی میں منظور نے اس سے پوچھ لیا تھا کہ وہ کہاں جا رہا تھا۔ اس شخص نے منظور کو بتایا کہ وہ بصیر پور جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔“ ایک لمبے کودہ سانس لینے کے لیے رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”یہ بات مجھے منظور ہی سے پتا چلی تھی کہ مذکور شخص کے دائیں گال پر چنے کے برابر سیاہ مسامی تھا اور اس کے گلے میں تین طلائی تعویذ والی سیاہ ڈوری بھی تھی۔ ازیں علاوہ منظور نے یہ بھی بتایا کہ اس شخص نے پاؤں میں دو کھسکا پہن رکھا تھا۔“

ابتدا کہہ کر مشکور علی خاموش ہو گیا۔ جواب میں میں بھی خاموش رہا تو اس نے اپنے ہاتھ کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ”میں منظور احمد کے پاس تھوڑی دیر رک کر پلیٹ فارم کی رونق کو دیکھنے لگا۔ اسی دوران میں منظور کا ایک دوست لیاقت خان بھی وہاں آ گیا۔ منظور نے لیاقت سے پوچھا کہ آیا اس نے ہمارے مطلوبہ بندے کو دیکھا تھا۔ لیاقت نے تصدیق کر دی کہ اس نے نہ صرف مبینہ چور کو دیکھا تھا بلکہ اس سے مختصر بات چیت بھی کی تھی۔ لیاقت نے اس سے ٹکٹ وغیرہ کے لیے پوچھا تھا جس کے جواب میں اس نے لیاقت کو بتایا کہ وہ ٹکٹ حاصل کر چکا ہے۔ لیاقت خان کے استفسار پر اس شخص نے یہی بتایا تھا کہ وہ ننگن پور سے سیدھا بصیر پور جا رہا تھا۔ میں نے جب لیاقت خان سے دو چار

سوالات کیے تو مجھے پتا چلا کہ اس شخص کے ہاتھ پاؤں غیر معمولی طور پر لمبے تھے۔ قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا جبکہ اس کے جوتے کا نمبر ساڑھے نو یا دس سے کم نہیں تھا۔ لیاقت خان نے دلشاد بیگم کے بیان کردہ حلیے کی بھی پوری تصدیق کی تھی۔“

اے ایس آئی مشکور علی کا طویل بیان ختم ہوا تو میں نے سوال کیا ”مشکور علی! تمہیں کل صبح یعنی سترہ اگست کو یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ تمہارا مطلوبہ مبینہ ننگن چور ننگن پور سے بصیر پور آیا تھا تو پھر تم کل ہی یہاں کیوں نہیں آ گئے۔ یہ پورے چوبیس بلکہ تیس گھنٹے کی تاخیر کیوں؟“

وہ تامل کرتے ہوئے بولا ”وہ بات دراصل یہ ہے جناب کہ کل خوشی محمد میرے ساتھ نہیں تھا۔ رانا صاحب نے مشورہ دیا کہ میں خوشی محمد کو ضرور اپنے ساتھ رکھوں کیونکہ بصیر پور ریلوے اسٹیشن پر اترنے کے بعد مبینہ چور کا سراغ لگانے کے لیے مجھے قدم قدم پر خوشی محمد کی ضرورت تھی اس لیے مجھے خوشی محمد کی واپسی کا انتظار کرنا پڑا جو اپنی بیٹی سے ملنے موضوع کو ٹھکا گیا ہوا تھا۔“

اے ایس آئی میرے ہر سوال کا جواب اس طرح دے رہا تھا جیسے اسے پہلے سے معلوم ہو کہ میں کیا پوچھنے والا ہوں اور وہ اپنی مرضی کا جواب سوچ لیتا ہو۔ اس کا یہ انداز مجھے میکانیکی اور مصنوعی سا لگا۔ مجھے ایک بار پھر محسوس ہوا کہ جیسے اے ایس آئی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بول رہا ہو۔ تاہم میں کوشش کے باوجود بھی اس کے مقصد تک نہیں پہنچ سکا تھا۔

وہ بتا رہا تھا ”ملک صاحب! کل رات کو خوشی محمد واپس ننگن پور آیا اور میں آج اسے اپنے ساتھ بصیر پور لے آیا ہوں۔“

خوشی محمد نے کافی دیر کے بعد لب کشائی کی ”مگر میرا آنا نہ آنا برابر ہو گیا جناب۔ ہم صبح جیسے ہی ٹرین میں بیٹھے ہلکی پھلکی بوند ابارندی شروع ہو گئی پھر جب ٹرین انٹاری کے اسٹیشن پر پہنچی تو باقاعدہ بارش شروع ہو گئی۔ پانچ چھ دن سے بارش رکی ہوئی تھی۔ خدا کی قدرت ایسی ہوئی کہ بصیر پور پہنچتے پہنچتے اچھی خاصی بارش ہو چکی تھی۔ اب آپ خود ہی بتائیں اس موسلا دھار بارش میں کسی کے پاؤں کا کھر ملنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے!“

”مگر ہم نے ہمت نہیں ہاری ملک صاحب!“ اے ایس آئی نے پر جوش لہجے میں کہا ”میں نے پوچھ گچھ کا سلسلہ جاری رکھا اور مجھے معلوم ہو گیا کہ ہمارا مطلوبہ بندہ بصیر پور کے ریلوے اسٹیشن پر ضرور اتر ہے اور اسٹیشن کی عمارت سے نکل کر پیدل ہی ایک طرف گیا ہے۔“

”یہ معلومات تم نے کس طرح حاصل کی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

وہ خیر لہجے میں بولا ”بصیر پور کے ریلوے اسٹیشن کے باہر ایک متوسط درجے کا ہوٹل ہے جس کے مالک کا نام ناظم علی ہے۔ ہوٹل کا نام ”نعت کدہ“ ہے۔ یقیناً آپ نے بھی دیکھا ہوگا۔ میں نے ناظم علی سے سوال وجواب میں معلوم کر لیا کہ ہمارے مطلوبہ مبینہ نگن چور نے اس کے ہوٹل میں کچھ دیر رک کر چائے وغیرہ پی تھی۔ ناظم علی نے مجھے بتایا ہے کہ اس شخص کے پاس ایک جھوٹی سے پوٹلی بھی تھی۔ میرا خیال ہے وہ صندی بکس اس پوٹلی میں ہوگا۔ ہوٹل کے نزدیک ہی سگریٹ کی ایک دکان ہے۔ دکان کے بجائے کھوکھا کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اس کھوکھے کے مالک طالب حسین نے بھی تصدیق کی ہے کہ ہمارے بیان کردہ جیلے کے ایک شخص نے سولہ اگست کے دن اس سے سگریٹ کا ایک پیکٹ خریدا تھا۔“ وہ تھوڑے سے توقف کے بعد کہنے لگا ”ملک صاحب! یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ ہمارا مطلوبہ چور آپ کے ملاتے میں پہنچا ہے۔ اب چور کو تلاش کرنا آپ کا کام ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ بھر پور تعاون کریں گے۔“

میں نے کہا ”آپ کے مطابق نگن چور کو برآمد کر کے آپ کے حوالے کرنے میں مجھے خوشی محسوس ہوگی لیکن اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ وہ شخص ہمیں کارہنہ والا ہے یا یہ کہ وہ ابھی تک بصیر پور ہی میں موجود ہے۔“

”یہ بتانا تو آپ کا کام ہے جناب۔“ مشکور علی نے کہا ”میرے لیے آپ جو حکم کریں میں کرنے کو تیار ہوں بلکہ میں نے تو ابھی ابھی فیصلہ لیا ہے کہ جب تک مبینہ چور کا سراغ نہیں لگ جاتا میں اور کانسٹیبل محمد نذیر یہیں بصیر پور ہی میں رہیں گے البتہ خوشی محمد کو واپس بھیجنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔“

”مجھے تمہارے یہاں رکنے پر کوئی اعتراض نہیں مشکور علی۔“ میں نے عام سے انداز میں کہا پھر ایک فوری خیال کے تحت پوچھا ”مشکور علی! تم نے بتایا ہے کہ سولہ اگست کو مبینہ چور نے بصیر پور پہنچنے کے بعد سگریٹ کے ایک کھوکھے سے سگریٹ وغیرہ خریدا ہے تھے..... طالب حسین سگریٹ والے ہے۔“

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”جی ہاں! آپ چاہیں تو اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔“

”تم کہہ رہے ہو تو ٹھیک ہی کہہ رہے ہو گے۔“ میں نے کہا ”مجھے تمہارے کہے پر پورا بھروسہ ہے۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ مبینہ چور نے کون سے برائے کے سگریٹ خریدے تھے۔ کیا تم نے دکان دار سے اس بارے میں کوئی سوال کیا تھا؟“

”جی ملک صاحب! میں نے طالب حسین سے اس بارے میں پوچھا تھا۔“ مشکور علی نے کہا ”اس کے مطابق ہمارے مطلوبہ چور نے قیمتی مارکہ سگریٹ کا ایک پیکٹ خریدا تھا۔“

میں نے سگریٹ کا برائے اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا۔ اس سے پہلے میں مبینہ نگن چور کا مکمل علیہ دشا دیگم کے کوائف اور جانے وقوعہ کے بارے میں تمام ضروری نکات بھی اپنی ڈائری میں درج کر چکا تھا۔

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ”مشکور علی! اگر تمہارا مطلوبہ بندہ میرے علاقے ہی کا رہنے والا ہے تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ پک کر نہیں جائے گا۔“

”بس جی ملک صاحب! یہ میرا پہلا کیس ہے اس لیے بھی آپ کے تعاون کی بہت ضرورت ہے مجھے۔“ وہ عاجزی سے بولا ”اگر میں اس امتحان میں پاس ہو گیا تو تمہارا انچارج رانا جشید کی نظر میں میرا ایک مقام بن جائے گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے اپنے ہی ایک جونیئر کے طور پر سمجھتے ہوئے میری بھرپور راہنمائی کریں گے۔“

”انشاء اللہ۔“ میں نے پورے وثوق سے کہا۔

اے ایس آئی کے انداز میں اگرچہ عجز و انکسار پایا جاتا تھا لیکن لا شعور طور پر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اداکاری کر رہا ہو۔ میں نے ایک دو مواقع پر پہلے بھی ایسا ہی محسوس کیا تھا تاہم اس کی واضح اور معقول وجہ نہ ہونے کے سبب میں نے اپنے خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد اے ایس آئی نے کانسٹیبل محمد نذیر اور کھوجی خوشی محمد کو واپس نگن پور بھیج دیا۔ اس نے خود اکیلے ہی میرے پاس رکنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے تھانے ہی میں اس کے سنجی بسترے کا انتظام کر دیا۔ سامان کے نام پر اس کے پاس صرف ایک بیگ تھا جو کسی جھولے سے مشابہ تھا۔

کانسٹیبل اور کھوجی کے جانے کے بعد میں نے اے ایس آئی سے پوچھا ”مشکور علی! تفتیش کا میرا اپنا ایک علیحدہ انداز ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی کارروائی کا آغاز کروں تم مجھے وہ تمام باتیں بتا دو جو اب تک بتانے سے رہ گئی ہیں۔“

”میرے خیال میں تو میں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔“ وہ پیشانی کو مسلتے ہوئے بولا ”مبینہ چور کے بارے میں میں مزید کچھ نہیں جانتا۔“

”میرا مطلب ہے نگن اور نگن کی مالک دشا دیگم کے بارے میں؟“

”نگن کے بارے میں میں نے آپ کو پوری تفصیل بتادی ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ”دشاد بیگم کے حوالے سے میری معلومات بھی محدود ہیں میں بس اتنا ہی جانتا ہوں کہ تین سال پہلے اس کے شوہر امتیاز علی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ بالکل تنہا ہو گئی ہے۔“

”امتیاز علی کا انتقال کس طرح ہوا تھا؟“

”میں سمجھا نہیں جناب!“ اس نے حیرت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

میں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ”میرا مطلب ہے امتیاز علی طبعی موت مرا تھا یا کوئی حادثہ وغیرہ۔“

”نہیں جناب!“ اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے میری بات کاٹ دی اور بولا ”امتیاز علی کو کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تھا۔ اس کی موت کا سبب دل کا جان لیوا دورہ تھا۔ حرکتِ قلب بند ہونے سے وہ چل بسا تھا۔“

میں نے پوچھا ”تم نے بتایا تھا کہ امتیاز علی کی کوئی اولاد وغیرہ بھی نہیں ہے اور نہ ہی دونوں میاں بیوی کا کوئی زردکی رشتہ دار ہے۔“

”جی ہاں میں نے یہی بتایا تھا۔“ اے ایس آئی نے جواب دیا ”میری معلومات تو یہی ہے جناب۔“

میں نے کہا ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ امتیاز علی کے انتقال کے بعد تمام جائیداد اور زمین کی وارث دشاد بیگم ہی ٹھہری ہوگی۔“

”یہ تو ظاہری بات ہے جناب۔“

میں نے کہا ”تمہارے بیان کے مطابق امتیاز علی خاصا باحیثیت زمین دار تھا۔ اس کی زمینوں کا کچھ اندازہ ہے تمہیں؟“

”مجھے پتا چلا ہے کہ امتیاز علی کی کوئی پچاس ایکڑ کے اریب قریب زرعی زمین ہے جس میں سے بیس ایکڑ شام کوٹ میں اور باقی تیس ایکڑ دیگر مختلف علاقوں میں ہے۔“

”ہوں۔“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اے ایس آئی نے پوچھا ”آپ کیا سوچ رہے ہیں جناب؟“

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر دیا ”مشکور اس بارے میں تم نے اچھی طرح دشاد بیگم سے پوچھ لیا تھا نا کہ یہ چوری کسی پرانی دشمنی کا شائبہ تو نہیں؟“

”میں نے بہت کرید کر پوچھا تھا جناب۔“ وہ تسلی آمیز انداز میں بولا ”دشاد بیگم نے کسی بھی شخص پر اپنے شک کا اظہار نہیں کیا۔“

اے ایس آئی مشکور علی کی عمر لگ بھگ تیس سال تھی۔ وہ متناسب قد کا مالک ایک خوب روخص تھا۔ اس کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی کشش پائی جاتی تھی۔ اس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ گورے چنے چہرے پر ہلکی ہلکی مونچھیں بڑی بھلی دکھائی دیتی تھیں۔

میں لگ بھگ دو گھنٹے تک گھما پھرا کر اس سے مختلف سوال پوچھتا رہا اور اس کے جوابات میں پائی جانے والی اہم باتوں کو اپنے پاس نوٹ کر لیا۔ میں جب نگن والے صندوق بکس کے بارے میں پوچھ رہا تھا تو اس نے چوتھے ہوئے ایک اہم انکشاف کیا۔

”ملک صاحب!“ وہ پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا ”ایک بات تو میں آپ کو بتانا بھول ہی گیا۔“ پھر وہ نفی میں گردن ہلانے لگا۔ انداز ایسا تھا جیسے اسے کسی وجہ سے انسو ہو رہا ہو۔

”ایسی کیا بات ہے بھئی؟“ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

وہ جزبہ ہوتے ہوئے بولا ”ملک صاحب! دشاد بیگم نے بتایا تھا کہ بکس کے جس خانے میں طلبائی جزاؤ نگن رکھا جاتا ہے اس کے نیچے ایک خفیہ خانہ بھی ہے اور اس خفیہ خانے میں اس کا ایک خاص کاغذ بھی موجود ہے۔“

”خاص کاغذ!“ میں نے زیر لب دہرایا ”کس قسم کا خاص کاغذ؟“

”کوئی دستاویز وغیرہ جناب۔“

”کیوں پہیلیاں بھجوا رہے ہو مشکور علی۔“ میں نے بیزارگی سے کہا ”کھل کر بتاؤ کس نوعیت کی دستاویز اس جیولری بکس میں موجود تھی؟“

وہ دھامت آمیز لہجے میں بولا ”جناب! میں اس سلسلے میں آپ سے معذرت ہی کر سکتا ہوں۔

آپ یقین کریں میں اس دستاویز کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نے دشاد بیگم سے پوچھا تھا لیکن اس نے کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ بس اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ کوئی اہم قانونی کاغذ ہے۔ ممکن ہے جناب وہ زمین جائیداد سے متعلق کوئی اہم دستاویز ہو۔“

”ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔

اس کے بعد بھی ہمارے درمیان نگن اور دشاد بیگم کے موضوع پر بات چیت ہوتی رہی۔ رات کے کھانے کے بعد میں نے اے ایس آئی کو آرام کرنے کے لیے اس کے بستر تک پہنچا دیا اور خود

ایس آئی آدمی رات کے بعد بے خبر سو گیا تھا پھر جیسے ہی اس کی آنکھ کھلی، میں اس کے پاس چلا گیا۔ اسی وقت اس نے مجھے بتایا تھا کہ اسے ایک نہایت ہی ضروری کام یاد آ گیا تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا ”ملک صاحب! مجھے تو یوں لگتا ہے وہ ضروری کام اسے خواب میں نظر آیا ہوگا۔“ میں نے کانٹیل کی رائے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور اسے جانے کی اجازت دے دی۔ اے ایس آئی کے اچانک چلے جانے سے میں عجیب سی الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ ایک خیال ذہن میں یہ آتا تھا کہ فوری طور پر کنگن چور کے سلسلے میں کوئی عملی قدم اٹھاؤں دوسرا خیال یہ تھا کہ مشکور علی کی واپسی کا انتظار کروں پھر میں ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔ مشکور علی کے انتظار میں وقت ضائع کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے ایک کانٹیل کو بھیج کر اپنے تھانے کے اے ایس آئی خورشید خان کو اپنے پاس بلایا۔ خورشید کی آمد پر میں نے تفصیلاً اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ سپنہ نامعلوم کنگن چور کا حلیہ اسے ذہن نشین کروانے کے بعد کہا ”خورشید! اس شخص کو بصیر پور میں تلاش کرنا ہے۔ تم تو یہیں بصیر پور کے رہنے والے ہونا!“

”جی ملک صاحب!“ اس نے اثبات میں جواب دیا ”میں جلدی پستی بصیر پور کا رہنے والا ہوں مگر بصیر پور بھی کوئی چھوٹا سا علاقہ نہیں ہے۔ مطلوبہ بندے کا سراغ لگانے میں کچھ وقت تو لگے گا۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے پوچھا ”کیا یہ بندہ بھی بصیر پور کا ہی وسنیک ہے یا کنگن پور کا رہنے والا ہے؟“

میں نے مشکور علی سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں جواب دیا ”اس بات کی تو تصدیق ہو گئی ہے کہ مبینہ چور کا تعلق کنگن پور سے نہیں ہے مگر وہ بصیر پور کا رہنے والا ہے یا نہیں اس بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ یہ بھی تمہیں ہی معلوم کرنا ہوگا۔“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے کہا ”خورشید خان! تمہیں جتنے آدمیوں کی ضرورت ہو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ مذکورہ شخص سولہ اگست کو بصیر پور ریلوے اسٹیشن پہنچا تھا۔ اس نے ناظم علی نامی شخص کے ہونٹوں ”نعت کدہ“ سے کچھ کھایا پیا بھی تھا اور طالب حسین سگریٹ فروش سے قینچی مار کر سگریٹ کا ایک پیکٹ بھی خریدا تھا۔ تم ناظم علی اور طالب حسین سے بھی پوچھنا چھ کر سکتے ہو۔“

”اوکے سرا میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔“ خورشید خان نے کہا۔

”شاباش۔“ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا ”مجھے امید ہے تمہاری یہ کوشش ضرور کامیاب ہوگی۔“

تھانے کے پچھواڑے اپنے سرکاری کوارٹر میں چلا آیا۔

دوسری صبح جب میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو مجھے پتا چلا کہ اے ایس آئی مشکور تھانے میں موجود نہیں تھا۔ وہ علی الصباح وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔ یہ اطلاع مجھے میرے تھانے کے ایک کانٹیل طارق نے دی تھی۔ وہ ان دنوں شبینہ ڈیوٹی پر تھا۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا۔

”ملک صاحب! اس وقت ابھی پوری طرح اجالا بھی نہیں پھیلا تھا کہ مہمان اے ایس آئی چلا گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ملک صاحب کو اس کے بارے میں کیا بتایا جائے تو اس نے جواب دیا کہ ملک صاحب کو یہی بتایا جائے کہ اسے ایک نہایت ہی ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ اور یہ کہ وہ آج ہی کو وقت واپس آ جائے گا۔“

اے ایس آئی کی حرکت مجھے ناگوار گزری تھی۔ اگر اسے جانا ہی تھا تو کم از کم مجھے تو بتا جاتا۔ میں اذان فجر کے وقت بیدار ہو جاتا تھا اور یہ بات میں نے اسے رات ہی میں بتادی تھی۔ میں نے کانٹیل سے پوچھا۔

”طارق! کیا مہمان نے یہ بتایا تھا کہ وہ کہاں جانے کا ارادہ رکھتا تھا؟“

”جی ملک صاحب!“ طارق نے جواب دیا ”اس نے بتایا تھا کہ وہ واپس کنگن پور جا رہا تھا۔“

میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چند لمحے بعد طارق سے پوچھا ”کیا اس کا سامان وغیرہ تھانے ہی میں رکھا ہوا ہے؟“

”نہیں جناب وہ اپنا تھیلہ بھی ساتھ لے گیا ہے۔“

”تمہاری تورات کی ڈیوٹی ہے نا طارق۔“ میں نے کانٹیل کے چہرے پر لڑکھاتے ہوئے کہا ”اور ڈیوٹی کا مطلب ہوتا ہے جاگنا۔ مسلسل جاگنا۔“

”جی ملک صاحب! میں اپنی ڈیوٹی کے دوران میں ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوں۔“ وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا ”میں پوری رات جاگتا رہا ہوں۔“

”پھر تو تمہیں یہ اچھی طرح معلوم ہوگا کہ مہمان اے ایس آئی نے گزشتہ رات آرام سے سو کر گزاری تھی یا۔۔۔“

میں نے دانستہ جملہ ادھر اچھوڑ دیا کانٹیل جلدی سے بولا ”ملک صاحب! آپ کو تو پتا ہی ہے تھانے میں مجھ پر اتنی تعداد میں موجود ہیں کہ آرام سے سونا ناممکنات میں سے ہے تاہم مہمان اے

تھوڑی دیر کے بعد وہ میرے کمرے سے چلا گیا۔ میں روزمرہ کے کام نمٹانے میں مصروف ہو گیا پھر اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب پندرہ منٹ بعد ہی اے ایس آئی خورشید دوبارہ میرے پاس آیا اور یہ اطلاع دی۔

”ملک صاحب! بندے کا سراغ مل گیا ہے۔“

”وہ کیسے بھئی؟“ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”جناب! اس لنگن چور کا نام رب نواز ہے اور بصیر پور میں رہتا ہے۔“ اے ایس آئی نے انکشاف انگیز انداز میں بتایا۔

میں نے کہا ”تمہاری فراہم کردہ اطلاع حیرت زدہ کر دینے والی ہے مگر یہ تو بتاؤ تم نے یہ سب کچھ کس طرح معلوم کر لیا۔ پندرہ منٹ میں تم انکیشن سے ہو کر تو نہیں آ سکتے۔ تم نے کون سا جادوی ذریعہ استعمال کیا ہے؟“

”جناب! میں تو تھانے کی چوہی ہی سے باہر نہیں گیا۔“

”پھر..... پھر کیسے معلوم کر لیا؟“ میری حیرت دو چند ہو گئی۔

اے ایس آئی خورشید خان نے میری حیرت اور کیفیت کو بھانپتے ہوئے بتایا ”میں نے تھانے سے روانہ ہونے سے قبل حوالدار عید محمد سے سرسری تذکرہ کیا تھا۔ وہ بوجھ بیٹھا تھا کہ میں کہاں جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اسے اپنے ارادے سے آگاہ کر کے میں نے اچھا کیا یا برا اس کا تو مجھے اندازہ نہیں مگر اس کے نتائج خاصے امید افزا اور مفید برآمد ہوئے ہیں۔“ اے ایس آئی ماسٹر نے لہجے کو رکھ کر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”ملک صاحب! حوالدار عید محمد ”چک گنڈا سنگھ“ کا رہنے والا ہے۔ میں نے جب اسے مبینہ لنگن چور کا حلیہ بتایا تو وہ فوراً بول اٹھا کہ اس حلیے پر رب نواز سولہ آنے پر اترتا ہے۔ رب نواز پہلے چک گنڈا سنگھ بھی رہتا تھا۔ پچھلے چند سالوں سے وہ بصیر پور میں ہے۔“

”بصیر پور میں کہاں..... کس جگہ؟“ میں نے اضطرابی انداز میں دریافت کیا۔

جواب میں خورشید خان نے کہا ”ملک صاحب! آپ حوالدار عید محمد کو یہاں بلا لیں۔ یہ بات وہ زیادہ بہتر طور پر بتا سکتا ہے۔“

اے ایس آئی کی بات معقول تھی۔ میں نے فوراً حوالدار کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ میں نے مختصر تمہید کے بعد حوالدار سے سوال کیا ”عید محمد! کیا تمہیں یقین ہے کہ ہمارا مطلوبہ بندہ تمہارا بیان کردہ رب نواز ہی ہے؟“

”جناب حلیے کے حساب سے تو وہ رب نواز ہی ہو سکتا ہے۔“

”رب نواز تمہارے علاقے چک گنڈا سنگھ کا رہنے والا ہے نا؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ملک صاحب! حوالدار نے جواب دیا ”وہ چند سال پہلے تک چک گنڈا سنگھ ہی میں رہتا

تھا مگر اب یہیں بصیر پور میں پایا جاتا ہے۔“

”یہاں وہ کیا کرتا ہے، تمہیں معلوم تو ہوگا؟“

”یہاں وہ ملک دلدار کی چاکری میں ہے۔“

”کون ملک دلدار؟“

”ملک دلدار بصیر پور کی معروف شخصیت ہے جناب۔“ اے ایس آئی خورشید نے بتایا ”بہت

ہی طاقت ور زمین دار ہے وہ۔“

”کیا یہ وہی دلدار ہے جو آئندہ انکیشن میں حصہ لے رہا ہے۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے سوال

کیا۔

”بالکل وہی جناب۔“ حوالدار نے کہا ”کہا جا رہا ہے کہ ملک دلدار یہ انکیشن ضرور جیتے گا۔ اس

نے اپنے حریفوں میں سے دو کو اپنی طاقت کا ”استعمال“ کر کے بٹھا دیا ہے۔ اس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ ہر ناممکن کام کو ممکن کر سکتا ہے۔ اب تو انکیشن میں زیادہ عرصہ باقی نہیں رہا۔ بڑی دھوم دھام سے تیاریاں ہو رہی ہیں۔“

میں نے ملک دلدار کے بارے میں سن رکھا تھا کہ وہ زبردست سیاسی چالیں چلنے کا ماہر تھا۔

مجھے بصیر پور کے اس تھانے میں تعینات ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ ملک دلدار سے ابھی میری بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

میں نے حوالدار عید محمد اور اے ایس آئی خورشید خان کو باری باری مخاطب کرتے ہوئے کہا

”اب تم دونوں اس منصوبے پر کام کرو گے۔ کسی تیسرے کو کانوں کان خبر نہیں ہونا چاہیے۔ تم نے جلد

از جلد یہ معلوم کر کے مجھے بتایا ہے کہ آیا سولہ اگست کو لنگن پور سے بصیر پور تک ٹرین میں سفر کرنے

والا شخص ہمارا مطلوبہ لنگن چور رب نواز ہی تھا یا کوئی اور شخص تھا اور اگر رب نواز نہیں تھا تو پھر یہ ضرور

معلوم کیا جائے کہ وہ پندرہ اور سولہ اگست کی درمیانی شب کہاں تھا؟ آپ میری بات کا مطلب سمجھ

رہے ہونا؟“

”جی بالکل سمجھ رہے ہیں۔“ انہوں نے بیک زبان کہا۔

میں نے مختصر احوالدار کو بھی نگن کی چوری کے بارے میں آگاہ کر دیا پھر ضروری ہدایات کے بعد انہیں رخصت کر دیا۔ اگر نگن پور کے تھانے والوں کا مطلوبہ شخص یہی رب نواز ہی تھا تو پھر یہ کیس حل ہونے کے قریب ہی تھا۔ میں نگن چور کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک مجھے ایک خیال نے چونکا دیا اور وہ خیال یہ تھا کہ رب نواز کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنے کے لیے عید محمد اکیلا ہی کافی تھا۔ خورشید خان کو اس طرف نہیں جانا چاہیے تھا۔ اس سے رب نواز کو کوئی شک گزر سکتا تھا۔

میں نے فوری طور پر معلوم کر دیا کہ وہ دونوں تھانے سے نکل چکے ہیں یا نہیں۔ اتفاق سے وہ دونوں ابھی تھانے ہی میں تھے۔ میں نے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ وہ اس بلاوے پر حیران تھے۔

میں نے پہلے خورشید خان کو مخاطب کیا ”تم صرف اسٹیشن کی طرف جاؤ گے اور حوالدار تمہارے ساتھ نہیں جائے گا۔ تمہیں اکیلے ہی ”نعت کدہ“ کے مالک ناظم علی اور سگریٹ فروش طالب حسین سے مل کر معلومات حاصل کرنا ہوں گی۔ اس کے علاوہ تم اسٹیشن کے اندر بھی جاؤ گے اور ممکن حد تک نامعلوم نگن چور کے بارے میں جاننے کی کوشش کرو گے۔“

”جو حکم ملک صاحب نے اے ایس آئی خورشید خان نے فرمان برداری سے کہا۔

”اور تم عید محمد!“ میں نے والددار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اپنے واقع رب نواز سے ملنے ملک دلدار کے ٹھکانے پر جاؤ گے۔ تم سادہ لباس میں جاؤ گے۔ رب نواز کسی زمانے میں تمہارے گاؤں میں رہتا تھا اس لیے وہ تم پر شک نہیں کر سکتا۔ تم اس سے دوستانہ حوال میں ملو گے اور اپنے مخصوص ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے حقیقت حال جاؤ گے۔ کوشش کرو گے۔ خاص طور پر یہ بات معلوم کرنا ہوگی کہ پندرہ اور سولہ اگست کی درمیانی شب رب نوازی کیا سروریاں رہی تھیں۔“

حوالدار عید محمد نے کہا ”آپ فکری نہ کریں ملک صاحب۔ میں یہ کام بہت آسانی سے کر لوں گا۔“

میں نے ایک مرتبہ پھر ان دونوں کو رخصت کر دیا۔

شام کے وقت اے ایس آئی خورشید خان میرے کمرے میں داخل ہوا۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ مہمان اے ایس آئی مشکور علی کی فراہم کردہ اطلاعات صد فی صدی درست تھیں۔ رب نواز جیسا طیارہ رکھنے والے ایک شخص نے ”نعت کدہ“ سے چائے پانی پیا تھا اور طالب حسین سے سگریٹ کا پیکٹ بھی خریدا تھا۔ یہ دونوں افراد چونکہ رب نواز کو ذاتی طور پر نہیں جانتے اس لیے نگن چور کی شناخت بہ حیثیت رب نواز نہیں ہو سکی۔

میں خورشید خان سے بات چیت کر ہی رہا تھا کہ حوالدار بھی واپس آ گیا۔ اس کے چہرے پر دبا دبا جوش پایا جاتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی بڑی خبر لایا تھا۔

”ہاں! بھئی عید محمد!“ میں نے اسے مخاطب کیا ”کیا رہا؟“

”ایک اچھی خبر ہے“ اس نے بتایا ”مگر میں کچھ الجھا ہوا ہوں۔“

”تم خبر سناؤ۔ تمہاری الجھن کو میں دور کر دوں گا“ میں اپنی کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

حوالدار نے بتایا ”ملک صاحب! پندرہ اور سولہ اگست کی درمیانی شب رب نواز بصیر پور میں

نہیں تھا۔“

”پھر کہاں تھا؟“ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

”وہ دیپال پور گیا ہوا تھا۔“

”دیپال پور میں کس جگہ؟“

”موضوع قلعہ تارا سنگھ“ حوالدار نے جواب دیا۔

دیپال پور (ضلع اوکاڑہ) سے شام کوٹ (ضلع قصور) کافی فاصلے پر واقع ہے۔ اگر رب نواز وقوعہ کی رات موضوع قلعہ تارا سنگھ میں موجود تھا تو پھر نگن کی چوری کے حوالے سے اس پر شک کمزور ہو جاتا تھا۔ میں نے ایک فوری خیال کے تحت حوالدار سے سوال کیا۔

”عید محمد! کیا یہ معلوم ہو سکا ہے کہ رب نواز قلعہ تارا سنگھ کیوں گیا تھا؟“

”اس کے ایک دوست کی شادی تھی وہاں“ عید محمد نے جواب دیا ”وہ ملک دلدار سے ایک دن

کی چٹھی لے کر گیا تھا۔“

میں نے پوچھا ”تم نے یہ ساری معلومات کس طرح حاصل کی ہیں؟“

”بس جناب ہے میرا بھی اپنا ایک طریقہ کار“ اس نے ہنسنا جواب دیا۔

”کیا تم ملک دلدار سے ملے تھے؟“ میں نے استفسار کیا۔

حوالدار نے نفی میں سر ہلایا۔

”رب نواز سے تو یقیناً تمہاری ملاقات ہوئی ہوگی!“

”نہیں جناب!“ اس نے دوبارہ نفی میں سر ہلایا ”رب نواز ملک دلدار کی حویلی میں موجود نہیں

تھا۔ ملک دلدار نے اسے کسی ضروری کام سے موضوع کوٹ زمان شاہ بھیجا ہوا ہے۔“

موضوع کوٹ زمان شاہ بصیر پور ہی میں تھا۔ میں نے کہا ”عید محمد! تم ملک دلدار کی حویلی میں

داخل ہوئے بغیر اور رب نواز سے ملے بنا خاصی مفید معلومات جمع کر لائے ہو۔“

”بس ملک صاحب اتفاق سے حویلی کے باہر ایک ایسا بندہ مل گیا جو ملک دلدار کی ایکشن کی تیاریوں میں پیش پیش ہے۔ میں نے حشمت اللہ نامی اس شخص سے ٹھوڑی دیر گپ شپ کی اور باتوں ہی باتوں میں رب نواز کے بارے میں چند اہم باتیں پوچھ لیں۔“

ہم تینوں نگن چور نامعلوم شخص اور ملک دلدار کے کے ملازم رب نواز کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے کہ ایک کانسیبل نے میرے کمرے میں آ کر اطلاع دی۔

”ملک صاحب! اے ایس آئی مشکور علی نگن پور سے واپس آ گیا ہے اور فوری طور پر آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“

”اے اندر بھیج دو“ میں نے بے ساختہ کہا۔

چند لمحوں کے اندر مشکور علی میرے سامنے ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے سرسری علیک سلک کے بعد پوچھا ”بھئی! اچانک کہاں تائب ہو گئے تھے؟“

”بس جی! کچھ بات ہی ایسی ہو گئی تھی کہ مجھے آپ کو بتائے بغیر یہاں سے جانا پڑ گیا“ وہ قدرے شرمندہ لہجے میں بولا۔

میں نے کہا ”ایسی کیا بات ہو گئی تھی آخر؟“

اس نے جواب دینے سے پہلے باری باری ہم تینوں کے چہروں کو دیکھ کر ہنسی بکھپاتے ہوئے بولا ”چنانچہ آپ لوگوں کو میری بات کا یقین بھی آئے گا یا نہیں۔ مجھے لگتا ہے آپ میرا مذاق اڑائیں گے۔“

”ہم تمہارا مذاق اڑائیں گے یا تمہیں سراہیں گے“ میں نے ٹھہرنا نہ ہوئے لہجے میں کہا ”پہلے اپنے بارے میں بتاؤ تو سہی۔ ایسی کیا مجبوری تھی کہ تمہیں صبح سویرے اٹھ کر لگا گنا پڑا؟“

وہ تامل کرتے ہوئے بولا ”ملک صاحب! دراصل میں نے گزشتہ رات ایک معنی خیز خواب دیکھا تھا۔“

مشکور علی کی بات سن کر میرا دھیان کانسیبل طارق کے تیسرے کی طرف چلا گیا تھا۔ اس نے بھی کچھ ایسی ہی بات کی تھی کسی خواب وغیرہ کا حوالہ دیا تھا۔ طارق کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ مشکور علی کوئی ضروری کام یاد آ جانے پر علی الصباح نگن پور روانہ ہو گیا تھا۔

میں نے اے ایس آئی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”مشکور علی! میرے ایک کانسیبل نے مجھے

بتایا تھا کہ تمہیں کوئی ضروری کام یاد آ گیا تھا اس لیے تم فوراً نگن پور چلے گئے تھے مگر اب تم بتا رہے ہو کہ تم نے کوئی ایسا دیرا خواب دیکھا یا تھا۔ یہ کیا چکر ہے بھئی؟“

وہ جریز ہوتے ہوئے بولا ”جناب! صبح میں بہت جلدی میں تھا اس لیے کانسیبل کو میں نے ضروری کام کہہ کر ٹال دیا تھا لیکن حقیقت یہی ہے کہ میں خواب کی وجہ سے نگن پور گیا تھا۔“

”ایسا کیا خواب دیکھا یا تھا تم نے؟“

”آپ مذاق تو نہیں اڑائیں گے نا!“

”چلو، نہیں اڑائیں گے تمہارا مذاق“ میں نے تشفی آمیز انداز میں کہا ”اب بتاؤ کیا خواب دیکھا تھا؟“

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا ”جناب! میں نے خواب میں دلشاد بیگم کو دیکھا تھا“ اس کا انداز خاصا پر اسرار تھا۔

”دلشاد بیگم..... یعنی جڑاؤ نگن کی مالک؟“

”جی بالکل وہی دلشاد بیگم!“ وہ جلدی سے بولا۔

”وہ خواب میں تم سے کیا کہہ رہی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر ہماری جانب ایسی نظر سے دیکھا جیسے اسے خدشہ ہو کہ ہم اس کی بات سن کر تسخراڑائیں گے۔ جب ہم پوری توجہ سے اس کی جانب متوجہ رہے تو اس نے بتایا۔

”دلشاد بیگم نے خواب میں مجھ سے کہا تھا کہ وہ جان چکی ہے کہ میں نگن چور کی تلاش میں نگن پور سے بصیر پور پہنچ گیا ہوں۔ بصیر پور کے حوالے سے وہ مجھے کوئی خاص اہم بات بتانا چاہتی تھی اس لیے اس نے مجھے فوراً نگن پور بلایا تھا۔“

”دلشاد بیگم وہ خاص بات تمہیں خواب میں بھی تو بتا سکتی تھی“ میں نے نہایت سنجیدگی سے دریافت کیا ”اس نے تمہیں نگن پور جانے کو کیوں تھا؟“

”خواب کے مسائل بہت بے چیدہ ہوتے ہیں جناب!“ وہ مفکرانہ انداز اختیار کرتے ہوئے بولا ”پھر سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے خواب میں اس سے زیادہ سوال و جواب نہیں کیے اور اس کی ہدایت پر فوراً نگن پور روانہ ہو گیا۔“

میں نے فروئی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے سوال کیا ”پھر دلشاد بیگم نے تمہارے نگن پور پہنچنے پر کون کون سے انکشافات کیے ہیں مشکور علی؟“

مشکور علی نے جواب دیا ”ملک صاحب! جب میں ننگن پورا اپنے تھانے پہنچا تو اس وقت دشاہ بیگم رانا صاحب کے پاس تھانے میں موجود تھی۔ اگر وہ وہاں نہ پائی جاتی تو میرا ارادہ سیدھا شام کوٹ جانے کا تھا تا کہ خواب کے حوالے سے اس سے بات کر سکوں۔ کانشیل محمد نذر اور کھوجی خوشی محمد نے رانا صاحب کو بصیر پور والی صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ رانا صاحب نے دشاہ بیگم کو بتایا تھا کہ ننگن چور ننگن پور سے بذریعہ ٹرین بصیر پور پہنچا ہے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی دشاہ بیگم نے سوالیہ انداز میں مجھے دیکھا اور پوچھا کہ کیا میں نے ننگن چور کر پکڑ لیا ہے؟ اس کے سوال کے جواب میں میں نے بتایا کہ ننگن چور انشاء اللہ بہت جلد قانون کی گرفت میں آ جائے گا۔ پھر میں نے خواب کے حوالے سے دشاہ بیگم کو سب کچھ بتا دیا۔ میری پوری بات سننے کے بعد وہ بولی کہ خواب تو بس خیال ہی ہوتا ہے۔ چلو اچھا ہو کہ آپ بصیر پور ہی میں رکنے کے بجائے ننگن پور چلے آئے۔ جب سے مجھے پتا چلا ہے کہ ننگن چور بصیر پور سے تعلق رکھتا ہے اس وقت سے میرا ذہن الجھن کا شکار ہے۔ بار بار میرے دماغ میں ایک نام گونج رہا تھا ہے۔ یہ نہیں مجھے اس کا ذکر کرنا چاہیے یا نہیں۔ دشاہ بیگم کی اس بات پر رانا جشید صاحب نے اس سے کہا کہ اس کے دماغ میں جو نام پریشانی پیدا کر رہا ہے وہ اسے اپنی زبان پر ضرور لائے۔ ممکن ہے اس سے کچھ مدد مل سکے۔ اس پر دشاہ بیگم نے کہا کہ ہمیں بصیر پور کی معروف سیاسی شخصیت ملک دلدار کی طرف سے ہوشیار رہنا چاہیے۔“

اتنا کہہ کر اے ایس آئی خاموش ہو گیا۔ ملک دلدار کے ذکر نے مجھے مضطرب کر دیا تھا۔ میں نے جلدی سے پوچھا ”ملک دل دار کا موجودہ کیس سے کیا تعلق ہو سکتا ہے اس بارے میں دشاہ بیگم نے کچھ بتایا ہے؟“

مشکور علی نے کہا ”میں نے یہی سوال دشاہ بیگم سے کیا تھا اور اس نے جواب میں بتایا تھا کہ ملک دلدار کسی زمانے میں اس کے مرحوم شوہر کا دوست ہوا کرتا تھا پھر کسی معاملے پر ان دونوں میں ان بن ہو گئی اور ان کا ملنا جلنا ختم ہو گیا۔ امتیاز علی کے انتقال کے بعد تو ملک دلدار نے کسی اصول کر بھی شام کوٹ کا رخ نہیں کیا تھا۔“

قارئین کرام! آپ شام کوٹ اور ننگن پور کے تذکرے سے کسی الجھن کا شکار نہ ہوں۔ اس زمانے میں موضوع شام کوٹ کو تھانہ ننگن پور ہی لگتا تھا۔ آج کل کا مجھے پتا نہیں۔ دشاہ بیگم موضوع شام کوٹ کی رہنے والی تھی اور ننگن کی چوری والے کیس کے سلسلے میں ننگن پور تھانے میں اس کی آمد و رفت رہتی تھی جس کے لیے عوامادہ تانگا استعمال کرتی تھی۔

میں نے پوچھا ”مشکور علی! کیا دشاہ بیگم ننگن کی چوری کے سلسلے میں ملک دلدار پر اپنے شک کا اظہار کر رہی ہے؟“

”اس نے واضح طور پر تو شک کا اظہار نہیں کیا“ مہمان اے ایس آئی نے بتایا۔ ”البتہ دلدار کی طرف سے محتاط اور ہوشیار رہنے کی بات کی ہے۔“

اس وقت میرا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ یہی کیفیت اے ایس آئی خورشید خان اور حوالدار عمید محمد کی بھی تھی۔ بیگم دشاہ نے ملک دلدار کے حوالے سے ہوشیار رہنے کو کہا تھا۔ ننگن چور جو ممکن طور پر رب نواز ہو سکتا تھا وہ ملک دلدار کا خاص ملازم تھا۔ اور وہ پندرہ اور سولہ اگست کی درمیانی شب بصیر پور میں نہیں تھا۔ اگرچہ اس کے بارے میں پتا چلا تھا کہ وہ اپنے کسی دوست کی شادی میں قلعہ تارا سنگھ (دیپال پور) گیا ہوا تھا لیکن میں ممکن تھا کہ وہ قلعہ تارا سنگھ جانے کے بجائے سیدھا شام کوٹ (ننگن پور) پہنچا ہو اور رات کی تاریکی میں ننگن چور کر بصیر پور آ گیا ہو۔ اگر یہ سب کچھ ایسا ہی تھا جیسا بیان کیا گیا ہے تو پھر یہ بات یقینی تھی کہ ننگن کی چوری کے پیچھے ملک دلدار کا ہاتھ تھا مگر اس نتیجے پر پہنچنے سے پہلے رب نواز کو ”چیک“ کرنا ضروری تھا۔ اب تک مجھے رب نواز کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا تھا اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ملک دلدار کا وفادار ملازم تھا۔

اس کیس کی بہت سی کڑیاں آپس میں مل گئی تھیں۔ چند کڑیاں باقی تھیں۔ اگر وہ بھی مل جاتیں تو یہ زنجیر مکمل ہو سکتی تھی۔ مجھے سوچ میں ڈوب دیکھ کر مہمان اے ایس آئی نے پوچھا۔

”ملک صاحب! آپ نے اب تک کوئی کارروائی ڈالی یا نہیں؟“

میں نے چوتھے ہوئے کہا ”کارروائی ڈالنے کا وقت آ گیا ہے مشکور علی!“

پھر میں نے اسے مختصر آرب نواز کے بارے میں بتایا۔ میری بات سننے کے بعد وہ جوشیلے لہجے میں بولا ”پھر دیر کس بات کی ہے جناب! ہم ابھی چلتے ہیں ملک دلدار کی حویلی پر۔“

”ہم فوری طور پر وہاں نہیں جا سکتے مشکور علی!“ میں نے کہا۔

”وہ کیوں ملک صاحب!“

”بس سمجھ لو کہ میں سردست ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔“

”اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟“ مشکور علی نے پوچھا۔

”میں نے کہا اس کی دو بڑی وجوہات ہیں۔“

”مثلاً کون کون سی؟“

عید محمد نے واپس آ کر مجھے بتایا کہ رب نواز کوٹ زمان شاہ سے لوٹ آیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی عید محمد نے یہ اطلاع بھی دی کہ ملک دلدار بہ ذات خود حویلی میں موجود نہیں تھا۔ پوچھنے پر اسے بتا چلا تھا کہ ملک دلدار ارد گرد کے گاؤں کا سیاسی دورہ کرنے گیا تھا تاکہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ دوث دینے کے لیے ذہنی طور پر ہم دار کر سکے۔ دودن کے اس دورے میں ملک دلدار نے قلعہ دیوانہ چورستہ میاں خان روہیلہ تاجے کا چک شاہ محمد بودا، مرزا پورا دردیال پور وغیرہ جانا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ آئندہ دودن تک ہم ملک دلدار سے ملاقات نہیں کر سکتے تھے۔

اس صورت حال نے مجھے الجھا دیا تھا۔ میرے تھانے کے اے ایس آئی خورشید خان نے کہا ”ملک صاحب! یہ اچھا موقع ہے۔ ملک دلدار دودن کے لیے بصیر پور سے باہر گیا ہوا ہے۔ اس دوران میں ہم رب نواز پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔ ملک دلدار کی مداخلت کا اندیشہ بھی نہیں ہوگا۔ اس طرح ہم رب نواز سے حقیقت حال جاننے میں کامیاب ہو جائیں گے۔“

”تمہاری بات دل کو لگ رہی ہے خورشید خان!“ میں نے تائیدی لہجے میں کہا پھر خانہ پری کے لیے مشکور علی سے پوچھا ”تمہارا کیا خیال ہے بھئی؟“

میرے استفسار پر مشکور علی جیسے بہ جیسں دکھائی دینے لگا، ہچکچاتے ہوئے لہجے میں بولا ”ملک صاحب! اس طرح کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو جائے گی؟“

”کیسی گڑبڑ مشکور علی؟“

”مم..... میرا مطلب ہے.....“ وہ اکتے ہوئے بولا ”اگر واقعی نگن کی چوری ملک دلدار کے ایما پر کی گئی ہے تو رب نواز پر ہاتھ ڈالنے سے ملک دلدار ہوشیار ہو سکتا ہے۔“

”تمہارے خیال میں ہمیں براہ راست ملک پر ہاتھ ڈالنا چاہیے۔“

”جی ہاں! میرا یہی خیال ہے“ مشکور علی نے سر کو تائیدی جنبش دی۔

”اور اس کے لیے ہمیں کم از کم دودن انتظار کرنا ہوگا“ میں نے پرسوج لہجے میں کہا ”لیکن میں دودن تک ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتا۔ مشکور علی! ملک دلدار جب واپس آئے گا تو اسے بھی دیکھ لیں گے۔ پہلے ذرا رب نواز کی خبر تو لے لیں۔“

اے ایس آئی خورشید خان نے کہا ”ملک صاحب! اگر آپ کا حکم ہو تو میں رب نواز کو پکڑ کر تھانے لے آؤں؟“

”ہاں بھئی! یہ کام ضرور کرو“ میں نے اسے اجازت دیتے ہوئے کہا ”اور اپنے ساتھ دو کانسیلیو

میں نے معتدل لہجے میں جواب دیا ”پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس وقت رب نواز ملک دلدار کی حویلی پر موجود نہیں۔ ملک نے اسے کسی ضروری کام سے کوٹ زمان شاہ بھیجا ہوا ہے۔“

”کوئی سیاسی کام ہی ہوگا“ مشکور علی سچ میں بول پڑا ”سنا ہے ملک دل دار آئندہ الیکشن میں حصہ لے رہا ہے!“

”بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا ہے بھئی!“ میں نے کہا پھر دوبارہ اپنی بات کی طرف آتے ہوئے بتایا ”مشکور علی! فوری طور پر ملک دل دار کی حویلی نہ جانے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ میں اس پر کچا ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتا۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں جناب!“ مشکور علی کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

میں نے رساتی لہجے میں کہا ”بات یہ ہے مشکور علی کہ میں جب پوچھنا چھ کے لیے ملک دلدار کی حویلی جاؤں گا تو میری خواہش ہوگی کہ اگر ضرورت پڑے تو میں اس کی حویلی کی خلاشی بھی لوں اور اس کے لیے سرج وارنٹ کا ہونا ضروری ہے جو کل صبح ہی عدالت سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ملک دلدار جیسے طاقتور سیاسی آدمی پر بڑی پلاننگ سے ہاتھ ڈالنا ہوگا کیا سمجھتے تم؟“

”بالکل سمجھ گیا جناب!“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”آپ نے رب نواز کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے اور دلشاد نیگم نے ملک دلدار کے حوالے سے جو نشانہ ہی کی ہے اس کی روشنی میں مجھے پورا یقین ہے کہ جڑاؤ نگن کی چوری میں ملک دلدار ہی کا ہاتھ ہے۔“

”ہم رات گئے تک نگن اور ملک دلدار کے بارے میں باتیں کرتے رہے پھر میں آرام کرنے کی غرض سے اپنے سرکاری کوارٹر میں چلا گیا۔“

دوسری صبح میں سرج وارنٹ حاصل کر کے عدالت نہ جا سکا۔ تھانے میں ملے کا ایک کیس آ گیا تھا۔ نہری پانی کی تقسیم کے سلسلے میں دو چھوٹے زمیں داروں میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ دونوں طرف سے خاصا جانی نقصان ہوا تھا۔ اس معرکے میں چار افراد زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ دونوں پارٹیاں تھانے میں موجود تھیں۔ میں نے فوری ضروری کارروائی کر کے چند افراد کو گرفتار بھی کر لیا تھا۔ اس معاملے کو سیدھا کرتے کرتے دوپہر ہو گئی۔ مجھے جب سر کھانے کی فرصت ملی اس وقت دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ عدالت کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ اب آئندہ روز ہی سرج وارنٹ حاصل کیا جاسکتا تھا۔ تاہم شام کے وقت میں نے حوالدار عید محمد کو ملک دلدار کی حویلی کی طرف روانہ کیا تاکہ تازہ ترین صورت حال کا اندازہ ہو سکے۔

بھی لے جاؤ۔“

خورشید خان اسی وقت اٹھ کر چلا گیا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ مہمان اے ایس آئی کو میرا یہ فیصلہ پسند نہیں آیا تھا۔ میں اس موقع پر مشکور علی کی ولداری نہیں کر سکتا تھا۔ کام کرنے کا میرا اپنا ایک انداز تھا اور میرا خیال تھا کہ میں نے رب نواز کو تھانے بلانے کا بد وقت فیصلہ کیا تھا۔ مشتہ افراد کو ڈھیل دینا کیس بگاڑنے کے مترادف تھا۔

حوالدار تھوڑی دیر کے لیے اٹھ کر کمرے سے باہر گیا تو مہمان اے ایس آئی نے مجھ سے پوچھا ”ماک صاحب! آپ رب نواز سے کس قسم کے سوالات کریں گے؟“

مجھے اس کا یہ سوال ناگوار گزارا تاہم میں نے اپنی ناپسندیدگی کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کسی کی وقت مشکور علی مجھے ایک احسن پولیس والا نظر آتا تھا اور کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ خود کو بے وقوف ظاہر کرنے کی اداکاری کر رہا ہو۔ اس کی شخصیت ایک بڑے تضاد کا شکار تھی۔ معلوم نہیں اس تضاد میں اس کی فطرت کا کتنا حصہ تھا اور خود اس کا اپنا کتنا حصہ تھا۔

میں نے قہر انداز میں جواب دیا ”مشکور علی! میں رب نواز سے تمہارے سامنے ہی پوچھ گچھ کروں گا۔ تم خود دیکھ لینا میں کس قسم کے سوالات کرتا ہوں۔“

”آپ بھی سوچتے ہوں گے میں خواہ مخواہ آپ کے معاملات میں دخل دیتا ہوں؟ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا ”اگر آپ کو میری کوئی بات بری لگی ہو ملک صاحب تو میں معافی چاہتا ہوں۔“ یہ اس کا ایک اور نیا انداز سامنے آیا تھا۔ میں نے سوچا ”مشکور علی ایک پراگندہ طبع شخص ہے جو مختلف مواقع پر مختلف قسم کے رویے کا مظاہرہ کرتا ہے۔ میں نے اس کے مسئلے کو اپنے ذہن سے پوری طرح جھٹکتے ہوئے کہا۔

”مشکور علی! بے فکر ہو تمہاری کوئی بات مجھے بری نہیں لگی“ پھر اس کی تسلی کے لیے میں نے کہا ”تم اگر گاہے بگاہے میرے معاملات میں مداخلت کرتے ہو تو تمہیں اس کا استحقاق حاصل ہے۔ درحقیقت یہ تمہارا ہی معاملہ ہے جواب ہمارا مشترکہ معاملہ بن گیا ہے۔ یہ کیس دو تھانوں کی مدد سے حل ہوگا۔ تھانہ کنگن پور اور تھانہ بصیر پور کا پورا اعلان اس وقت ایک پلیٹ فارم پر جمع ہے۔ اور وہ پلیٹ فارم ہے طلائی جزاؤں کنگن کی تلاش۔“

میری اس وضاحت پر وہ مطمئن نظر آنے لگا۔

اسی وقت حوالدار عید محمد کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے بھی تھی جس میں

چائے دانی کے علاوہ چار کپ بھی موجود تھے۔

چائے پینے کے دوران میں ہمارا موضوع گفتگوب رب نواز نہیں تھا، نہ ہی ہم نے طلائی جزاؤں کنگن کے بارے میں بات کی تھی۔ ہمارے درمیان پولیس، قانون، قانون شکنی اور جرائم کی بڑھتی ہوئی شرح پر تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔

غروب آفتاب سے چند منٹ قبل رب نواز کو تھانے پہنچا دیا گیا۔ تاہم اسے ہتھکڑی لگائے بغیر تھانے لایا گیا تھا۔ میں نے مہمان اے ایس آئی مشکور علی اور حوالدار عید محمد کو اپنے کمرے میں رکنے کے لیے کہا اور رب نواز کی جانب متوجہ ہو گیا۔

رب نواز اس خلیے پر صد فی صد پورا اترتا تھا جو میں نے اپنی ڈائری میں نوٹ کر رکھا تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ تیس سال رہی ہوگی۔ وہ ایک گہرو جوان تھا اور ڈیل ڈول سے کوئی پہلوان ہی نظر آتا تھا۔ وہ اپنے تھانے بلائے جانے پر خاصا حیران دکھائی دیتا تھا۔

میں نے اسے سر تا پا گہری نظر سے دیکھا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا ”رب نواز! کیا تم جانتے ہو کہ تمہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟“

”تھانے دار صاحب!“ وہ حیرت آمیز لہجے میں بولا ”میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی کہ آپ نے مجھے تھانے کیوں بلایا ہے۔“

”دیکھ رب نواز!“ میں نے سناتے ہوئے لہجے میں کہا ”میں ذرا دوسری قسم کا تھانے دار ہوں۔ جو لوگ میرے ساتھ تعاون کرتے ہیں، میں انہیں ہر ممکن رعایت دیتا ہوں مگر جو لوگ مجھے چکر دینے کی کوشش کریں اور میرے سوالات کے جواب میں غلط بیانی سے کام لیں ان کے ساتھ میں بہت برا سلوک کرتا ہوں۔“ ایک لمحے کو رک کر میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ”اب یہ تم پر منحصر ہے کہ میں تمہارے ساتھ کون سا رویہ اختیار کروں۔“

وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا ”میں تو یہی چاہوں گا جناب کہ آپ میرے ساتھ نرمی کا رویہ اپنائیں۔“

”اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ مکمل تعاون کرنا ہوگا۔“

”میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں جناب۔“

”فی الحال تم صرف اتنا تعاون کرو کہ میرے ہر سوال کا ٹھیک اور سچا جواب دو۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ بولا ”آپ پوچھیں جناب کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کی توقع پر پورا اتر سکوں۔“

وہ ابھی تک بڑی شرافت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کی وضع قطع سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک اکھڑ مزاج شخص ہوگا۔ ایسے لوگ تعاون کے لیے آسانی سے تیار نہیں ہوتے۔ رب نواز کی یہی ادا مجھے شک میں مبتلا کر رہی تھی۔ میں نے اسے گھسنے کے لیے ذرا مختلف زاویے سے سوالات شروع کر دیے۔

میں نے پوچھا ”رب نواز! گزشتہ روز تم بصیر پور میں نہیں تھے۔ کچھ بتاؤ؟ تم کہاں گئے ہوئے تھے؟“

جناب! میں کت زمان شاہ گیا ہوا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

”وہاں کیا لپٹے گئے تھے؟“

”ملک صاحب نے ایک مردوری کام سے بھیجا تھا جناب۔“

”ملک دلدار آج اپنی حویلی میں نہیں ہے۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ”وہ کہاں گیا ہے؟“

رب نواز نے وہی جواب دیا جو مجھے پہلے سے معلوم ہو چکا تھا۔ یعنی ملک دلدار دونوں کے سلسلے میں آس پاس کے گاؤں دیہات کا دورہ کرنے گیا تھا اور دو دن بعد اسے واپس آنا تھا یعنی متوقع طور پر بائیس اگست کی شام کو۔ میں نے ذرا مختلف انداز سے سوال کیا۔

”رب نواز! چار پانچ روز پہلے بھی تم بصیر پور سے باہر گئے تھے؟“

اس کے چہرے کے تاثرات میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی، تھوک نلگتے ہوئے بولا ”جی ہاں گیا تھا

تھانے دار صاحب۔“

میں نے پوچھا ”تم کہاں گئے تھے؟“

”میں قلعہ تارا سنگھ گیا تھا جناب۔“

”مجھے بتا چلا ہے کہ تم پندرہ اگست کو دوپہر کے بعد بصیر پور سے روانہ ہوئے تھے۔“ میں نے

اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا ”اور سولہ اگست کو واپس آئے تھے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں.....“ وہ انک انک کر بولا ”آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں جی۔ ملک دلدار

صاحب نے مجھے صرف ایک دن کی چھٹی دی تھی۔“

”کیا تم کسی ضروری کام سے قلعہ تارا سنگھ گئے تھے؟“

”کام تو ضروری ہی تھا جناب۔“

”کام کی نوعیت بتاؤ گئے؟“

”وہ جی۔“ وہ گہرائے ہوئے انداز میں بولا۔ ”وہاں قلعہ تارا سنگھ میں میرا ایک بجن رہتا ہے“

ظہیر احمد۔ اس کی شادی تھی اس دن۔ میں اس کی شادی میں شرکت کرنے وہاں گیا تھا۔“

میں مسلسل اس کی آنکھوں میں گھور رہا تھا۔ اس کے جواب پر میں نے سخت لہجے میں کہا ”رب

نواز! میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ جھوٹ بولنے والوں کے ساتھ میں بہت ناروا سلوک کرتا ہوں۔“

”جناب! میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔“ وہ نظر چراتے ہوئے بولا۔

میں نے اس کے انداز سے سمجھ لیا کہ وہ کچھ چھپانے کے لیے غلط بیانی سے کام لے رہا تھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا ”رب نواز! اگر بعد میں تمہاری کوئی بات غلط ثابت ہوئی

تو تمہارا حشر پورا بصیر پور دیکھے گا۔“

وہ خاموش رہا اور سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے حوالہ عید محمد کو مخصوص اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ بوقت ضرورت اسے اپنے ہاتھ

پاؤں کو ”زحمت“ دینا ہوگی۔ عید محمد کرسی سے اٹھا اور رب نواز کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ مہمان اسے

ایس آئی مشکور علی اطمینان سے کرسی پر بیٹھایا۔ تفتیشی کار روائی دیکھ رہا تھا۔

میں نے رب نواز کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا ”کیا تم حوالدار عید محمد کو جانتے ہو؟“

وہ عید محمد کی طرف شناسا نظر سے دیکھتے ہوئے بولا ”جی جانتا ہوں۔“

”کیسے جانتے ہو؟“

”میں پہلے عید محمد کے گاؤں میں ہی رہتا تھا۔“

”گاؤں کا نام کیا تھا؟“

”جناب ہمارے گاؤں کا نام تھا..... چک گڈا سنگھ۔“ اس نے بتایا۔

میں رب نواز کو دھیان میں لگانے کے لیے یہ غیر متعلق سوالات کر رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ رب

نواز کو با آسانی اپنے تفتیشی جال میں جکڑ لوں۔

”رب نواز! تم نے کتنا عرصہ قبل عید محمد کا گاؤں چھوڑ دیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

وہ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولا ”تقریباً دس سال پہلے۔“

”تم ملک دلدار کے پاس کب سے ہو؟“
 ”کافی عرصہ ہو گیا ہے جناب۔“
 ”کافی کتنا؟“

”کوئی آٹھ سال تو ہو ہی گئے ہوں گے جی۔“

میں نے زاویہ سوالات تبدیل کر دیا ”رب نواز! ذرا یہ تو بتاؤ کہ چار روز پہلے جب تم اپنے دوست ظہیر احمد کی شادی میں شرکت کرنے قلعہ تارا سنگھ گئے تھے تو واپسی سے قبل تم اور کہاں کہاں گئے تھے؟“

”مم۔ میں اور کہیں بھی نہیں گیا تھا جناب۔“ وہ جڑبڑہوتے ہوئے بولا۔

میں نے حوالدار کو کچھ اشارہ کیا۔ اس نے میرے اشارے کو فالو کرتے ہوئے رب نواز کی گڈی پر ایک زوردار کھسکا۔ سید کیا۔ رب نواز کراہ کر رہ گیا۔ میں نے گرجدار آواز میں کہا۔
 ”میں نے تمہیں بتایا تھا“۔ بوٹ بولنے والوں کو میں برداشت نہیں کرتا۔“
 ”مم۔ میں۔ میں نے جھوٹ نہیں۔“ وہ ہکلا یا۔

اسی لمحے حوالدار عید محمد نے اس کی چنڈی پر ٹھنڈا ہیرے کرتے ہوئے غصیلے انداز میں کہا ”غیبت کی اولاد! غلط بیانی سے کام لیتے ہو۔“

میں نے رعب دار آواز میں کہا ”رب نواز! چند روز اور سہ اگر یہ کی درمیانی رات تمہیں شام کوٹ میں دیکھا گیا تھا۔ تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟“
 ”مم۔ میں بھلا کہہ سکتا ہوں جناب۔“

حوالدار نے اس زریں موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے ایک زمانہ اور چھاپڑا دیا۔ پھر ڈانٹ آمیز لہجے میں کہا ”اوتے بندر کی نسل! ملک صاحب کی بات کا ٹھیک ٹھیک جواب دو۔“
 ”جناب! میں شام کوٹ نہیں گیا تھا۔“

”یہ تو جانتے ہو گئے یہ شام کوٹ ہے کہاں پر؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا ”جناب! شام کوٹ شادنگن پور کا کوئی گاؤں ہے۔“
 ”شباباش!“ میں نے سٹائی نظر سے اسے دیکھا۔

وہ میری نگاہ میں پوشیدہ طرز کے ہلکورے لیتے طوفان کا اندازہ نہیں لگا سکا مطمئن کھڑا میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نے بہم سے انداز میں کہا ”اب تم واقعی مجھ سے تعاون کر رہے ہو رب نواز!“

وہ بدستور خاموش کھڑا رہا۔ میں نے پوچھا ”اگر تمہیں اتنا معلوم ہے کہ شام کوٹ کنگن پور کا کوئی گاؤں ہے تو پھر تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ شام کوٹ میں ایک مالدار بیوہ دلشاد بیگم بھی رہتی ہے؟“
 ”میں کسی دلشاد بیگم کو نہیں جانتا۔“ وہ بے ساختہ بولا۔

اس کے جواب کی میکانیکی نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ ایسا جواب اسی صورت میں ممکن تھا کہ اس بارے میں پہلے سے سوچ کچھ رکھا ہو۔

میں نے کہا ”میں اس دلشاد بیگم کی بات کر رہا ہوں جس کے مکان میں تم نے نقب لگائی تھی؟“
 ”میں..... نقب.....“ وہ مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب؟“

میں نے دونوں لہجے میں کہا ”رب نواز! کان کھول کر اچھی طرح سنو میں یہ کہہ رہا ہوں کہ پندرہ اور سولہ اگست کی درمیانی شب کے آخری پہر تم شام کوٹ میں رہنے والی مالدار بیوہ دلشاد بیگم کے گھر سے نکلے ہوئے دیکھے گئے ہو۔ بتاؤ تم وہاں کیا کرنے گئے تھے؟“

”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا جناب۔“ وہ نیم احتجاجی لہجے میں چیخا۔

اس کا جملہ ختم ہوتے ہی حوالدار عید محمد ”عملی میدان“ میں اتر آیا اور رب نواز پر لات گھونٹوں کی برسات کر دی۔ چند سیکنڈ کے اندر اندر رب نواز کی اچھی خاصی درگت بن چکی تھی۔ اگرچہ رب نواز ایک ہٹا کٹا شخص تھا لیکن عید محمد بھی کسی سینڈوے کم نہیں تھا پھر عید محمد کو اس پر ایک نفسیاتی برتری بھی حاصل تھی۔ ظاہر ہے رب نواز ایک حوالدار پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا تھا اور وہ بھی تھانے کے اندر۔ اس وقت رب نواز باقاعدہ کانپ رہا تھا۔

میں نے کڑک کر کہا ”رب نواز! کچھ آیا سمجھ شریف میں یا تھوڑی کوشش اور کی جائے؟“
 وہ منت آمیز لہجے میں بولا ”جناب! میں نے کچھ نہیں کیا۔ آپ خواہ مخواہ مجھ پر رشک کر رہے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔“ میں نے اسے گھورا۔

عید محمد نے کہا ”ملک صاحب! آپ اس سورا کو ایک گھنٹے کے لیے میرے حوالے کر دیں پھر دیکھیں یہ کیسے زبان نہیں کھولتا۔ اس کی تو میں.....“

”نہیں عید محمد۔“ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا ”میں پہلے سیدی انگلی سے گھی نکالنے کی کوشش کروں گا۔ اگر خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہوئے تو پھر میں اسے ایک گھنٹا نہیں بلکہ پوری رات کے

لیے تمہاری تحویل میں دے دوں گا۔ مجھے معلوم ہے تم گلی نکالنے کے لیے نہ صرف انگلی بیڑھی کرنے کے باہر ہو بلکہ اگر ضرورت محسوس کرو تو انگلی توڑنے سے بھی دریغ نہیں کرتے ہو؟“

پھر میں رب نواز کی جانب متوجہ ہو گیا اور اس سے مخاطب کرتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا ”رب نواز! ہماری معلومات کے مطابق تم پندرہ اور سولہ اگست کی درمیانی رات چوری کرنے کی غرض سے دلشاد بیگم کے گھر میں گھسے تھے اور تم اپنے مقصد میں کامیاب بھی رہے ہو۔“ ایک لمحے کو توقف کر کے میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا پھر سنساتے ہوئے لہجے میں کہا ”رب نواز! تم نے دلشاد بیگم کے گھر سے ایک نہایت قیمتی طلائی بڑاؤ نگین چرایا ہے۔ وہ نگین صندل کی نگڑی سے بنے ہوئے ایک پھوٹے بکس میں تھا۔ کیا تم اس بات سے انکار کرتے ہو؟“

”میں نے کوئی نگین نہیں چرایا جناب۔“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔

میں نے کہا ”تم حتمی چاہے جھوٹ بول لو مگر میں تمہیں تمہارے گھر تک پہنچا کر آؤں گا۔ میرے سیکٹے میں پھنسا ہوا مجرم چھوٹ بیس سکتا رب نواز یہ بات ذہن نشین کر لو۔ میں کل صبح اپنے دو آدمی قلعہ تارا سنگھ روانہ کروں گا۔ وہ وہاں سے معلوم کر لیں گے کہ تم کسی ظہیر احمد کی شادی میں شرکت کرنے قلعہ تارا سنگھ گئے تھے یا نہیں اور۔۔۔“

میں نے دانستہ جملہ ادھر اچھوڑ دیا اور تیز نظر سے رب نواز کو گورنے لگا۔ وہ میری نگاہ کی تاب نہ لاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”ارباب بھی وقت ہے اگر تم سب کچھ سچ بتا دو تو میں تمہارے ساتھ نرمی برتنے کی کوشش کروں گا۔ مگر یہ قیمتی بڑاؤ نگین کہاں ہے؟“

”میں نگین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ وہ کمزوری آواز میں منہایا۔

میں نے کہا ”مجھے سختی پر نہ اسکاؤ رب نواز۔ میں نے بھروسہ کو بولنے پر مجبور کیا ہے تم کہاں کے ماسے خان ہو!“

”آپ چنانچہ کون سے نگین کی بات کر رہے ہیں۔“ وہ ڈھٹائی سے بولا ”میں شام کوٹ گیا ہوں اور نہ ہی کسی دلشاد بیگم کو جانتا ہوں۔“

”لیکن دلشاد بیگم تو تمہیں اچھی طرح جانتی ہے۔“ میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ جلدی سے بولا۔

میں نے کہا ”اس نے نگین پور تھانے میں نگین کی چوری کی رپورٹ درج کرواتے وقت تمہارا

منفصل حلیہ بھی بیان کیا تھا۔ اسی حلیے کی مدد سے ہم تم تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔“

”اچھا یہ بات ہے۔“ وہ طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولا ”میں تو کچھ اور سمجھا تھا۔“

”تم کیا سمجھتے تھے رب نواز؟“ میں نے استفسار کیا۔

وہ بولا ”آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔“

”کس بات سے تم ڈر گئے تھے؟“

”جناب! آپ نے کہا تھا کہ دلشاد بیگم مجھے اچھی طرح جانتی ہے۔“ وہ مطمئن انداز میں بولا ”حالانکہ آپ کا مطلب یہ تھا کہ دلشاد بیگم نے میرا حلیہ تھانے والوں کو بتایا تھا۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے بات گھمادی ”جناب! ممکن ہے دلشاد بیگم کا نگین چوری کرنے والا مجھ سے ملتا جلتا کوئی اور شخص ہو۔ دنیا میں ایک جیسی جسامت اور وضع قطع کے کئی افراد ہو سکتے ہیں۔“

”ایسا ہونا ناممکن تو نہیں مگر۔۔۔“

میں نے جملہ نامکمل چھوڑ کر رب نواز کو ٹٹولنے والی نظر سے دیکھا پھر کہا ”مگر دلشاد بیگم کا نگین چوری کرنے والا کوئی اور شخص نہیں بلکہ تم ہی ہو رب نواز!“

”آپ یہ بات اتنے وثوق سے کس طرح کہہ رہے ہیں جناب۔“ وہ اپنے لہجے میں مضبوطی

بھرتے ہوئے بولا ”کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟“

”ثبوت!“ میں نے زہر خند لہجے میں کہا ”ایک ثبوت تو کل دیپال پور سے آجائے گا۔ یعنی

موضوع قلعہ تارا سنگھ سے۔“ میری بات سن کر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گر گیا۔ میں

نے مزید کہا ”اس کے علاوہ بھی میرے پاس ثبوتوں کی کمی نہیں ہے رب نواز۔ نگین کی مالک دلشاد

بیگم نے تمہاری صرف ایک جھٹک دیکھی تھی۔ اس نے تمہاری جوشنایاں بتائی ہیں وہ من و عن تم میں

موجودہ ہیں پھر ایک ماہر کھوجی نے تمہارا کھرا اٹھایا ہے۔ کھوجی خوشی محمد کی رپورٹ ظاہر کرتی ہے

کہ تم شام کوٹ یعنی دلشاد بیگم کے گھر سے نکلنے کے بعد سیدھے نگین پور ریلوے اسٹیشن پہنچے تھے۔

جب تم نگین پور ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہنچے تو صبح ہو چکی تھی۔ مذکورہ پلیٹ فارم کے ٹی

اسٹال سے تم نے چائے پی تھی۔ اس ٹی اسٹال کے مالک منظور احمد نے تمہارے حلیے کی تصدیق کی

ہے پھر لیاقت خان نامی ایک قلی سے بھی تمہاری مختصر بات چیت ہوئی تھی جس نے تم سے ٹکٹ وغیرہ

کے بارے میں پوچھا تھا۔ قلی لیاقت خان نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ تم نگین پور سے ٹرین

میں سوار ہوئے تھے۔ اس ٹرین کا پہلا اسٹیشن یعنی نگین پور کے بعد پہلا اسٹیشن ہے ”اناری“۔۔۔ اور

اناری کے بعد آتا ہے بصیر پور۔

میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”میری معلومات کے مطابق تم تو بصیر پور کے اسٹیشن پر ٹرین سے اتر گئے تھے یعنی سولہ اگست کو۔“ رب نواز نے ہراساں نظر سے مجھے دیکھا میں نے کہا ”بصیر پور کے ریلوے اسٹیشن سے باہر آ کر تم نے ناظم علی کے ”نعت کدہ“ سے چائے پانی پیا اور پھر طالب حسین کے کھوکھے سے تم نے۔“

اتنا کہہ کر میں خاموش ہو گیا پھر ایک نوری خیال کے تحت سوال کیا ”رب نواز! کیا تم سگریٹ پیتے ہو؟“

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا ”کون سا برانڈ؟“

”یہ کیا ہوتا ہے جناب!“

وہ برانڈ کا مطلب مجھے نہیں سمجھ سکا تھا۔ میں نے وضاحت کی ”میں یہ پوچھنا چاہ رہا ہوں تم کون سا سگریٹ پیتے ہو۔ مثلاً تھوڑا مارکا بھالا مارکا۔“

میں جملہ نامکمل چھوڑ کر سوالیہ ”رب نواز کی طرف“ دیکھنے لگا۔

وہ جھٹ سے بولا ”جناب“ میں تو قینچی مارکا سگریٹ پیتا ہوں۔“

میں نے دانستہ قینچی مارکا سگریٹ کا نام نہیں لیا تھا۔ رب نواز کی تشریح کے بعد میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”رب نواز! سولہ اگست کو تم نے طالب حسین سگریٹ فروش کی دکان سے قینچی مارکا سگریٹ کا ایک پیکٹ بھی خریدا تھا۔“

وہ سرا سمہ دکھائی دینے لگا۔ میں نے سخت لہجے میں پوچھا ”کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”میں تو جناب سولہ تاریخ کو دیپال پور سے آیا تھا“ وہ کزور سے لہجے میں بولا ”سوخ قلعہ تارا سنگھ میں ظہیر احمد کی شادی تھی۔ قلعہ تارا سنگھ سے میں پہلے دیپال پور پہنچا تھا پھر بس میں بیٹھ کر بصیر پور آ گیا تھا مگر آپ تو ٹرین والی کہانی سنار ہے۔۔۔۔۔ اور کنگن پور وغیرہ کا ذکر کر رہے ہیں۔ میں تم کھا کر کہتا ہوں جناب“ میں نے زندگی میں کبھی چوری نہیں کی اور شام کوٹ کی دلشاد بیگم کو تو میں جانتا تک نہیں پھر ان کا کنگن چوری کرنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔“

میں نے ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ”کیا تمہارا ملک دلدار بھی دلشاد بیگم کو نہیں جانتا؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب۔“

”تم بہت کچھ کہہ سکتے ہو۔“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا جناب۔“

”اوائے مطلب کے گھوڑے!“ میں نے اسے جھڑکا ”تم نے تھوڑی دیر پہلے بتایا تھا کہ تم لگ بھگ آٹھ سال سے ملک دلدار کے پاس ملازم ہو۔ بتایا تھا کہ نہیں بتایا تھا؟“ میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”بتایا تھا جی۔“ وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔

میں نے کہا ”میں جس دلشاد بیگم کا پوچھ رہا ہوں“ تین سال پہلے اس کے شوہر امتیاز علی کا انتقال ہو گیا تھا۔ امتیاز علی شام کوٹ کا مشہور ز میں دار تھا۔ پورے پچاس ایکڑ زمین تھی اس کی۔۔۔۔۔ اور یہ امتیاز علی تمہارے ملک دلدار کا دوست تھا۔ ملک دلدار اکثر اس سے ملنے شام کوٹ جاتا رہتا تھا۔ تم تو آٹھ سال سے ملک دلدار کے ساتھ ہو۔ کیا تم اتنے ہی بے خبر ہو۔۔۔۔۔ اور اگر واقعی تم اس قدر نالائق ہو تو پھر سمجھ میں نہیں آتا“ ملک دلدار نے تمہیں کیوں اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ تمہارا شمار تو ملک دلدار کے قابل اعتماد ساتھیوں میں ہوتا ہے۔“

وہ تھوک نکل کر حلق تر کرتے ہوئے بولا ”آپ کو یہ ساری باتیں کس نے بتائی ہیں؟“

”کون سی باتیں؟“

”یہی امتیاز علی دلشاد بیگم والی باتیں۔“

میں نے کہا ”رب نواز! تم جتنا بے وقوف نظر آنے کی کوشش کر رہے ہو اتنا ہو نہیں سکتے۔ مجھے تو تم بڑے کھوچل دکھائی دیتے ہو۔“ ایک لمحے کو روک کر میں نے کہا ”دلشاد بیگم اور امتیاز علی کے بارے میں تمام معلومات خود دلشاد بیگم نے تمہانے کنگن پور کے انچارج کو فراموش کی ہیں اور ملک دلدار کا حوالہ بھی اسی نے دیا ہے۔“

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگا پھر الجھے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا ”کنگن پور کے تھانے کا بصیر پور کے تھانے سے کیا تعلق ہے؟“

حوالدار عید محمد اس موقع پر چپ نہ رہ سکا“ خالصہ کھلے لہجے میں بولا ”ان دونوں تھانوں کا آپس میں وہی تعلق ہے جو تمہاری ماں کا تمہارے باپ سے تھا۔ کیا اتنے قریبی تعلق کو بھی تم بھول بیٹھے

ہو۔۔۔۔۔“

میں نے ہاتھ کے اشارے سے حوالدار کو مزید بدھکائی سے روک دیا ورنہ وہ تو خاصا خطرناک انداز اختیار کر چکا تھا۔ میں نے رب نواز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اس کو جانے ہو؟“

اس کے ساتھ ہی میں نے مہمان اے ایس آئی مشکور علی کی طرف اشارہ کر دیا۔ مشکور علی اس وقت سادہ لباس میں تھا۔ تفتیش کے دوران میں رب نواز نے متعدد بار مشکور علی کی طرف دیکھا تھا مگر اس کے چہرے پر ایک مرتبہ بھی شناسائی کی چمک مجھے نظر نہیں آئی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ رب نواز کے لیے اجنبی تھا۔

میری توقع اور اندازے کے عین مطابق وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”نہیں جناب! میں آج سے پہلے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔“ پھر اس نے سوال بھی کر ڈالا ”یہ صاحب کون ہیں؟“

”یہ اسٹنٹ سب انسپٹر مشکور علی ہے۔“ میں نے مہمان اے ایس آئی کا تعارف کرواتے ہوئے کہا ”مشکور علی نگن پور سے تمہارے پیچھے یہاں پہنچا ہے۔ یہی اس کیس کا تفتیشی افسر بھی ہے۔“

رب نواز کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمودار ہوئے۔

میں نے سخت لہجے میں کہا ”نگن باز یاب کیے بنا واپس نہیں جائے گا۔ اگر تم کسی بڑے عذاب سے بچنا چاہتے ہو تو شرافت سے وہ مردہ جڑاؤ نگن باز سے حوالے کر دو۔ اور اگر تم نے یہ چوری کسی اور شخص کے ایمار کی ہے تو بھی بتا دو۔ ممکن ہے ایسی صورت میں نگن کی بازیابی کے بعد میں تمہارے ساتھ رعایت برتوں۔“

تھوڑی دیر پہلے اس کے چہرے پر جو گھبراہٹ ظاہر ہوئی تھی وہ جاتی رہی اور رب نواز قدرے مضبوط لہجے میں بولا ”تھانے دار صاحب! آپ خواہ مخواہ دباؤ ڈال کر مجھ سے کچھ قبول کرانا چاہتے ہیں۔ میں کئی بار آپ سے کہہ چکا ہوں کہ نگن کی چوری میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ خدا کے لیے مجھے جانے دیں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔“

”ایسے کیسے جانے دیں گے تمہیں سرکاری سائڈ۔“ حوالدار عید محمد نے اسے خوں خواہش سے گھورا ”ابھی تو ہم نے تمہاری کوئی ”خاطر تواضع“ بھی نہیں کی۔ یہ وہ جگہ ہے پچو! جہاں نہ کوئی اپنی مرضی سے آتا ہے اور نہ ہی یہاں سے کوئی اپنی مرضی سے جاتا ہے۔ ہم خود تمہیں پکڑ کر لائے ہیں جب دل چاہے گا خود ہی چھوڑ دیں گے۔ ہمیں بھی تو کچھ خدمت کا موقع دو۔ ہم مہمانوں کو روکھا سوکھا تھوڑا ہی جانے دیتے ہیں۔“

”کیا ارادہ ہے رب نواز؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا ”ج بول کر صحیح سلامت واپس جانا

ہے یا تمہیں ڈرائنگ روم کی سیر کرائی جائے؟“

”میں نے تو اب تک سب کچھ ہی بولا ہے جناب۔“ وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔

حوالدار نے کہا ”ملک صاحب! لاوتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ ان پر اسٹیشنل فارمولہ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ میں رب نواز کے مرض کو بخوبی سمجھ گیا ہوں۔ اگر آج کی رات یہ میرے زیر علاج رہا تو انشاء اللہ صبح تک شالی علاج کر دوں گا اس کا۔“

میں نے سوالیہ نظر سے رب نواز کو دیکھا۔ جب اس نے تعاون کے لیے زبان نہیں کھولی تو میں نے حوالدار عید محمد سے کہا ”عید محمد! رب نواز تمہارا پرانا گرام ہے۔ کسی زمانے میں یہ بھی چمک گندا سنگھ میں رہتا تھا۔ ہو سکتا ہے تمہاری ”زبان“ آسانی سے سمجھ جائے۔ میں آج کی رات اسے تمہارے حوالے کرتا ہوں۔ مجھے صبح تک ننگن چاہئیں۔ مفید اور حوصلہ افزا ننگن۔ کیا سمجھے؟“

”بہت اچھی طرح سمجھ گیا ہوں ملک صاحب!“ حوالدار نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

میں نے مہمان اے ایس آئی سے کہا ”مشکور علی! تم نے اپنے تھانے کی تفتیش کے طور طریقے تو بہت دیکھے ہوں گے۔ آج کی رات میرے حوالدار کا اسٹائل بھی ملاحظہ کرو۔ یہ اپنے کام کا اسپیشلسٹ ہے۔ ممکن ہے تمہیں سیکھنے کے لیے کوئی نئی بات مل جائے!“

”شکریہ ملک صاحب۔“ وہ ممنونیت سے بولا ”میں آپ کے اس تعاون کو عمر بھر یاد رکھوں گا۔ آپ نے واقعی سنیر ہونے کا حق ادا کر دیا ہے حالانکہ میرا تعلق آپ کے تھانے سے بھی نہیں ہے۔“

میں نے کہا ”مشکور علی! تمہارا تعلق پولیس ڈیپارٹمنٹ سے ہے میرے لیے بس اتنا ہی کافی ہے۔ ہم سب ایک ہی برادری کے لوگ ہیں تھانہ الگ الگ ہے تو کیا ہوا۔ جس طرح ایک باپ کی چار اولادیں چار مختلف گھروں میں رہتی ہیں لیکن وہ خاندان ایک ہی گنا جاتا ہے بالکل اسی طرح پولیس کا پورا محکمہ ایک خاندان ہے۔ تھانوں وغیرہ کی تقسیم تو انتظامی امور ہیں۔ اس سے ہمارا مقصد تو مختلف نہیں ہو جاتا۔ ہمارا اول آ خر فرض یہی ہے کہ قانون کی سر بلندی قائم رکھیں اور جرائم کی سطح کئی کے لیے اگر ہمیں اپنی جانیں بھی قربان کرنا پڑیں تو دریغ نہ کریں۔“

”آپ بہت عظیم ہیں ملک صاحب۔“ مشکور علی نے جذبات لہجے میں کہا۔

اس کے بعد بھی وہ تعریفی کلمات کی گردان کرتا رہا لیکن میں وہاں سے اٹھ کر اپنے سرکاری کوارٹر میں آ گیا۔

وہ رات میں نے سوچتے جاگتے ہوئے گزار دی۔ اس بے آرامی کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی

تھی۔ گھنٹے دو گھنٹے کے بعد میری آنکھ کھل جاتی۔ جب بھی میں بیدار ہوتا "رب نواز اور ملک دلدار کے بارے ہی میں سوچ رہا ہوتا تھا اور انہی کے بارے میں سوچتا سوچتا میں دوبارہ سو جاتا تھا۔ رب نواز پر میرا شک خاصا پختہ ہو گیا تھا۔ یہ تقریباً دس اور نوے والی صورت حال تھی۔ اس کے چوری نہ کرنے کے امکانات صرف دس فی صد تھے۔ یہ دس فی صد امکانات بھی اس وقت ختم ہو جاتے جب قلعہ تارا سنگھ سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی کہ وہ وہاں پندرہ اگست کو نہیں گیا تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر اس نے واقعی وہ طلائی جزاؤں کنگن چرایا تھا تو آخر کیوں؟ امکانی جوابات میں..... سرفہرست یہ تھا کہ ملک دلدار کے حکم پر۔ یہاں پر نکتہ اٹھتا تھا کہ ملک دلدار کو دلشاد بیگم کا کنگن چرانے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی۔ مجھے یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ ملک دلدار دلشاد بیگم کے شوہر امتیاز علی کا دوست تھا مگر امتیاز کی آخری عمر میں ان دونوں کے درمیان ناچاقی ہو گئی تھی اور دلدار نے امتیاز علی کے گھر شام کوٹ جانا چھوڑ دیا تھا۔ یہ سب کچھ مجھے مہمان اے ایس آئی مشکور علی نے بتایا تھا۔ سوئی پھروہیں آ کر ایک چائے تھی کہ ملک دلدار کو بیوہ دلشاد بیگم کے طلائی کنگن میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ میرے ذہن میں ایک خیال یہ بھی ابھرتا تھا کہ کیا اس کنگن کا مستقبل قریب میں ہونے والے ایکشن سے کوئی تعلق ہو سکتا تھا؟ اس سوال کا جواب کبھی "نہیں" میں آتا تھا اور کبھی "ہاں" میں۔ میں نے اسی شش و پنج میں رات گزار دی۔

اگلی صبح بڑی فیصلہ کن تھی۔

جس طرح ایک دھوبی کا سنک سوڈا کی مدد سے انتہائی میلے پرے کچھ بھی اجلا بنا دیتا ہے بالکل اسی طرح گزشتہ رات حوالدار عید محمد نے رب نواز کی دھلائی کی تھی۔ ہماری مخصوص "تفتیش" نے اس کے سارے کس بلی نکال دیے تھے گویا عید محمد نے دھلائی کے بعد اس کی سکھائی کی تھی اور قاتل بچ دینے کے لیے اس پر استری بھی پھیر دی تھی۔ میں جب اپنے کمرے میں آ کر بیٹھا تو والددار مسکراہٹ بھرے چہرے کے ساتھ میرے پاس آ گیا اور پر جوش لہجے میں بولا۔

"ملک صاحب! ایک خوشی کی خبر ہے۔"

"کیا خبر ہے بھئی؟" میں نے پوچھا۔

"میری 'کوششیں' رنگ لے آئی ہیں۔" اس نے بتایا۔

"اس کا مطلب ہے خبر کا تعلق رب نواز سے ہے۔"

"بالکل جناب۔" وہ تیز آواز میں بولا "رات کو کمان کی طرح لیڑھا نظر آنے والا رب نواز

اب تیر کی طرح سیدھا ہو چکا ہے۔"

"کیا اس نے اقبال جرم کر لیا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"کیا کہتا ہے وہ؟"

"اس نے کنگن کی چوری کا اقرار کر لیا ہے ملک صاحب۔" حوالدار نے بتایا "مگر وہ اس بات پر انکار ہوا ہے کہ اس نے وہ کنگن ملک دلدار کے حکم پر چوری کیا ہے۔"

میرے سینے سے اطمینان کی ایک گہری سانس خارج ہوئی۔ میرے اندازے بالکل درست ثابت ہو رہے تھے۔ گویا بندہ پیری پر آ گیا تھا۔ میں نے حوالدار سے پوچھا "کیا تم نے اس کے ساتھ کچھ زیادہ ہی 'مہمان داری' تو نہیں کر دی؟"

"ملک صاحب! بندہ اوپر سے جتنا لیڑھا نظر آتا تھا اندر سے اتنا ہی بودا نکلا۔" حوالدار نے بتایا "ابھی میں نے دوسرا فارمولہ ہی آزمایا تھا کہ اس کی زبان کھل گئی۔ کہنے لگا 'اگر میں اس سے وعدہ کروں کہ ملک دلدار کے سامنے اس کا نام نہیں لوں گا تو وہ مجھے سب کچھ سچ بتا دے گا۔ ایسا وعدہ کرنے میں ہمارا بھلا کیا جاتا ہے۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ اگر اس نے مجھے حقیقت حال سے آگاہ کر دیا تو نہ صرف اسے فوراً رہا کر دیا جائے گا بلکہ کسی بھی معاملے میں اس کا نام نہیں آئے گا۔"

چالاک مجرموں سے ان کا جرم اگلوانے کے لیے بعض اوقات ہمیں ایسے جھوٹے وعدے بھی کرنا پڑتے ہیں۔ میں نے حوالدار سے کہا "رب نواز کو میرے پاس لے آؤ۔"

تھوڑی ہی دیر کے بعد رب نواز میرے سامنے موجود تھا۔ وہ رات والے رب نواز سے خاصا مختلف دکھائی دیتا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ حوالدار عید محمد نے مبالغہ آرائی کرتے ہوئے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ رب نواز کی "خاطر تواضع" اور "مہمان داری" میں کسی قسم کی کسر اٹھانیں رکھی گئی تھی۔ اس کی طبیعت خاصی "سیر" نظر آتی تھی۔

میں نے اس مرتبہ رب نواز کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور حوالدار سے کہا کہ وہ باہر چلا جائے۔ جب عید محمد وہاں سے رخصت ہو گیا تو میں رب نواز کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"تو تم نے بالآخر سیدھے راستے پر چلنے کا فیصلہ کر ہی لیا رب نواز۔" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

وہ شکایتی لہجے میں بولا "تھانے دار صاحب! آپ کے حوالدار نے میرے ساتھ بہت زیادتی

کی ہے۔

”اگر تم شرافت کی زبان سمجھ جاتے تو پھر تمہیں یہ وقت نہ دیکھنا پڑتا۔“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا، ”جتنی نرمی سے میں نے تم سے پوچھنا چاہا تھا، ایسے تو کوئی ماں بھی اپنے بچے سے نہیں کرتی۔“

”بس جی، مجھ سے غلطی ہوگئی، وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا، ”مجھے آپ کی بات مان لینا چاہیے تھی۔ اس ٹوٹ بھوٹ سے توجہ نہ دیتا۔“

میں نے کہا، ”شکر کرو، والدہ نے صرف توڑنے پھوڑنے پر ہی اکتفا کر لیا اور نہ تمہیں معلوم نہیں اپنی آئی پر آجائے تو کتنا حالاً دناوت ہوتا ہے۔“

”جناب! جب میں چک گنڈا سنگھ میں ہوتا تھا تو عید محمد اتنی سخت طبیعت کا تو نہیں ہوتا تھا۔“ رب نواز نے مجھ سے لہجے میں کہا، ”میں نے رات اسے بار بار چک گنڈا سنگھ کا واسطہ بھی دیا اور ایک گاؤں کا ہونے کے سوا اس سے خصوصی رعایت کی اپیل بھی کی مگر اس نے میری ایک نہیں سنی اور مار مار کر مجھے ادھ مو کر دیا۔۔۔۔۔ وہ تو جناب میں نے زبان کھولنے کا فیصلہ کر لیا اور نہ ہو سکتا تھا وہ مجھے ختم ہی کر دیتا۔“

مجھے والدہ کی اس ادانے متاثر کیا تھا کہ رب نواز کا چک گنڈا سنگھ سے تعلق ہونے کے باوجود بھی اس نے کسی درو رعایت سے کام نہیں لیا تھا۔ عید محمد خود بھی مدورہ چاکا کا رہنے والا تھا۔ اس عمل سے عید محمد کی فرض شناسی ظاہر ہوتی تھی ورنہ ”ڈاک خانہ ملتے ہی“ ”لوگوں کے رویے میں تبدیلی آ جاتی ہے۔“

میں نے رب نواز کی شکایت آمیز فریاد کو نظر انداز کرتے ہوئے اس سے پوچھا، ”تم نے بتایا ہے بلکہ اقرار کیا ہے ملک دلدار کے حکم پر تم نے دلتا دیگم کا طلائی کنگن چرایا تھا جو کہ محل کے ایک بکس میں رکھا گیا تھا اور تم نے سولہ اگست کو وہ بکس ملک دلدار کے حوالے کر دیا تھا؟“

”جناب! حقیقت یہی ہے مگر حوالہ دار صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ مجھے کسی مصیبت میں مبتلا نہیں کیا جائے گا“ وہ منت آمیز لہجے میں بولا، ”میں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے اب آپ لوگ بھی اپنا وعدہ پورا کریں اور مجھے یہاں سے جانے دیں۔“

”تم اس وقت تک یہاں سے نہیں جاؤ گے جب تک میں وہ صندوق بکس برآمد نہیں کر لیتا“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا، ”ہاں، یہ میرا وعدہ ہے کہ اگر تم اسی طرح قانون کے ساتھ تعاون کرتے رہے

تو کسی بڑی سزا سے بچ جاؤ گے۔“

وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولا، ”کیا مجھے مزید تعاون بھی کرنا ہوگا؟“

”ابھی تم نے کیا ہی کیا ہے؟“ میں نے کہا۔

”سب کچھ تو بتا دیا ہے، وہ روہانسا ہو گیا،“ اپنے جرم کا اقرار کر لیا ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا

کروں؟“

میں نے کہا، ”رب نواز! سب سے پہلے تو تم یہ بتاؤ گے کہ ملک دلدار نے وہ کنگن تم سے کس مقصد کے لیے چوری کروایا ہے؟“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا جناب!“

”یہ تو جانتے ہو گے کہ اس وقت وہ کنگن کہاں ہوگا؟“

”نہیں جناب، مجھے نہیں پتا“ وہ رو دینے والے انداز میں بولا۔

”کمال ہے رب نواز!“ میں نے اسے گھورا، ”تم ملک دلدار کے اتنا قریب ہو اور کنگن کی چوری

کا سبب نہیں جانتے۔۔۔۔۔ نہ ہی تمہیں یہ معلوم ہے کہ ملک دلدار نے وہ کنگن کہاں رکھا ہوگا؟“

وہ گلوگیر آواز میں بولا، ”اللہ پاک کی قسم، میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ جو حقیقت تھی وہ میں نے

آپ کو بتا دی ہے۔ اب آپ میری بات کا یقین کریں یا نہ کریں۔“

میں نے کہا، ”کنگن کا سراغ تو میں لگا ہی لوں گا رب نواز لیکن تمہاری جان اسی وقت چھوٹے گی

جب تم ہمارے ساتھ تعاون جاری رکھو گے۔“

”اب آپ مجھ سے مزید کیا چاہتے ہیں؟“

”کنگن کی بازیابی کے بعد میں ملک دلدار کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچاؤں گا کیونکہ یہ

واردات تم نے اسی کے اشارے پر کی ہے“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا، ”اور اس

سلسلے میں تمہیں عدالت میں گواہی دینا ہوگی۔“

”آپ کا مطلب ہے ملک دلدار کے خلاف گواہی؟“

”ہاں، میرا یہی مطلب ہے؟“

”وہ۔۔۔۔۔ وہ تو میری اس حرکت پر مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے“ رب نواز نے ہراساں لہجے میں

کہا۔

میں نے کہا، ”اگر تم نے یہ ”حرکت“ نہ کی تو میں تمہیں آسانی سے نہیں چھوڑوں گا۔ کم از کم

سات سال کے لیے تو تمہیں جیل میں سزا ہی ہوگا۔
”مگر آپ نے تو کہا تھا کہ مجھے چھوڑ دیں گے۔“

”تمہاری رہائی اور آزادی ہمارے ساتھ یعنی قانون کے ساتھ تعاون سے مشروط ہے“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔“
”میں تو بری طرح پھنس گیا ہوں تمہارے دار صاحب!“ وہ روہاسی آواز میں بولا ”ایک طرف کنواں ہے دوسری جانب کھائی۔ کچھ میں نہیں آتا کس سنت چھلانگ لگاؤں؟“

میں نے کہا ”الو کی دم! جب برے کام کرو گے تو ظاہر ہے بری ہی طرح پھنسو گے نا۔ رات کے آخری پہر ایک بیش قیمت جڑاؤ طلائی نگن چرانے کے ”کارنامے“ پر کیا تمہیں ثانی سے نوازا جائے گا؟“

وہ بے بسی سے ٹیٹھکیں لگا۔ میں نے اسے دوبارہ حوالدار کے حوالے کیا اور کہا ”عید محمد! رب نواز اب بیابان چکا ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔ مزید کسی کارروائی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک فیصلہ کرنا چاہتا ہے۔ اسے پرسکون سامیہ کرتا۔“

حوالداری نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میری ہدایت پر عمل کرے گا۔

میں نے مہمان اے ایس آئی کو اپنے پاس بلا لیا۔ مشکور علی میرے کمرے میں آیا تو میں نے کہا ”رب نواز نے نگن کی چوری کا اقرار تو کر لیا ہے لیکن اب مروت نگن کو بازیاں کروانے کا مرحلہ باقی ہے۔ جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ملک دلداری اس وقت اپنی جگہ میں موجود نہیں ہے۔ آج اکیس اگست ہے۔ ملک کی واپسی کے امکانات کل شام تک ہیں۔ ہم.....“

اے ایس آئی قطع کلائی کرتے ہوئے بولا ”یہ تو اچھا اور سنہری موقع ہے۔ ملک دلدار کی غیر موجودگی میں ہم اس کی حویلی کی زیادہ اچھی طرح تلاشی لے سکتے ہیں۔“

”کہہ تو تم بالکل ٹھیک ہی رہے ہو مشکور علی!“ میں نے تائیدی انداز میں کہا ”مگر میں یہ کارروائی سرچ وارنٹ حاصل کرنے کے بعد ڈالنا چاہتا ہوں۔“

”تو پھر دیر کس بات کی ہے ملک صاحب!“ وہ جلدی سے بولا ”ابھی تو صرف دس ہی بجے ہیں۔ عدالت کا وقت ختم ہونے میں کئی گھنٹے باقی ہیں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ملک دلداری کی حویلی کا سرچ وارنٹ نکلوایا جاسکتا ہے۔“

رب نواز کے اقبال جرم کے بعد کسی اہلکار کو تعلقہ تار سنگھ (دیپال پور) بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی

چنانچہ میں نے فوری ضروری کاغذی کارروائی کی اور مہمان اے ایس آئی کے ساتھ عدالت روانہ ہو گیا۔

جب میں واپس اپنے تھانے پہنچا تو دن کے ڈھائی بج رہے تھے۔ ہم نے اطمینان سے دو پہر کا کھانا کھایا پھر میں سرچ وارنٹ کے ساتھ ملک دلداری کی حویلی کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس وقت میرے ہم راہ مہمان اے ایس آئی مشکور علی اور عید محمد کے علاوہ چار کانٹیل اور بھی تھے۔

حویلی پر ہمارا استقبال ملک دلداری کے چھوٹے بھائی ملک فیاض احمد نے کیا۔ فیاض کی عمر پینتیس سال کے قریب تھی۔ وہ چوڑے شانوں والا ایک صحت مند شخص تھا۔ اس نے نکواری مارکو موٹو پٹھیں رکھی ہوئی تھیں جو اس کے سرخ و سفید چہرے پر بڑی بھلی دکھائی دیتی تھیں۔

ملک فیاض نے ہمیں بیٹھک میں بٹھایا اور ہماری خاطر تواضع کے لیے سرگرم نظر آنے لگا۔ میں نے اس کی سرگرمی کو دیکھتے ہوئے کہا ”ملک فیاض! کسی قسم کے تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس وقت سرکاری ذیوٹی پر ہوں اور ایک نہایت ہی ضروری کام سے ملک دلداری سے ملنے آیا ہوں۔“

میں نے دانستہ یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ مجھے ملک دلداری کے بیرونی دورے کی خبر تھی۔

ملک فیاض نے کہا ”بھائی صاحب تو اس وقت گھر میں موجود نہیں ہیں۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے قریب کھڑے ایک ملازم صورت شخص کو کوئی اشارہ کیا۔ مذکورہ شخص چراغی جن کے ہاتھ حویلی کے اندرونی حصے میں غائب ہو گیا۔ میں سمجھ گیا کہ ملک فیاض نے ہمارے لیے کھانے پینے کی کوئی چیز منگوائی تھی۔

”میں نے کہا تھا نا“ کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے“ میں نے ملک فیاض کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

وہ بولا ”جناب تکلف کی کیا بات ہے۔ شدید گرمی کا موسم ہے۔ بس ٹھنڈا پانی منگوا لیا ہے۔“
تھوڑی دیر کے بعد وہی ملازم ایک ٹرے اٹھائے حاضر ہوا۔ وہ خاصا پر تکلف ”ٹھنڈا پانی“ لے کر آیا تھا۔ ہم نے خوش رنگ ڈالتے دار مشروب سے اپنی پیاس بجھائی۔ غالباً وہ بادام کا شربت تھا جس میں چند دیگر اشیاء بھی ملائی گئی تھیں جو گرمی کے توڑ کے لیے اکسیر تھیں۔ مشروب کی سطح پر تخم بالنگا بھی تیر رہا تھا۔

میرے استفسار پر ملک فیاض نے بتایا ”بھائی صاحب! ارد گرد کے علاقوں کے دورے پر ہیں تمہارے دار صاحب! آپ کو تو پتا ہی ہے! انکشن سر پر آ گئے ہیں۔ بس اسی سلسلے میں بھاگ دوڑ جاری

ہے۔

”بڑے ملک صاحب کی واپسی کب تک ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔

”انشاء اللہ کل شام تک وہ واپس آ جائیں گے۔“

میں نے مہمان اے ایس آئی کی طرف دیکھا۔ ملک فیاض نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا

”خیریت تو ہے نا تھانے دار صاحب! آپ بھائی صاحب سے کس سلسلے میں ملنے آئے تھے؟“

”سلسلہ خاصا گنیمت ہے فیاض احمد!“ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”مجھے بتائیں بات کیا ہے؟“ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا ”ہو سکتا ہے“ میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔“

میں نے کہا ”فیاض احمد! میں اس وقت تمہاری حویلی کی تلاشی لینے آیا ہوں جسے قانونی زبان میں خانہ تلاشی کہا جاتا ہے؟“

”ہماری حویلی کی تلاشی“ اس نے بہ آواز بلند دہرایا پھر احتجاجی انداز میں بولا ”تھانے دار صاحب! آپ ہماری حویلی کی تلاشی کیوں لینا چاہتے ہیں۔ ہم نے اپنی حویلی میں ایسی کون سی غیر قانونی چیز چھپا رکھی ہے؟“

”مال مسروق!“ میں نے چھپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”مال مسروق!“ وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولا ”یہ کیا آپ کر رہے ہیں جناب!“

یہ آپ کیا کہہ رہے جناب اس نے اس طرح ادا کیا تھا جیسے کہہ رہا ہو کیا آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

میں نے کہا ”میں وہی کہہ رہا ہوں فیاض احمد جو تم نے سنا ہے۔“

وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا ”ہم نے اپنی حویلی میں کون سا مال مسروق چھپا رکھا ہے؟“

”ایک نہایت ہی قیمتی جواڑو طلائی نگین!“ میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا ”حشام کوٹ کی رہنے والی ایک بیوہ مسماۃ دلشاد بیگم کی ملکیت ہے اور تمہارے بھائی صاحب بڑے ملک و لدار نے اسے اپنے قریبی ملازم رب نواز کی مدد سے چوری کروایا ہے۔ بات آئی سمجھ میں؟“ پھر میں نے اسے تفصیلاً بتا دیا۔

ملک فیاض احمد کے چہرے پر الجھن کی ککھروں کا جال سا پھیل گیا۔ وہ بے یقینی کے سے انداز میں بولا ”آپ سمجھ میں نہ آنے والی باتیں کر رہے ہیں تھانے دار صاحب!“ پھر وہ زیر لب بڑبڑایا ”بھائی صاحب..... شام کوٹ..... دلشاد بیگم..... طلائی نگین..... رب نواز..... رب نواز“ اس نے

چونک کر مجھے دیکھا اور پوچھا ”رب نواز کل رات سے غائب ہے، کہیں وہ آپ کے قبضے میں تو نہیں ہے؟“

”تم بالکل ٹھیک جگہ پر پہنچے ہو“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا ”رب نواز اس وقت ہماری تحویل میں ہے۔ اس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا ہے۔ اب ہمیں اس حویلی سے مسروقہ نگین بازیاب کرنا ہے۔“

وہ طنزیہ لہجے میں بولا ”اور اس مقصد کے لیے آپ ہماری حویلی کی تلاشی لینا چاہتے ہیں؟“

”اگر تمہیں اپنی حویلی کی تلاشی دینا پسند نہیں ہے تو پھر خود ہی ہماری مطلوبہ چیز ہمارے حوالے کر دو“ میں نے تیکھے لہجے میں کہا ”ہم تلاشی کا خیال دل سے نکال دیں گے اور خاموشی سے طلائی نگین لے کر یہاں سے چلے جائیں گے۔“

”آپ بار بار طلائی نگین کا تعلق اس حویلی سے جوڑ رہے ہیں“ وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا ”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کا مطلوبہ مسروقہ نگین اس حویلی میں نہیں ہے۔“

”یہ یقین تم کس بنا پر دلا رہے ہو؟“ میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

وہ ترکی بہ ترکی بولا ”آپ کے پاس کیا ثبوت ہے اس بات کا کہ بھائی صاحب نے کسی دلشاد بیگم کا نگین چوری کروا کے اس حویلی میں چھپا رکھا ہے؟“

”سب سے بڑا ثبوت رب نواز کا اقبال جرم ہے“ میں نے تحمل لہجے میں کہا ”پھر ابھی ہم خانہ تلاشی میں جب وہ مسروقہ نگین برآمد کر لیں گے تو اس ثبوت کی توثیق ہو جائے گی یعنی رب نواز کے کے بیان پر مہر تصدیق ثبت ہو جائے گی۔“

وہ برہمی سے بولا ”آپ بار بار حویلی کی تلاشی کی بات کر رہے ہیں۔ کیا آپ اپنے ساتھ خانہ تلاشی کا وارنٹ لے کر آئے ہیں؟ اتنا قانون تو میں بھی جانتا ہوں کہ آپ عدالت کی اجازت کے بغیر ہماری حویلی کی تلاشی نہیں لے سکتے۔ پہلے آپ عدالت کا اجازت نامہ دکھائیں پھر آگے بات ہوگی۔“

”مجھے خوشی ہوئی ہے فیاض احمد کہ تم کم از کم اتنا قانون تو جانتے ہو“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا ”تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ میں کچا کام کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ میں نے پہلے عدالت سے سرچ وارنٹ حاصل کیا ہے اس کے بعد ہی تمہاری حویلی کا رخ کیا ہے“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا ”اور یہ بات کان کھول کر سن لو میں حویلی کی تلاشی لینے بغیر یہاں سے

انتہاء رہی۔ انتہائی بیش قیمت طلا کی جڑاؤ نگن میری آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہا تھا۔ صندلی بکس پر کندہ نقش و نگار بھی ماہرانہ فن کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ نگن میں جڑے ہوئے قیمتی پتھر جگمگا رہے تھے۔ وہاں پر موجود ہر شخص اس منظر سے حیرت زدہ تھا۔ ملک فیاض احمد کی حالت دیدنی تھی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچا ہوگا کہ مسروقہ طلا کی نگن واقعی اس کی حویلی سے برآمد ہو سکتا تھا۔

میں نے نگن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فیاض احمد سے پوچھا، ”چھوٹے ملک صاحب! اب آپ کیا کہتے ہیں اس نگن کی برآمدی کے بارے میں؟“

”مجھے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یقین نہیں آ رہا،“ وہ کلت زدہ لہجے میں بولا۔

میں نے کہا، ”اب یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے فیاض احمد! چوری کا مال تمہاری حویلی سے برآمد ہوا ہے۔ ہماری تحویل میں ایک ایسا شخص موجود ہے جو اس نگن کی چوری کا اقرار کر چکا ہے۔ اس نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ نگن کو چرانے کی واردات بڑے ملک دلدار کے ایما پر کی گئی ہے۔ اب تم خود اندازہ لگاؤ موجودہ صورت حال میں تمہارے بھائی صاحب کتنی بڑی مصیبت میں گرفتار ہونے والے ہیں۔“

وہ ہونفوں کی طرح ایک ایک کی شکل دیکھ رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ مہمان اے ایس آئی نے صندلی بکس کے کسی خفیہ خانے کا ذکر کیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ نگن کے نیچے اس خانے میں کوئی قیمتی دستاویز بھی موجود ہے۔ میں نے سب کے سامنے خفیہ خانے کی تلاشی لیتا مناسب نہ سمجھا اور بکس کو اپنے قبضے میں لیتے ہوئے فیاض احمد سے کہا۔

”چھوٹے ملک جی! جب آپ کے بھائی صاحب سیاسی دورے سے واپس آئیں تو انہیں سیدھا میرے پاس تھانے بھیج دیں۔ اگر انہوں نے میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا تو میں اس مسئلے کا کوئی حل نکالنے کی کوشش کروں گا۔“

وہ ”بھرپور تعاون“ کا مطلب یقیناً یہی سمجھا ہوگا کہ میں نے ان سے کوئی موٹی رقم توڑنے کے موڈ میں ہوں۔ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”آپ فکر ہی نہ کریں تھانے دار صاحب! ہم آپ کی ہر خدمت کے لیے تیار ہیں۔ میں بھائی صاحب کو ساری بات اچھی طرح سمجھا دوں گا۔“

میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا، ”وہ تمہاری بات سمجھ جائیں تو ان کے حق میں بہتر ہی رہے گا۔“

میں نے یہ جملہ ذومعنی انداز میں ادا کیا تھا تا کہ اس کی غلط فہمی برقرار رہے اور وہ کسی قسم کی ہوشیاری یا

جاؤں گا نہیں۔ مجھے امید ہے میں مال مسروقہ ضرور برآمد کر لوں گا۔“

وہ میرے لہجے کی سنگینی کو بھانپ گیا اور اس میں پوشیدہ دھمکی کو محسوس کرتے ہوئے بولا، ”ٹھیک ہے آپ بہ خوشی ہماری حویلی کی تلاشی لیں لیکن اس سے پہلے میں سرچ وارنٹ دیکھنا چاہوں گا۔“

”یہ تمہارا حق ہے فیاض احمد!“ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا، ”تم قانوناً مجھ سے سرچ وارنٹ دیکھنے کا مطالبہ کر سکتے ہو۔ میں ابھی تمہیں خانہ تلاشی کا عدالتی اجازت نامہ دکھاتا ہوں۔“

پھر میں نے اپنی جیب میں سے سرچ وارنٹ نکال کر ملک فیاض احمد کے سامنے کر دیا۔ وارنٹ کا جائزہ لینے کے بعد اس کی مدافعت دم توڑ گئی۔ کم زور سے لہجے میں بولا۔

”ہم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ آپ بہ خوشی حویلی کی تلاشی لے سکتے ہیں۔ ابھی دودھ کا دودھ اور پانی پانی ہو جائے گا۔“

”میں بھی یہاں پہنچنے کی ضرورت ہے“ میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

وہ پوری طرح ہری ہری ہو گیا۔ ”مجھے نہیں سکایا ہو سکتا ہے اس نے میری بات توجہ سے نہ سنی ہو حیرت بھرے لہجے میں مستفسر ہوا، ”آپ یہاں لپکا کرنے آئے ہیں؟“

”دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی“ میں نے پر زور لہجے میں کہا۔

وہ برا سامنے بنا کر رہ گیا۔

اگلے ہی لمحے میرے ساتھ آئے ہوئے پولیس اہلکار ملک دلدار کی حویلی میں پھیل گئے۔ زنان خانے کو ہم نے ٹچ نہیں کیا تھا۔ اس کے علاوہ حویلی کا کون کوئی اور کونہ کا چپا چپا چھان مارا۔ ہمارا نشانہ خصوصاً ملک دلدار کے استعمال کی وہ جگہیں تھیں جہاں نگن کو چھپائے جانے کے امکانات زیادہ تھے۔ چھوٹا ملک فیاض احمد ہمارے ساتھ ساتھ تھا۔ دو گھنٹے کی تلاش بسیار کے بعد آخر ہمیں کامیابی حاصل ہوئی۔

وہ حویلی کا ایک بیرونی کمر تھا اور ان دنوں ”انکشن آفس“ کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ ملک دلدار روز رات کو وہاں سیاسی میٹنگ کرتا تھا۔ مذکورہ کمر اہل نما تھا جس میں دیواروں کے ساتھ صوفے لگے ہوئے تھے۔ ایک جانب ملک کی اپنی نشست تھی وہ کرسی صدارت قسم کی ایک آرام دہ نشست تھی۔ ملک دلدار کی کرسی کے پیچھے ایک اتنی الماری تھی۔ اسی الماری کے ایک خفیہ خانے سے ہمیں ہمارا مطلوبہ صندلی بکس مل گیا تھا۔

میں نے جب صندلی کا لکڑی سے تیار کردہ وہ ”6x6x4“ انچ کا بکس کھولا تو میری حیرت کی

چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرے۔

چھوٹا ملک فیاض احمد حالات کی سنگینی کو محسوس کر چکا تھا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ جیسے ہی ملک دلدرا واپس حویلی پہنچے گا وہ اسے اپنے ساتھ لے کر سیدھا میرے پاس تھاانے آ جائے گا۔ مگر میں اس کے وعدے پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا عقل مندی کا یہی تقاضا تھا کہ میں اپنے طور پر ملک دلدرا کو چھاپنے کا کوئی تسلی بخش بندوبست بھی کروں۔ اس کے لیے میرے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب پا چکا تھا۔

ہم جب وہیں تھاانے پہنچے تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ میں نے فوری طور پر چار سادہ لباس پہن کر روٹ کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ ملک دلدرا کی حویلی کے آس پاس موجود رہیں۔ وہ جیسے ہی حویلی میں داخل ہوئے فوراً مجھے اطلاع دی جائے۔ وہ چاروں میرے بھروسے کے آدمی تھے، تہایت ہی موقع شناس اور ہوشیار قسم کے۔ گمرانی کے کاموں میں انہیں خاص مہارت حاصل تھی۔ میں پہلے بھی ان کی صلاحیتوں کو آزمایا تھا اور میں نے انہیں اسے دن پایا تھا۔

رب نواز میرے تھاانے کی حالات میں بند تھا۔ میں نے اسے نگن کی برآمدی کے بارے میں بتانا ضروری نہ سمجھا اور سیدھا اپنے کمرے میں آ گیا۔ حوالدار عبد مجر کو میں نے خصوصی ہدایت کر دی تھی کہ فی الحال رب نواز کو حویلی والی کارروائی سے بے خبر رہنے رکھا جائے۔ تو بہتر ہوگا۔

مہمان اے ایس آئی مشکور علی میرے ساتھ ہی کمرے میں آ گیا تھا۔ میں نے اپنے کمرے پر موجود کانشیل کو تاکہ کید کر دی تھی کہ جب تک میں نہ کہوں، کسی کو اندر نہ بھیجا جائے۔ دراصل میں پورے اطمینان سے صندوق بکس کے خفیہ خانے کا معائنہ کرنا چاہتا تھا۔ اے ایس آئی اس کیس کا تفصیلی افر تھا اس لیے اس کی موجودگی میں کوئی حرج نہیں تھا۔

میں نے مشکور علی کے سامنے صندوق بکس کو کھولا۔ طلائی نگن کی چکا چوندر حیران کر دینے والی تھی۔ کسی ستارے بڑی محنت اور کاریگری سے اسے تیار کیا تھا۔ میں نگن کو ہاتھ میں لے کر اس میں جڑے ہوئے قیمتی جواہرات کا جائزہ لینے لگا اور اسی جائزے کے دوران میں اچانک مجھے چونک جانا پڑا۔ میری نگاہ جو نگن کی اندرونی سطح پر پڑی، مجھے حیرت کا ایک جھلکا سا لگا تھا۔

نگن کی اندرونی جانب ایک مختصر سی تحریر کندہ کی گئی تھی..... ”میری جان کے لیے دلدرا!“

اس تحریر سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ نگن دلدرا نامی کسی شخص نے اپنی کسی محبوبہ کو تحفہ دیا تھا۔ ایسا تحفہ جو یادگار کی حیثیت رکھتا تھا۔ مشکور علی بھی وہ تحریر پڑھ چکا تھا۔ اس نے تیز آواز میں مجھے مخاطب

کیا۔

”یہ کیا چکر ہے ملک صاحب!“

”جو بھی چکر ہے تمہارے سامنے ہی ہے مشکور علی!“ میں نے گنیمت آواز میں کہا ”میں تو دلدرا نامی صرف ایک ہی شخص کو جانتا ہوں اور وہ ہے ملک دلدرا آف بصر پور یہ سردار نگن بہ قول تمہارے شام کوٹ کی دستیک بیوہ دلشاد بیگم کی ملکیت ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عین ممکن ہے یہ نگن کبھی ملک دلدرا نے دلشاد بیگم کو تحفے میں دیا ہو۔ تم بتا ہی چکے ہو ملک دلدرا دلشاد بیگم کے مرحوم شوہر کا دوست رہا ہے۔“

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا ”آپ کی بات میں وزن ہے لیکن میں کسی اور زاویے سے بھی سوچ رہا ہوں۔“

”مثلاً کون سے زاویے سے؟“

وہ بولا ”میری جان کے لیے دلدرا..... کے الفاظ سے پتا چلتا ہے کہ ملک دلدرا کے دلشاد بیگم سے کسی دوسری ہی نوعیت کے مراسم تھے۔ آپ میرا اشارہ سمجھ رہے ہیں نا!“

”تمہارا اشارہ بڑا واضح ہے مشکور علی!“ میں نے کہا اور پھر پوچھا ”کیا دلشاد بیگم نے اس سلسلے میں کوئی خاص بات تمہیں بتائی تھی؟“

وہ تامل کرتے ہوئے بولا ”اس نے ایسی کوئی بات مجھے نہیں بتائی تھی“ پھر قدرے بیزار سے لہجے میں بولا ”خیر چھوڑیں اس بات کو۔ میرا خیال ہے، ہمیں صندوق بکس کا خفیہ خانہ کھول کر دیکھنا چاہیے۔“

مجھے اے ایس آئی کا یہ رویہ عجیب سا لگا۔ نگن اور دلشاد بیگم کے ذکر سے پہلو تہی کرتے ہوئے وہ اچانک خفیہ خانے کی جانب مڑ گیا تھا۔ مشکور علی کے اس عمل پر میں نے کسی قسم کا رد عمل ظاہر نہیں کیا اور تھوڑی سی کوشش کے بعد میں نے بکس کا خفیہ خانہ کھول لیا۔

اے ایس آئی نے کہا ”دلشاد بیگم نے بتایا تھا کہ خفیہ خانے میں کوئی اہم دستاویز رکھی ہوئی ہے۔“

”ہاں بھی یہاں کچھ رکھا ہوا نظر تو آ رہا ہے“ میں نے خفیہ خانے میں نگاہ ڈالتے ہوئے کہا پھر

شده چند کاغذ باہر نکال لیے۔

اے ایس آئی حیرت آمیز لہجے میں بولا ”یہ کیا ہے ملک صاحب؟“

وہ بولا ”جناب! یہ معاملہ اب کیسے چھپا رہا ہے۔ لیکن چور رب نواز اس وقت آپ کی تحویل میں ہے۔ اس نے اقبال جرم بھی کر لیا ہے۔ اسی کی فراہم کردہ معلومات پر ہم نے ملک دل دار کی حویلی کی تلاشی لی ہے جہاں سے مال مسروقہ برآمد ہوا ہے۔ ہر چیز باقاعدہ ریکارڈ پر درج ہوتی جا رہی ہے۔ عدالت نے ملک دلدار کی خانہ تلاشی کا اجازت نامہ جاری کیا ہے۔ آپ رب نواز اور ملک دل دار کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کے پابند ہیں..... اور جب ان دونوں کے خلاف قانونی کارروائی ہوگی تو یقینی بات ہے یہ معاملہ علاقے کے لوگوں سے چھپا نہیں رہے گا۔ ملک دل دار پر تو لگتا ہے بہت برا وقت آن پڑا ہے۔ اس نے بہت زیادہ سیانا بننے کی کوشش کی تھی۔ اب یہی کوشش اسے لے ڈوبے گی۔“

وہ جلدی سے بولا ”جی ہاں، جی ہاں۔ میں یہی کہنا چاہ رہا ہوں۔ ملک دلدرا بڑے طمطراق سے فن میں حصہ لے رہا ہے۔ اسے اپنی نیک نامی کی بڑی فکر ہوگی۔ اپنے کردار کو شفاف ثابت کرنے لیے وہ ہر ممکن کوشش کر رہا ہوگا جیسا کہ عام طور پر امیدوار کرتے ہیں۔ اس نازک موقع پر وہ لمحہ بہ

”مجھے بھی ایسا ہی نظر آ رہا ہے مشکور علی!“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا
”بہر حال ہمیں کوئی نیا قدم اٹھانے سے پہلے ملک دلداری کی واپسی کا انتظار تو کرنا ہی ہوگا۔“

مشکور علی نے کہا ”اس کی واپسی میں اب کون سی دیر رہ گئی ہے جناب! آج اکس تاریخ تو گزر
رہی گئی ہے۔ وہ بائیس اگست یعنی کل شام واپس آ جائے گا۔“

میں نے کہا ”تمہارا کیا پروگرام ہے؟“

”اگر آپ اجازت دیں تو میں صبح پہلی گاڑی سے ننگن پور چلا جاتا ہوں۔“ مشکور علی نے کہا
”آپ جانتے ہیں جناب، یہ میرا پہلا کیس ہے۔ یوں سمجھ لیں، بطور تفتیشی افسر یہ میری پہلی کامیابی
ہوئی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس وقت بہت زیادہ خوش محسوس کر رہا ہوں۔ میری اس کامیاب خوشی
میں آپ کا بڑا ہاتھ ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں پہلی فرصت میں اپنے تھانہ انچارج رانا جشید
صاحب کو یہ خوشخبری سناؤں۔ انشاء اللہ میں کل شام سے پہلے ہی واپس بصیر پور آ جاؤں گا۔“

مشکور علی کی خواہش کو ماننے میں مجھے کوئی حرج نظر نہ آیا۔ میں نے اسے جانے کی اجازت
دیتے ہوئے کہا ”کوشش کرنا کہ کل سہ پہر تک واپس آ جاؤ“ پھر میں نے میز پر رکھے ہوئے جیولری
بکس کی جانب اشارہ کیا ”یہ مال مسروقہ فی الحال میرے پاس امانت کے طور پر رہے گا۔ ضروری
قانونی کارروائی کے بعد ہی یہ تھانہ ننگن پور کے حوالے کیا جائے گا۔“

”جی ملک صاحب آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں“ وہ تائید لہجے میں بولا ”آپ مجھ سے
کہیں زیادہ تجربہ کار پولیس افسر ہیں۔ آپ جو مناسب سمجھیں وہ کریں۔ میں رانا صاحب کو اب تک
کی کارروائی کی رپورٹ دے دوں گا۔“

دوسری صبح یعنی بائیس اگست کو جب میں اپنے کمرے میں پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ ایس آئی
مشکور علی ننگن پور جا چکا تھا۔ میں روزمرہ کے کاموں کو نٹانے لگا۔ ملائی ننگن والے دفتر میں جیولری بکس کو
میں نے کل رات ہی ایک انتہائی محفوظ مقام پر رکھ دیا تھا۔ یہ چھوٹا سا بکس اپنے اندر اتنا براہِ طوفان رکھتا
تھا جو اگر منظر عام پر آ جاتا تو ملک دلداری کی ایسی کم تپسی کر سکتا تھا۔ عام حالات میں اس بکس اور اس میں
پائی جانے والی اشیاء کی وہ اہمیت نہیں تھی جو انکسشن کے اس نازک ترین موقع پر تھی۔ یہ ایک ایسی
چنگاری تھی جو ملک دلداری کے سیاسی دشمن کو پلک جھپکتے میں جلا کر خاکستر کر سکتی تھی۔ اس سلسلے میں ملک
کی کوئی وضاحت، کوئی تاویل کام آنے والی نہیں تھی۔ مخالف پارٹی بھی اس کی فکر کی تھی اور ملک کی
معمولی سے معمولی کمزوری کو حاصل کرنے کے لیے ہر لمحہ کوشاں تھی۔

آنے والے حالات سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ ملک دلداری کا بھٹکا بیٹھنے والا ہے اس کا باجائے
والا ہے اور اس کا جلوس نکلنے والا ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی ایٹھ نہیں تھا۔ ملک دلداری نے دلشاد بیگم کا ملائی
ننگن چوری کروا کے اپنی تباہی و بربادی کے پروانے پر دستخط کر دیے تھے۔

دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے مجھے ذرا فرصت ہوئی تو میں نے حوالات میں بند رب نواز کو اپنے
کمرے میں بلالیا۔ حوالات میں گزارا ہوئی دو راتوں نے اس کی رعنائی کو نچوڑ کر رکھا دیا تھا۔ میں
اس وقت کمرے میں اکیلا ہی تھا۔ میں نے اسے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ جھپکتے ہوئے
سکرسٹ کر بیٹھ گیا تو میں نے پوچھا۔

”اب تو تمہیں کوئی شکایت نہیں ہے۔ اس رات کے بعد سے تمہیں کسی نے نہیں مارا نا!“

”مارا تو کسی نے نہیں جناب۔“ وہ سر اسید لہجے میں بولا ”مگر میں پل پل اپنے وجود کے اندر مر
رہا ہوں۔ آپ مجھے جلدی سے باہر نکال دیں تاکہ میں بصیر پور چھوڑ کر کہیں دور نکل جاؤں۔“

”تم بصیر پور کیوں چھوڑنا چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”جناب آپ نے تو مجھے نہیں بتایا لیکن میں نے اڑنی اڑنی سن لی ہے۔“ وہ قدرے خوف زدہ
لہجے میں بولا ”آپ نے ملک دلداری کی حویلی میں چھپا مار کر مسروقہ جیولری بکس برآمد کر لیا ہے اور ملک
صاحب کو بھی آپ چھوڑیں گے نہیں۔ میں جب ان کے خلاف گواہی دوں گا تو وہ میرے کھلے دشمن
بن جائیں گے پھر مجھے جان بچانا مشکل ہو جائیگی۔ میں اسی لیے یہاں سے بہت دور چلے جانا چاہتا
ہوں۔“

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ”تمہیں زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے رب نواز۔ تم
نے اب تک قانون سے تعاون کیا ہے۔ اگر آئندہ بھی تعاون کا ایسا ہی مظاہرہ کرتے رہے تو میں
تمہارے تحفظ کا ضرور بندوبست کروں گا۔ ملک دلداری تمہارا بال بھی بیک نہیں کر سکے گا۔ اب تو وہ ایسی
مصیبت میں گرفتار ہونے والا ہے کہ اسے اپنا آپ بچانا مشکل ہو جائے گا۔“

”آپ کی باتوں سے مجھے تھوڑا حوصلہ مل رہا ہے۔“ وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا ”ورنہ ملک
صاحب کے قہر سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔“

میں نے اسے کریدنے کی خاطر پوچھا ”رب نواز! سچ بتانا، تم نے یہ چوری ملک دلداری کے
کہنے پر کی تھی نا؟“

”رب دی سوں (قسم) ملک صاحب!“ وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا ”میں نے آپ

لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا ”وہ بڑے غصے میں نظر آتا ہے ملک صاحب!“
 ”اوئے بزدل کی اولاد۔“ میں نے کانٹیل کو ڈانٹ پلائی ”ملک دلدار کوئی قیامت تو نہیں جو تو اس قدر گھبراہوا ہے۔ آنے دو اس تیس مار خان کو۔ میں دیکھ لوں گا وہ کتنا بڑا پھنے خان ہے۔ یہ تو اچھا ہی ہوا کہ وہ خود ہی اس طرف آ رہا ہے۔ مجھے حویلی تک جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“
 پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ میں نے ملک دلدار کی گھرائی پر چند سادہ لباس پولیس اہلکار مامور کر رکھے تھے۔ پتا نہیں ان کو کیا ہوا تھا کہ اب تک کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ یہی سوال جب میں نے اطلاع لانے والے کانٹیل سے کیا تو اس نے بتایا ”ملک صاحب! وہ سب بھی ملک دلدار کے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔ دراصل ملک دلدار نے یہ اقدام اتنی تیزی سے کیا ہے کہ ان کو پیشگی اطلاع دینے کی مہلت نہیں مل سکی۔“

اس دوران میں میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کی رب نواز کی حالت خاصی غیر ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر زردی کھند گئی تھی اور آنکھوں میں خوف و ہراس کے سائے لہرا رہے تھے۔ میں نے رب نواز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
 ”تمہارا امتحان آن پانچا ہے رب نواز۔“
 ”مجھے کیا کرنا ہوگا تھانے دار صاحب؟“ وہ کمزوری آواز میں بولا۔

میں نے کہا ”تمہیں سچ کی صدا بلند کرنا ہوگی۔“ میں نے کھوپے والی نگاہ سے اس کا جائزہ لیا پھر سمجھانے والے انداز میں کہا ”رب نواز! تم جو بھی کہو گے سچ کہو گے اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہو گے۔ ایک طرح سے تم یہ سمجھ لو کہ عدالت کے رو برو کھڑے ہو اور سچ کے سامنے تمہاری گواہی ہو رہی ہے۔“
 میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ ملک دلدار دندناتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ اس کا چھوٹا بھائی ملک فیاض احمد بھی تھا جس کی موجودگی میں میں نے حویلی کی تلاشی لے کر منقش جیلوئی بکس برآمد کیا تھا۔ اس کے علاوہ ملک کے چند حواری بھی اس کے ساتھ تھے۔ برآمدے میں موجود پولیس اہلکاروں نے انہیں روکنے کی کوشش کی تھی تاہم وہ ہر رکاوٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے آدھی طوفان کے مانند اندر گھس آئے تھے۔

ملک دلدار کو میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ وہ درمیانے قد کا مالک ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس کی کاٹھی خاصی مضبوط دکھائی دیتی تھی۔ تاہم خط و خال سے وہ ایک غصیلانہ منہ بھٹ اور لاڑ کا نظر آتا تھا۔ ان ’صفات‘ کا اس نے فوراً عملی مظاہرہ بھی کر ڈالا۔ اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے ترش و تلخ لہجے

سے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔ ملک دلدار نے جو حکم دیا میں نے اس کے مطابق عمل کیا تھا۔
 میں نے پوچھا ”کیا تم نے راستے میں نگن والے بکس کو کھول کر دیکھنے کی کوشش کی تھی؟“
 ”نہ جناب! میں ایسی غلطی کیسے کر سکتا تھا۔“ وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا ”ملک صاحب نے خاص طور پر مجھے تاکید کی تھی کہ بکس کو کھول کر دیکھنے کا خیال بھی دل میں نہ لاؤں۔“
 ”اس کا مطلب ہے تم نہیں جانتے کہ اس منقش بکس کے اندر کیا کیا موجود تھا؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھے ہوئے سوال کیا۔

وہ تامل کرتے ہوئے بولا ”طلائی نگن کے بارے میں تو آپ ہی نے مجھے بتایا تھا۔ میں تو صرف یہ جانتا تھا کہ بکس کے اندر کوئی قیمتی چیز ہوگی۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے پوچھا ”تھانے دار صاحب! کیا نگن کے علاوہ بھی بکس میں کچھ اور تھا؟“

”ہاں بہت کچھ تھا۔“ میں نے مبہم سا جواب دیا پھر موضوع کو بدلتے ہوئے پوچھا ”کیا تم عدالت میں بڑے ملک کے خلاف گواہی دینے کے لیے تیار ہو؟“

”اب میں آپ کی پٹائی ہوں جناب۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا ”ملک دلدار تو دیے بھی اس واقعے کے بعد میری جان کا دشمن ہو جائے گا۔ آپ جو کہیں گے میں ضرور کروں گا پھر ملک دلدار کے خلاف گواہی دینا تو کوئی غلط بات نہیں ہوگی۔ اس نے مجھ سے بکس چوری کر دیا ہے یہ ایک حقیقت ہے۔ جب انسان کے سامنے دو راستے ہوں۔ ایک جائی کا اور دوسرا براۓ کا اور ساتھ ہی موت اس کے سر پر کھڑی ہو تو اسے ہمیشہ سچائی کا راستہ اپنانا چاہیے۔ اگر مقدر سے وہ زندہ بچ جائے تو اسے اپنے کیے پر کوئی پشیمانی نہ ہو۔“

”یہ تو تم نے بڑی دانش مندانہ بات کی ہے رب نواز۔“ میں نے سر اٹھاتے انداز میں کہا۔
 ”بس جی میں تو ان پڑھ دیہاتی قسم کا بندہ ہوں۔“ وہ انکسار سے بولا ”مجھ میں دانش مندی کہاں سے آئے گی۔ ایک بات ذہن میں آئی تھی وہ میں نے زبان سے کہہ دی۔“
 ہم باتیں کر رہے تھے کہ ایک کانٹیل بھولی ہوئی سانس کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں اطلاع دی ”ملک صاحب! ملک دلدار تھانے کی طرف آ رہا ہے۔“
 ”ملک صاحب!“ میں نے چونکتے ہوئے دہرایا ”کیا وہ شام سے پہلے ہی بصیر پور پہنچ گیا ہے؟“

کانٹیل نے بتایا ”جناب! ملک دلدار اکیلا نہیں بلکہ اس کے ساتھ چند افراد بھی ہیں۔“ ایک

میں کہا۔

”تھانے دار صاحب! آپ نے بصیر پور میں یہ کیا اندھیر بچا رکھی ہے؟“

مجھے پہلے اس کی آمد اور ازاں بعد اس کا انداز مخاطب سخت ناگوار گزارا تاہم موقع کی مناسبت سے میں نے ضبط کا مظاہرہ کیا اور معتدل لہجے میں کہا ”ملک صاحب! میں نے کیا اندھیر بچا ہے۔ خیر تو ہے آپ بڑے طیش میں نظر آ رہے ہیں؟“

وہ میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا ”کہاں ہے وہ تخم بدرب نواز جس نے میرے خلاف سازش کی ہے۔ میں اس تک حرام کی بوٹی بوٹی کر کے جیل کو وڈوں کو کھلاؤں گا۔“

پھر اس کی نظر ایک جانب کھڑے رب نواز پر پڑ گئی۔ ملک دلدار کی آمد کی خبر سن کر وہ کمرے کے ایک کونے میں چلا گیا تھا۔ ملک دلدار نے قہر آلود نظر سے رب نواز کو دیکھا پھر اس پر جھپٹنے کے لیے آگے بڑھا مگر اس کو شش میں اسے ناکامیابی کا منہ دیکھنا پڑا۔ میرے اشارے پر اے ایس آئی خورشید خان نے اسے شانور سے پکڑ کر روک دیا تھا۔ ملک دلدار کے ساتھ ہی میرے تھانے کے عملے کے چند افراد بھی اندر آ گئے تھے۔ اب مخاطب بہت بوجھکا تھا۔ میں ”آپ“ سے ”تم“ پر اتار آیا۔

میں نے سخت لہجے میں ملک دلدار کو مخاطب کیا ”ملک دلدار! یہ تھانہ ہے تمہاری حویلی نہیں جہاں تم سن مانی کر سکو۔ یاد رکھو اگر اب تم نے کوئی ایسی حرکت کی تو میں طاقت استعمال کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ تم اس وقت کس درجہ میں گھر چکے ہو۔ تمہارے خلاف پہلے ہی میں بہت مائل صلاحیت کر چکا ہوں۔“

”کیا کیا میں نے؟“ وہ اکھڑ لہجے میں بولا۔

”تم نے اپنے ایک ملازم رب نواز سے چوری جیسا سنگین جرم کروایا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”یہ جھوٹ ہے۔“ وہ حلق کے بل چیخا۔

”تمہارا ملازم اقرار جرم کر چکا ہے ملک دلدار۔“ میں نے سننا تے ہوئے لہجے میں کہا ”تمہارے انکار سے صورت حالات مزید تمہارے خلاف ہو جائے گی اس لیے بہتر یہی ہے کہ شرافت سے اپنا جرم قبول کر لو۔“

”میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔“ وہ ہار ہار ”یہ سراسر مجھ پر الزام ہے۔“

”تم کیا کہتے ہو رب نواز؟“ میں نے رب نواز سے پوچھا۔

وہ اپنے لہجے میں ہمت بھر کر بولا ”سچ یہ ہے جناب کہ ملک صاحب نے ہی مجھ سے نگن کی چوری کروائی ہے۔ میں انہی کے حکم پر شام کوٹ گیا تھا پھر دوسرے روز میں نے نگن ان کے حوالے کر دیا تھا۔ میرا مطلب ہے میں نے نگن والا بکس ان کو دیا تھا۔ اب یہ مکر رہے ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔“

”تم بکواس کرتے ہو۔۔۔۔۔۔“ ملک دلدار نے رب نواز کو ایک ناقابل اشاعت گالی سے نوازا

”میں تمہارا لہو پی جاؤں گا۔“

اپنی بات ختم کرتے ہی وہ رب نواز پر جھپٹا مگر اس مرتبہ حوالدار عید محمد اس کے راستے میں آ گیا۔ میں نے عید محمد سے کہا کہ وہ رب نواز کو دہاں سے لے جائے۔ عید محمد نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کی اور رب نواز کو لے کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

میں ملک دلدار کی طرف متوجہ ہو گیا ”ملک دلدار! میں تم سے یہی کہوں گا کہ تم قدم قدم پر اپنی مشکلات میں اضافہ کر رہے ہو۔“ پھر میں نے اسے نگن کی چوری امتیاز علی سے اس کی دوستی ناچاتی اور بعد ازاں لاطلفی دلشاد بیگم سے اس کے خفیہ مراسم معاملات عشق و محبت اور چار عشقیہ خطوط کی برآمدی کے بارے میں تفصیلاً بتایا اور کہا ”تمہارے لیے اس صورت حال میں یہی بہتر ہوگا کہ اپنے سارے جرائم کا اقرار کر لو ورنہ بری طرح پچھتاؤ گے۔“

”یہ سب جھوٹ ہے“ بکواس ہے بہتان اور الزام ہے۔“ وہ تھر تھراتے لہجے میں بولا ”مجھے تو یہی لگتا ہے کہ رب نواز میری مخالف پارٹی کے ہاتھوں بک گیا ہے اور یہ سب کچھ میری ساکھ خراب کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے لیکن میں ثابت کر دوں گا کہ سچ اور جھوٹ میں بہت فرق ہوتا ہے۔“

میں نے پوچھا ”کیا تم دلشاد بیگم سے اپنے تعلقات سے انکار کرتے ہو؟“

”میں کسی دلشاد بیگم کو نہیں جانتا۔“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔

میں نے کہا ”مگر وہ تو تمہیں اچھی طرح جانتی ہے۔ وہ تمہیں اپنے شوہر کا سابق دوست بتاتی ہے پھر نگن پر کندہ تحریر۔۔۔۔۔۔ عشقیہ خطوط۔۔۔۔۔۔ وغیرہ کو تم کس کھاتے میں فٹ کر دو گے۔“

وہ غصے سے لال پیلا ہوتے ہوئے بولا ”میں سمجھ گیا“ یہ شیر جٹ کی شرارت ہوگی۔“

”کون شیر جٹ؟“ میں نے پوچھا۔

”میرا سیاسی حریف۔“ وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا ”اسی نے چند لوگوں کو خرید کر میرے خلاف

یہ سازش کی ہوگی ورنہ دلشاد بیگم کا مجھ سے کیا واسطہ۔“

”اگر تم دلشاد بیگم سے تعلق سے انکار کرو بھی تو رب نواز کی گواہی کو کیسے جھٹلاؤ گے۔“ میں نے

شکے لچے میں کہا ”یہ تو تمہارا پرانا اور با اعتماد ملازم ہے نا؟“

وہ بولتا بعد میں تھا اور لڑائی پہلے کرتا تھا۔ اس کے روئے سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ایک غصہ و زانا پرست اور جھگڑا لکھنص تھا۔ میرے سوال پر وہ آپ سے باہر ہو گیا۔ پہلے اس نے بشیر جٹ کو مغلظات میں ٹولا پھر دلشاد بیگم اور رب نواز کو اس نے ناپاک جانور گردانتے ہوئے بے ہودگی سے کام لیا۔ آخر میں بڑے دھڑلے سے بولا ”میں نے کچھ نہیں کیا۔ آپ کو چاہیے کہ سازشی عناصر کو گرفتار کر کے عبرت ناک سزائیں دیں لیکن آپ تو الٹا مجھ پر الزام لگا رہے ہیں۔“

”میں انہیں بلکہ تم پر بالکل سیدھا اور سچا الزام لگا رہا ہوں۔“ میں نے حقارت آمیز لہجے میں کہا ”تمہارے ملازم رب نواز کی گواہی ہی تمہارے لیے کافی ہے پھر مال مسرودہ تمہارے چھوٹے بھائی کی وجودگی میں تمہاری حویلی سے برآمد کیا گیا ہے۔ تمہیں گرفتار کرنے کے لیے میرے پاس کافی مواد ہے بلکہ دلہرا!“

”تم مجھے گرا رکرو گے؟“ راجلیج کرنے والے انداز میں بولا۔

”کیوں تم میں کوئی سرفراز ہے پر لگے ہوئے ہیں جو تمہاری گرفتاری کرتے ہوئے مجھے کچھ سوچنا پڑے گا۔“ میں نے تحقیر آمیز انداز میں کہا ”یہ تم کی ریاست کے راجا مہاراجا ہو؟“ وہ میرے طرزِ مخاطب پر سلگ اٹھا۔ بھونک کر بولا ”شاید تمہیں میری طاقت کا اندازہ نہیں تھانے دار۔ میرا دساہو پانی نہیں مانگتا۔“

میں نے کہا ”اور میرا بچہ! ہوا صرف پناہ مانگتا ہے۔“

”میں تمہیں بھی دیکھ لوں گا۔“ وہ پر غرور لہجے میں بولا ”بس ایک دن ٹھہر جاؤ۔“

”یہاں سے جاؤ گے تو کچھ کر دے گا؟“

”تم روکے مجھے؟“

”ہاں‘ میں روکوں گا تمہیں۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا ”جس طرح تمہارے نکاح حواریہ

نواز کوروکا ہے..... حوالات کی سلاخوں کے پیچھے۔“

میرے اس جملے نے جلتی پرتیل کا کام کیا۔ وہ چیخ کر بولا ”وہ غیبتِ شخص میرا نمک خوار نہیں بلکہ نمک حرام ہے۔“ ایک لمحے کو رک کر وہ کف اڑاتے ہوئے دہازا ”ملکِ صفدر حیات! میں نے تمہارے جیسے بہت تھانے دار دیکھے ہیں۔ تمہیں بھی چھٹی چھٹی کا دودھ یاد نہ دلایا تو میرا نام بھی ملکِ دلدار نہیں۔ تم نے مجھے حوالات میں بند کرنے کی بات کی ہے نا۔“ وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا ”تم سے تو

میں بعد میں نمٹ لوں گا، پہلے ایک بہت ضروری کام کر لوں۔“

وہ اپنی بات ختم کرتے ہی برآمدے کی جانب لپکا۔ اس کا انداز بڑا پھرتیلا تھا۔ میں سمجھا وہ تھانے سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔ میرے اشارے پر اے ایس آئی خورشید خان نے آگے بڑھ کر بیرونی راستہ ہلاک کر دیا مگر ملک و لدار نے اچانک ایک ایسی حرکت کی جو ہم میں سے کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔

وہ بجلی کی سرعت سے مڑا اور تھانے کے اندر دنی ہصے کی جانب بڑھ گیا۔ اس کا رخ حوالات کی طرف تھا، پھر سب کچھ پلک جھپکتے ہو گیا "ٹھا میں" ٹھا میں" ٹھا میں"۔ تین گولیاں چلیں اور رب نواز کسی کئے ہوئے شہتیر کی طرح حوالات کے فرش پر گر کر تر پنے لگا۔ اس کے سینے سے نکلنے والا خون اس کے تر پتے پھڑکتے دجو کو بھگونے لگا۔ اس پر جان کنی کا عالم طاری تھا۔ وہ سانس لینے سے عاری تھا۔

چاروں طرف گہرا سناٹا چھا گیا تھا پھر اس سناٹے کو ملک دلدار کی مجھوتا نہ آواز نے توڑا۔ وہ ریوالور ہاتھ میں پکڑے ہدیائی انداز میں چیخ رہا تھا۔

”میں نے مار دیا اس کتے کو۔ ایک حرامی کو ختم کر دیا میں نے..... اب کسی کو غدار ی کرنے کی جرات نہیں ہوگی، کوئی نمک حرامی نہیں کرے گا۔“

ملک دلدرا پر جنونی کیفیت طاری تھی۔ اسے اس بات کا مطلق ہوش نہیں تھا کہ وہ قتل ایسے سنگین جرم کا ارتکاب کر چکا تھا۔ وہ دنیا و مافیہ اسے بے خبر اپنی ہی سنک میں بولتا چلا جا رہا تھا۔ وہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریوالور کو بھی بار بار لہرا رہا تھا۔

”میں سب کو دیکھ لوں گا۔ ایک ایک سے منٹ لوں گا۔ دانشا بیگم، بشیر جٹ، ملک صفدر حیات..... سب کو ختم کر دوں گا۔“

ملک دلدار اس وقت اپنے حواس گم کر بیٹھا تھا۔ وہ اناگزیہ شخص غصے کی آخری ڈگری کو چھو رہا تھا مگر ملک صفر حیات تھانے دار پوری طرح چاق و چوبند تھا اور اپنے فرائض سے ایک لمحہ بھی غافل نہیں ہوا تھا۔

میں نے باز کے مانند جست بھری اور ملک دلدار کو عقب سے دبوچ لیا۔ اس کے دونوں بازو میرے جن چھہ میں مقید ہو چکے تھے۔ میری دیکھا دیکھی میرے تھانے کے مستعد عملے نے ملک دلدار کے چھوٹے بھائی اور ان کے حواریوں کو حراست میں لے لیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ سب حوالات میں پڑے ہوئے تھے۔ یہ وہ حوالات نہیں تھی جہاں رب نواز کا بے جان لاسہ ایک خون آلود گھڑی کے

مانند پڑا ہوا تھا۔

ملک دلدار نے میری گرفت سے نکلنے کی پوری کوشش کی مگر میں نے زور لگا کر اس کے بازوؤں کی ہڈیوں کے کڑا کے نکال دیے۔ تکلیف کی شدت سے وہ کراہ کر رہ گیا۔ ناکامیابی اور بے بسی کے احساس نے اس کے منہ سے گالیوں کا فوارہ چھوڑ دیا تھا۔ میں نے پلک جھپکتے میں اسے جھکڑی پہنا دی۔

تھانے میں آخری دس منٹ میں جو کچھ ہوا تھا وہ سب کی توقع کے خلاف تھا۔ یہ اس سارے کیس کا ٹرنک پوائنٹ تھا۔ چوری کروانے کے جرم میں تو ملک دلدار کو شاید چھوٹی موٹی سزا ہو جاتی مگر قتل کے ذیل میں وہ سیدھا سیدھا پھانسی چڑھ جاتا اور قتل بھی اس نے تھانے میں گھس کر ایک ایسے جہالتی کا کیا تھا جو اس کے جرم کا عینی اور عملی گواہ بھی تھا۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے مہمان اے ایس آئی مشکور علی تھانے پہنچ گیا۔ وہ یہاں پیش آمدہ حالات سے بے خبر تھا۔ جب میں نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ بھونچکا رہ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ بولنے کے قابل ہوا تو حیرت زدہ لہجہ میں بولا۔

”ملک صاحب! یہ سب تو حیرت ناک اور ناقابل یقین ہے۔“

میں نے کہا ”مشکور علی! جو بھی ہوا اس میں قدرت کی کوئی مصلحت ہوگی۔ اللہ کے کام نرالے ہیں۔ اس کو یہی منظور ہوگا کہ ملک دلدار کوئی چھوٹی موٹی نہیں بلکہ ایسی چوڑی سپاہی ہے۔ ہم اس کے کام میں مداخلت کرنے والے کون ہوتے ہیں۔“

مشکور علی نے کہا ”ویسے ملک صاحب! اس غیر متوقع واقعے نے کام آسان کر دیا ہے۔ دلشاد بیگم کا مسروقہ مال برآمد ہو گیا اور اس واردات کے دو مجرموں میں سے ایک جہالتی موت مر گیا۔ دوسرا پہلے کے قتل کے الزام میں پھانسی چڑھ جائے گا۔ شاید اسی کو کہتے ہیں..... خس کم، جہاں پاک۔“

میں نے اے ایس آئی مشکور علی کے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ دوسرے روز میں نے ضابطہ کی ضروری کارروائی کر کے مال مسروقہ اے ایس آئی مشکور علی کی تحویل میں دے دیا۔ وہ میرا شکر یہ ادا کرتے ہوئے خوشی خوشی لگن پور روانہ ہو گیا۔

ملک دلدار کا معاملہ بڑا واضح تھا۔ میں نے اس کے خلاف قتل عمد کا چالان تیار کر کے اسے عدالت کے حوالے کر دیا۔ دن دہاڑے تھانے میں گھس کر درجن بھر پولس اہل کاروں کے سامنے اس نے قتل کیا تھا۔ واقعات و شہدای کی روشنی میں سیشن کورٹ نے اسے موت کی سزا سنائی۔ ملک دلدار

نے اپنی ملاقات اور دولت کے بل بوتے پر سیشن کورٹ کے فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کر دی مگر ہزار سر پہنچنے کے بعد بھی خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہوئے۔ ہائی کورٹ نے سیشن کورٹ کے فیصلے کی توثیق کر دی تھی۔

بظاہر یہ کہانی یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ ملک دلدار اور دلشاد بیگم کا قصہ اختتام پذیر ہو چکا مگر کاتب تقدیر کو ابھی کچھ اور تماشے منظور تھے۔ ایک سال کے بعد مجھے ایک خط موصول ہوا جس نے ماضی کے صفحات پر جم جانے والی گرد کو ہٹا دیا۔

وہ ایک عام سالخیز تھا جو ڈاک کے ذریعے آیا تھا اور مجھے تھانے کے پتے پر موصول ہوا تھا۔ میں نے لفافہ چاک کیا اور اندر سے برآمد ہونے والا شدہ خط کھول کر پڑھنے لگا۔ نسوانی تحریر میں لکھا گیا تھا۔

”تھانے دار صاحب!“

ہم زندگی میں کبھی نہیں ملے مگر غائبانہ طور پر ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ شاید میں آپ سے کبھی رابطہ نہ کرتی مگر ضمیر کی خلش نے میری راتوں کی نیند اور دن کا چین غارت کر کے رکھ دیا ہے۔ میں نہ سو سکتی ہوں نہ جاگ پاتی ہوں۔ کھانا پینا مجھ پر حرام ہو گیا ہے۔ اب اتنا سا طلق سے اتار لیتی ہوں کہ زندگی برقرار رہے حالانکہ مجھے زندہ رہنے میں بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔

”آپ بھی سوچتے ہوں گے میں عجیب عورت ہوں۔ ایک ہی وقت میں دو مختلف قسم کی باتیں کرتی ہوں۔ یقین جانیں میں ایسی تھی نہیں بلکہ ہو گئی ہوں اور اس کا سبب ہے..... رب نواز کی روح فرسا موت..... اس موت نے میرے حواس، میرے اعصاب اور میری روح کو چھنچھوڑ کر رکھ دیا ہے۔“

”ٹھہریں میں فروغ اور ادھر ادھر کی باتوں کو چھوڑ کر ترتیب سے اپنی کہانی آپ کو سناتی ہوں۔ امتیاز علی میرا شوہر ضرور تھا مگر وہ معاملات خلوت کی اہلیت نہیں رکھتا تھا پھر ملک دلدار کا ہمارے گھر آنا جانا شروع ہوا۔ دلدار امتیاز کا دوست تھا اس لیے اس سے پردہ کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کچھ عرصے کی میل ملاقات کے بعد میں بہک گئی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دلدار نے اپنی چکنی چیزیں باتوں سے مجھے بہکا دیا۔ میں آہستہ آہستہ اس کے ٹرائس میں آتی گئی۔ وہ مجھ سے عشق کا دعوے دار تھا۔ سچی بات تو یہ ہے مجھے بھی اس سے محبت ہو گئی تھی۔“

”دلدار روز اول ہی سے بدنیت تھا۔ میں اس کی محبت کے سنہری جال میں پھنس کر رہ گئی۔ ایک روز اسی محبت کے سایے میں دلدار نے مجھے حاصل کر لیا پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ وہ بار بار مجھے حاصل کرتا

رہا اور میں اس کی جھوٹی محبت میں اپنا سب کچھ اس پر بھجوا کر کرتی رہی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ امتیاز ہمارے تعلقات سے بالکل ہی بے خبر ہو۔ پھر ایک روز اس نے ہمیں بگے ہاتھوں پکڑ لیا۔

”ہوتا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ اپنے مارا آستین دوست اور اپنی بے وفا بیوی کو اسی وقت ختم کر دیتا مگر امتیاز بہت بزدل مرد تھا۔ بے غیرتی کی حد کو چھوٹا ہوا بزدل۔ وہ ہمارے خلاف کوئی کارروائی کرنے کے بجائے خود ہی مر گیا۔ ہمیں قابل اعتراض حالت میں دیکھ کر اسے دل کا دورہ پڑا اور وہ.....

”امتیاز کی موت کے بعد میں نے دلدار سے شادی کا تقاضا کیا تو اس نے آنکھیں پھر لیں اور شام کوٹ کا راستہ بھول گیا۔ میں یہ نہیں کہتی کہ ہمارے درمیان جو کچھ ہوتا ہا اس میں سراسر دلدار تصور وار ہے۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ میں برابر کی خطا وار تھی مگر امتیاز کی موت کے بعد دلدار کی طوطا چوٹی نے میرا دل خون کر دیا۔ مجھے مرد ذات سے نفرت ہو گئی۔ امتیاز علی اگر بزدل اور بے غیرت ثابت ہوا تھا تو دلدار نے بیٹھ کر اپنی مردانگی کے چہرے پر کالک ل لی تھی۔ اس نے محبت میں مجھے دھوکا دیا تھا۔ میرے دل میں اس کے لیے نفرت کا طوفان اٹھ آیا۔ میں دلدار سے بھی ایک انتقام لینے کے لیے کسی مناسب موقع کا انتظار کرنے لگی اور بالآخر تین سال بعد مجھے وہ موقع مل گیا۔

”ایکشن کی آمد آدھی اور میں نے معلوم کر لیا کہ دلدار ایکشن میں کھڑا ہو رہا ہے۔ میں نے دلدار کے خاص ملازم رب نواز کو شے میں اتار لیا۔ اس کام میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ عورت کی طاقت کا کوئی حد نہیں ہوتا۔ وہ جب کسی کام کی ٹھان لیتی ہے تو اپنے راستے کی ہر رکاوٹ کو ٹھوکروں میں اڑا دیتی ہے۔ رب نواز تو میرے لیے نہایت ہی آسان ٹارگٹ تھا۔ میں نے بارہا یہ محسوس کیا کہ وہ مجھے پسندیدہ نظر سے دیکھتا تھا۔ عورت کی ایک مخصوص نظر کو بہ خوبی محسوس کر لیتی ہے۔ رب نواز کئی مرتبہ دلدار کے ساتھ ہمارے گھر شام کو آیا تھا۔ میں نے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔ میں نے اپنی اداؤں سے اسے یقین دلایا کہ اگر وہ میرا کام کر دے تو میں ساری زندگی کے لیے اس کی ہو جاؤں گی۔ کام صرف اتنا تھا کہ طلائی کنگن والا صندوق صندلی بکس میرے گھر سے ملک دلدار کے گھر پہنچاتا تھا۔ اس کے بعد پیش آنے والے ملکہ حالات کے بارے میں بھی میں نے اسے بتا دیا تھا۔ وہ پہلے تو اپنے مالک کے خلاف کام کرنے کے سلسلے میں پس و پیش سے کام لینے لگا۔ اس موقع پر میں نے اسے بزدلی کا طعنہ دیا۔ میں نے بڑے واضح انداز میں اسے باور کرایا کہ ایک طرف ملک دلدار سے وفا کر کے اس کے لیے ساری زندگی کی غلامی ہے اور دوسری جانب میری خاطر قربانی دے کر میرے جسم و جان کا بلا شرکت غیرے مالک و مختار بننے کا

اعزاز ہے۔

”چند لمحے فیصلے کی سولی پر گزار کر بلا خراس نے میرے حق میں فیصلہ دے دیا۔ میں اپنے عمل سے ملک دلدار کا سیاسی کیریئر ہمیشہ کے لیے داغ دار کرنا چاہتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ ایکشن میں کامیابی اس کا سب سے بڑا خواب تھا۔ جب رب نواز نے مجھے تعاون کا یقین دلایا تو میں نے اپنی پلاننگ کے لیے اسے ایس آئی مشکور علی کو اپنے منصوبے میں شامل کیا۔ مشکور علی کا شمار بھی میرے چاہنے والوں میں ہوتا ہے مگر میں تو دلدار والے واقفے کے بعد سے مردوں سے نفرت کرنے لگی تھی۔ میں نے مشکور سے وعدہ کیا کہ اگر وہ میری پلاننگ کے مطابق تفتیش کرتے ہوئے ملک دلدار کی حوٹلی سے طلائی کنگن والا بکس برآمد کر کے دلدار کی مٹی پلید کرنے میں کامیاب ہو گیا تو میں اس سے شادی کر لوں گی۔ میں نے رب نواز اور مشکور علی کو الگ الگ دو کام سونپے تھے اور ان میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ میں درحقیقت کون سا کھیل کھیل رہی ہوں۔

”بلا خراس اپنے کھیل میں کامیاب ہو گئی..... بلکہ توقع سے زیادہ کامیابی مجھے حاصل ہوئی۔ دلدار ایک قاتل کی حیثیت سے جیل چلا گیا۔ رب نواز حوالات میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا اور اسے ایس آئی مشکور علی.....

”میں مشکور علی کے بارے میں تفصیل میں نہیں جاؤں گی۔ بس چلتے چلتے اتنا ضرور بتاؤں گی کہ طلائی کنگن پر کندہ رومانی تحریر اور صندلی بکس کے خفیہ خانے سے برآمد ہونے والے چار عشقیہ خطوط میرے اپنے ذہن کی پیداوار تھے۔ اس میں دلدار کا چنداں کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ اپنے منصوبے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے میں نے یہ بیچ لگایا تھا جو میری توقع سے زیادہ کامیاب ثابت ہوا۔

”اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لگ بھگ ایک سال بعد میں خط کے ذریعے آپ تک یہ معلومات کیوں پہنچا رہی ہوں..... تو تھانے دار صاحب! یہ معلومات نہیں بلکہ میرے مجرد ضمیر کی چیخیں ہیں جو میں باوجود کوشش کے بھی اپنے اندر نہیں روک سکتی۔ میں اب ایسی جگہ پر ہوں جہاں آپ مجھے تلاش نہیں کر سکتے۔ میں عرصہ ہوا شام کوٹ چھوڑ چکی ہوں۔ شام کوٹ ہی کیا میں تو کنگن پور بلکہ ضلع قصور ہی چھوڑ چکی ہوں۔

”میں زندہ ہوں مگر مردوں سے بدتر۔ میرا ضمیر مجھے ہر پل کچھ کے لگا رہتا ہے۔ میں نے انتقام کی خاطر جو کچھ کیا وہ کسی بھی طرح سراہے جانے کے قابل نہیں۔ میں اس خط میں اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔ ممکن ہے اس نکاسی کے بعد میرا مردہ ضمیر

جاگ اٹھے کیونکہ مردہ ضمیر کے ساتھ زندہ وجود سب سے بڑی سزا ہے جو قدرت کی طرف سے مجھے ملی ہے۔

”مجھے امید ہے اس خط کو پڑھنے کے بعد آپ گڑے مردے اکھاڑنے کی کوشش نہیں کریں گے اور میری تحریر کو ضائع کر دیں گے۔ میں یہ خط کھل کرنے کے بعد خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں نئے سرے جنم لے رہی ہوں۔

”تھانے دار صاحب! میں نے زندگی میں مردوں سے بہت دھوکے کھائے ہیں اور آپ بھی ایک مرد ہی ہیں۔ مردوں کی ازلی سر بلندی قائم رکھنے کے لیے مجھے یقین ہے آپ ایسی کوئی حرکت ایسا کوئی عمل نہیں کریں گے جو میرے اعتماد کی آخری سانس کو گھونٹ دے۔ فقط دلشاد بیگم مقام ناسلوم۔

میں نے دلشاد بیگم کے خط کو دو تین بار پڑھا پھر اسے نذر آتش کر دیا۔ جب میں یہ کر رہا تھا تو میرے ذہن میں صرف ایک بات تھی اور وہ یہ کہ اعتماد کی آخری سانس کو ختم نہیں ہونا چاہیے۔ اعتماد تو اس دنیا کی اساس ہے۔ جس طرح شش تن کے بغیر زمین اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتی بالکل اسی طرح اعتماد کے بغیر زندگی زندگی نہیں رہتی بلکہ شرمندگی میں بدل جاتی ہے۔

معلوم نہیں میں نے غلط کیا یا صحیح؟ ہاں مجھے اطمینان ضرور حاصل ہے کہ میں نے زندگی کو شرمندگی سے بچا لیا۔ آپ کیا کہتے ہیں؟



ستم نصیب:

موسم گرما کی ایک ابر آلود صبح تھی۔ ماہ جولائی اختتام پذیر تھا اور ساون اپنے جوہن پر نظر آتا تھا۔ میں حسب معمول تھانے پہنچا تو پتا چلا علی الصباح ایک شدید ذہنی عورت کو مقامی سرکاری اسپتال میں لایا گیا تھا۔ وہ بے ہوش تھی اور اس کی حالت خاصی تشویش ناک تھی۔

اطلاع ملتے ہی میں نے ایک اے ایس آئی کو ساتھ لیا اور فی الفور مذکورہ اسپتال پہنچ گیا۔ بارش سے بچاؤ کے لیے ہم اپنے ساتھ چھتر پاں لانا نہیں بھولے تھے۔ عورت کو اسپتال پہنچانے والے شخص کا نام عظمت علی تھا۔ عظمت علی اسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وہ علی الصباح اپنے ساتھی کے ہمراہ ٹریکٹر ڈرائی پر شہر کی جانب جا رہا تھا کہ راستے میں دریا کے کنارے اس نے ایک عورت کو بے ترتیب پڑے ہوئے دیکھا چنانچہ اس نے اپنے ہمراہی کو جو ٹریکٹر ڈرائی کا ڈرائیور تھا، ٹریکٹر روکنے کو کہا۔ ڈرائیور مراد علی نے فوری طور پر بریک لگائے۔ بعد ازاں انہوں نے سرسری طور پر اس ذہنی عورت کا جائزہ لیا اور اسے زندہ پا کر شہر کے سرکاری اسپتال لے آئے تھے۔

جب ہم اسپتال پہنچے تو عظمت علی اور اس کا ڈرائیور ساتھی مراد علی وہاں موجود تھے۔ عظمت علی تیس بیس سال کا ایک صحت مند شخص تھا۔ اس نے خاصی بھاری مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں۔ اس کے مقابلے میں مراد علی کی صحت دگرگوں تھی اور وہ اپنے چہرے مہرے سے صدیوں کا بیمار نظر آتا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی عظمت علی تیزی سے آگے بڑھا اور سلام کرنے کے بعد بولا ”سرکار! ہم آپ ہی کا انتظار کر رہے تھے۔ آپ جلدی سے ہمارا ایمان شیان لیں اور ہمیں جانے کی اجازت دیں۔ اگر ہمیں منڈی پہنچنے میں دیر ہوگی تو چوہدری صاحب ہماری

کھال کھینچ لیں گے۔“

اے ایس آئی نے اسے دیکھا مارا ”اڈے چوہدری کے گھوڑے! ذرا چھری کے نیچے دم توڑے اتنی جلدی کس بات کی ہے۔ کیا تمہارا چوہدری کوئی قصائی ہے جو کھال کھینچ لے گا؟“ اور جناب! آپ چوہدری نبی بخش کو نہیں جانتے۔“ عظمت علی کے ساتھی مراد علی نے خوف زدہ لہجے میں بتایا ”وہ ذرا سی بات پر بڑی کڑی سزا دیتے ہیں۔“

اے ایس آئی نے استہزائیہ انداز میں کہا ”اچھا بھئی! پھر تو تمہارے اس جلا چوہدری سے بھی ملنا ہی پڑے گا۔“

میں نے عظمت علی سے استفسار کیا ”عظمت علی! تم جس ڈنمی عورت کو اسپتال لائے ہو وہ کون؟“

میں لڑکی کو نہیں جانتا جناب۔“ اس نے جواب دیا۔

”اچھا تو وہ کونسی لڑکی ہے۔“

”مجھے تو وہ لڑکی ہی لگی تھی۔“ عظمت علی نے کہا ”اس کی عمر زیادہ دکھائی نہیں دیتی۔ میرے

اندازے کے مطابق وہ سولہ سترہ سال کی ہوگی۔“

میں نے پوچھا ”کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اس علاقے کی رہنے والی نہیں ہے؟“

”اگر وہ ہمارے علاقے کی رہنے والی ہوتی تو میں فی الحال اسے پہچان لیتا جناب۔“

عظمت علی نے بتایا ”مجھے یقین ہے وہ کسی دوسرے علاقے سے اس پہنچی ہوگی۔“

ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں خیال آیا تھا ممکن ہے مذکورہ لڑکی یا عورت کو عظمت علی

کی ٹریکٹر ٹرائل سے ہی حادثہ پیش آ گیا ہو اور وہ اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لیے اے ٹرائل میں

ڈال کر اسپتال لے آئے ہوں۔ میں نے اسپتال پہنچتے ہی ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر سے رکتی عورت کے

بارے میں معلومات حاصل کی تھیں۔ مذکورہ عورت بے ہوش تھی اور فی الحال بیان دینے کی حالت

میں نہیں تھی۔ یہ معلوم ہونے کے بعد ہی میں عظمت علی اور اس کے ساتھی کی طرف گیا تھا اور اب

ان سے پوچھنا چھ کر رہا تھا۔

میں نے کہا ”عظمت علی! تم اتنی صبح کہاں سے آ رہے تھے اور کس طرف جانے کا ارادہ تھا؟“

اس نے جواب دیا ”جناب ہم چوہدری صاحب کی زمینوں کی طرف سے آ رہے تھے اور

سیدھے منڈی جا رہے تھے۔“

ڈرائیور مراد علی نے میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا ”ملک صاحب ادھر کھیتوں سے ہم ٹرائل پر گنا لاد کر لارہے تھے جسے منڈی میں پہنچانا تھا۔ خدا کے لیے آپ ہمیں جانے کی اجازت دے دیں نہیں تو چوہدری صاحب ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

اس کی روئی صورت دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ چوہدری نبی بخش کتنا ظالم و جابر شخص ہوگا۔

ویسے میں نے چوہدری نبی بخش کے ”کارناموں“ کی خاصی شہرت سن رکھی تھی لیکن ابھی تک براہ

راست میرا اس سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ اس علاقے میں

تعیینات ہوئے ابھی مجھے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔

میں نے عظمت علی سے کہا ”تم فکر نہ کرو۔ ہم خواہ مخواہ وقت ضائع نہیں کریں گے۔ اگر تم

ساری بات سچ سچ بتا دو تو تمہیں ابھی جانے کی اجازت مل سکتی ہے۔“

اس نے ابھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا ”جناب ساری بات تو میں نے آپ کو بتا دی

ہے۔ اب اور کیا بتاؤں اور رب دی سوئے میں نے ایک بھی جھوٹ نہیں بولا۔“ میں نے اس کی

آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ”تم پورا واقعہ تفصیل سے بتاؤ۔“

ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے بتایا کہ وہ گزشتہ دو دنوں سے چوہدری نبی بخش کی

زمینوں سے گنا ٹرائل میں لاد کر منڈی پہنچا رہے تھے۔ سبزی منڈی میں چوہدری نبی بخش نے ایک

بہت بڑا گودام لے رکھا تھا۔ وہ اپنی زمینوں میں اگنے والے اناج کو اس گودام میں اسٹور کرتا تھا۔

آج حسب معمول عظمت علی گئے سے لدی ہوئی ٹرائل کے ساتھ شہر کی جانب آ رہا تھا کہ دریا کے

کنارے سے اے ایک عورت لیٹی ہوئی نظر آئی۔ اس نے مراد علی سے کہا ”اڈے مرادے ٹریکٹر روک

لے۔ ادھر ایک عورت نظر آ رہی ہے۔“

مراد علی نے بریک لگانے کے بعد ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا ”عظمت علی! تم کس عورت کا

ذکر کر رہے ہو؟“

عظمت علی نے دریا کے کنارے کی جانب اشارہ کیا ”وہ دیکھو اس طرف۔“

”ہاں بھئی۔ ہے تو یہ کوئی عورت ہی۔“ مراد علی نے حیرت آمیز لہجے میں کہا ”پڑیہ ادھر کیوں

پڑی ہوئی ہے؟“

”آؤ دیکھتے ہیں۔“ عظمت علی ٹرائل سے نیچے اتر آیا۔

مراد علی بھی ڈرائیونگ سیٹ سے نیچے کود پڑا اور تشویش ناک لہجے میں بولا ”عظمت علی! ذرا

احتیاط سے۔ کسی مصیبت میں نہ پڑ جانا۔“

اس دوران میں عظمت علی اس عورت کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ وہ بے ترتیب بے سدھ پڑی تھی۔ مراد علی نے اس کے قریب آ کر گھبراہٹ آمیز لہجے میں کہا ”میرا تو خیال ہے یہ مرچکی ہے۔“
عظمت علی نے مذکورہ عورت کی نبض ٹٹولی۔ نبض انتہائی جیسی رفتار سے چل رہی تھی اور اب تپ میں ڈوبنے والی تھی۔ ”مرادے! یہ زندہ ہے۔“ عظمت علی نے کہا ”چلو اسے اسپتال لے چلتے ہیں۔“
”یار خوافزہ مصیبت کو دعوت نہ دو۔“ مراد علی نے کہا ”یہ تو سیدھا سیدھا پولیس کیس دکھائی دیتا ہے۔ کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو ہم لے بیے ہی لگے جائیں گے۔“

عظمت علی نے کہا ”کچھ نہیں ہوتا مرادے۔ ہماری نیت صاف ہے۔“

”نیت کو آج کل کون دیکھتا ہے۔“ مراد علی نے کہا ”تم پر اے پٹھے میں ٹانگ نہ پھنساؤ۔ ہم اسے اسپتال لے کر جائیں گے تو پولیس پہلا شک ہم پر ہی کرے گی۔“

”انسانیت کی کوئی جڑ ہے مرادے۔“

”انسانیت کا دروازہ اپنے دل سے نکال دو۔“ مراد علی نے کہا ”اس کو یہیں پڑا رہنے دو۔ ہمیں پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے۔ پتید کھوٹا نہ کرو۔“

اپنی بات ختم کرتے ہی مراد علی نے ”کلیئر ٹرائل“ کی جانب قدم بڑھا دیے۔ عظمت علی شش و پنج میں مبتلا اٹھ کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ زمین پر پڑی ہوئی بے ہوش لڑکی نے دھیرے دھیرے کراہنا شروع کر دیا۔ عظمت علی نے آواز دے کر مراد علی کو اپنے پاس بلا لیا۔ اسے مزاد علی کو راضی کرنے میں خاصی دیر لگی۔ بہر حال انہوں نے اس لڑکی کو ٹرائل میں ڈالا اور اسپتال لے آئے۔

میں نے باری باری دونوں سے مختلف سوال کیے۔ دونوں کے جوابات میں یہ نظر نہیں آیا۔ ویسے مجھے وہ دونوں بے قصور دکھائی دیے تھے تاہم میں نے ان کے ساتھ زیادہ نہیں بھاہر نہیں کی۔ بعض اوقات انتہائی معصوم اور بے ضرر دکھائی دینے والے افراد بھی ازاں بعد خاصے خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔

میں نے مراد علی سے کہا ”مراد علی! تم ٹریڈ کیریئر ٹرائل لے کر جلا سکتے ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارا چوہدری تمہاری کھال بٹا دے۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا ”آؤ ہاں ایک بات یاد رکھنا۔ منڈی سے فائرنگ ہو کر سیدھا تھکے آ جانا وہاں تمہارا لپکا پٹکا بیان ہو گا۔“

اے ایس آئی نے اسے گھورتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا ”مرادے! کہیں روفو چکر ہونے کی کوشش نہ کرنا۔ یہ نہ ہو کہ چوہدری تو دیکھتا ہی رہ جائے اور ہم تمہاری کھال.....“

”نہیں سرکار۔“ مراد علی کا ٹوپی کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا ”مائی باپ! میری کیا مجال جو آپ کے حکم سے ایک انچ بھی ادھر ادھر حرکت کروں۔ میں منڈی سے سیدھا تھکانے آؤں گا۔“

”میں بھی جاؤں ملک صاحب!“ عظمت علی نے اجازت طلب نظروں سے میری جانب دیکھا۔
”تم تھوڑی دیر ادھر ہی ٹھہرو۔“ میں نے کہا ”ابھی تم سے کچھ ضروری باتیں ہونا ہیں۔“
میں عظمت علی کو اے ایس آئی کی نگرانی میں چھوڑ کر زخمی لڑکی کی خبر گیری کے لیے اندر پہنچ گیا۔ عظمت علی کو میں نے اس لیے روک لیا تھا کہ اس کے ساتھ میں جاے وقوعہ کا جائزہ لینا چاہتا تھا..... وہ جگہ جہاں وہ لڑکی انہیں ملی تھی۔

میں نے اس لیڈی ڈاکٹر سے ملاقات کی جس نے زخمی لڑکی کا طبی معائنہ کیا تھا۔ وہ دبیلے پتلے جسم کی مالک ایک ادھیڑ عمر عورت تھی تاہم اس کی خوب صورتی اور خوش اخلاقی میں کوئی کلام نہیں تھا۔ وہ اپنے پیشے میں بھی خاصی ماہر دکھائی دیتی تھی۔

میرے استفسار پر اس نے بتایا ”ملک صاحب! لڑکی کو بڑی بے دردی سے زد و کوب کیا گیا ہے۔ اس کے جسم پر جا بجا تشدد کے نشانات پائے گئے ہیں۔ دست درازی اور مار پیٹ کے علاوہ اس پر مجرمانہ حملہ بھی کیا گیا ہے اور بڑی درندگی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔“
”اوہ!“ میرے سینے سے ایک افسوس ناک سانس خارج ہوئی۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا ”کیا میں اس کا بیان لے سکتا ہوں؟“

”فی الحال تو یہ ممکن نہیں ہے۔“ لیڈی ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔
”اس کی حالت خاصی ناگفتہ بہ ہے۔ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے نیند کا انجکشن دیا ہے۔ اس کا فوری طور پر ہوش میں آنا اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ شدید ترین جذباتی و ذہنی صدمے سے دوچار ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے ابھی وہ بیان دینے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ ممکن ہے شام تک اس کی حالت کچھ سنبھل جائے۔ ویسے میں نے ضروری ٹریٹمنٹ شروع کر دیا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا ”میں اس کا بیان لینے شام کو آؤں گا۔“

”ہاں! یہ مناسب رہے گا۔“

میں نے اس جگہ کا بغور جائزہ لیا۔ وہ دریا کا کنارہ تھا۔ دریا کے ساتھ ساتھ ایک کچی سڑک شہر کی جانب جاتی تھی۔ عظمت علی کی ٹریکٹر ٹرائی اسی سڑک پر جا رہی تھی جب اسے دریا کے کنارے وہ لڑکی پڑی ہوئی دکھائی دی تھی۔ میں نے وقوعہ کی زمین کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ بارش کے باعث زمین نم آلود تھی اور قدموں کے نشانات واضح نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ نشانات ان افراد کے ہوں گے جو وہاں سے گزرتے رہے تھے۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ زخمی لڑکی ننگے پاؤں تھی۔ اس کے قدموں کے نشانات کا اندازہ لگانا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ ننگے پاؤں کے نشانات کے ساتھ ساتھ کسی مردانہ پاؤں کے نشانات بھی بڑے واضح دکھائی دے رہے تھے۔ مراد پاؤں اور زنانہ ننگے پاؤں کے نشانات دریا کے کنارے واقع جھاڑیوں کے اندر دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان نشانات سے پتا چلتا تھا کہ مذکورہ لڑکی خود کو بچانے کے لیے جھاڑیوں میں چاروں طرف دوڑتی پھری ہوگی۔ جھاڑیوں میں ایک جگہ خون کے قطروں کے نشانات بھی پائے گئے تھے جو یقینی طور پر زخمی لڑکی کے خون کے نشانات تھے۔ ایک بات تو یقینی تھی کہ اسپتال میں بے ہوش پڑی اس اجنبی لڑکی کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا تھا، ان ہی جھاڑیوں میں ہوا تھا۔

میں نے گھوم پھر کر گرد و نواح کا جائزہ لیا۔ ان جھاڑیوں میں سے دور سے نکلتے تھے۔ ایک پگڈنڈی نما راستہ قریبی گاؤں کی طرف جاتا تھا۔ یہ وہی گاؤں تھا عظمت علی اور مراد علی جہاں کے رہائشی تھے اور چوہدری نبی بخش جس گاؤں کا مطلق العنان فرماں روا تھا۔ دوسرا راستہ ریلوے اسٹیشن کی جانب جاتا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن تھا مین لائن سے ہٹ کر واقع تھا۔ یہاں سے دن بھر میں اکا دکا ٹرینیں ہی گزرتی تھیں۔

عظمت علی اور اس کا ساتھی مراد علی اس بات کی تصدیق کر چکے تھے کہ وہ مذکورہ لڑکی کو نہیں جانتے اور یہ کہ وہ اس گاؤں کی رہنے والی بھی نہیں تھی۔ میرے ذہن میں ایک سوال نے سر ابھارا، ممکن ہے لڑکی کسی دوسرے گاؤں یا شہر سے یہاں آئی ہو اور ناگہانی صورت حال سے دوچار ہو کر اسپتال پہنچ گئی ہو۔ میں نے اپنے اس خیال کی تصدیق کے لیے لڑکی کے قدموں کا کھرا ڈھونڈنا شروع کیا۔ میں لڑکی کے ننگے پاؤں کے نشانات کی راہ نمائی میں جھاڑیوں میں چلتا رہا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد مجھے ایک جھاڑی میں ایک دوپٹا الجھا ہوا دکھائی دے گیا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ دوڑتے ہوئے اس لڑکی کا دوپٹا اس جھاڑی میں انکب گیا ہوگا۔ اسی جھاڑی کے نزدیک

میں نے پوچھا ”لڑکی کے بارے میں کچھ پتا چلا یہ کون ہے؟“
”ابھی تک تو کچھ پتا نہیں چلا۔“ لیڈی ڈاکٹر نے جواب دیا ”ٹریکٹر ٹرائی والوں کا کہنا ہے کہ یہ اس علاقے کی رہنے والی نہیں ہے۔“
”ہاں، انہوں نے مجھے بھی یہی بتایا ہے۔“ میں نے کہا پھر پوچھا ”لڑکی کے پاس کوئی سامان وغیرہ بھی تھا؟“

”نہیں، ایسی کوئی چیز میں نے تو نہیں دیکھی۔“ اس نے جواب دیا ”آپ نے ان لوگوں سے پوچھا جو اسے اسپتال لے کر آئے تھے؟“
”ان سے میں سرسری پوچھ گچھ کر چکا ہوں۔“ میں نے کہا ”ابھی تک اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔“

”آپ اپنی تفتیش جاری رکھیے۔ لیڈی ڈاکٹر نے کہا ”کوئی نہ کوئی سراغ مل ہی جائے گا۔“
میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا ”لڑکی کی حالت کیسی ہے؟“
”لڑکی کی حالت خطرے سے باہر ہے۔“ اس نے جواب دیا ”تاہم اسے جسمانی طور پر فٹ ہونے کے لیے کم از کم دس روز تک اسپتال میں رہنا ہوگا۔“

”اور اس کی ذہنی صحت کے بارے میں کیا خیال ہے؟“
”اس کے بارے میں سر درست کچھ کہا نہیں جاسکتا۔“ میں نے بتایا ”وہ جتنے بڑے جذباتی صدمے سے دوچار ہوئی ہے اس سے سنبھلنے میں کافی عرصہ لگے گا۔“

میں باہر آیا تو امی ایس آئی، عظمت علی سے سوال و جواب میں مصروف تھا۔ میرے جہرے پر چھائی ہوئی فکر کی بدلی کو دیکھ کر امی ایس آئی سمجھ گیا کہ صورت حال خاصی سنگین ہے۔
”ملک صاحب!“ امی ایس آئی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ”یہ اپنا عظمت علی تو بڑا بیباک ہے۔ ہر طرح کے تعاون کے لیے تیار ہے۔ اب آپ کا کیا ارادہ ہے۔“
”تھانے عظمت علی کو روک رکھا ہے۔“

”کہاں ملک صاحب؟“
میں نے کہا ”موقع پر۔“
ہم نے اسپتال سے باہر نکل کر ایک ٹانگا پکڑا اور اس میں بیٹھ کر دریا کی جانب روانہ ہو گئے۔ عظمت علی کی راہنمائی میں مطلوبہ پہنچے۔

مجھے ایک زنانہ سینڈل بھی پڑی مل گئی۔

میں نے قدموں کے نشانات کا تعاقب جاری رکھا۔ اب نیچے پاؤں کے نشانات معدوم ہو گئے تھے البتہ زنانہ سینڈل اور مردانہ جوتے کے نشانات پہلو بہ پہلو بڑے واضح نظر آرہے تھے اور دلچسپ بات یہ تھی کہ یہ قدموں کے نشانات ریلوے اسٹیشن کی جانب سے جھاڑیوں کی طرف آرہے تھے۔ اب اس بات میں کسی شک کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ وہ لڑکی ایک مرد کے ساتھ ریلوے اسٹیشن سے ان جھاڑیوں کی سمت آئی تھی۔ ان ہی جھاڑیوں میں اس کی سمت کو تار تار کیا گیا تھا۔ اس بات کی وضاحت ہونا باقی تھی کہ آیا لڑکی کو برباد کرنے کے بعد زخمی کیا گیا تھا یا اس پر مجرمانہ حملہ کرنے سے پہلے اسے شدید تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ جب تک کہ ہوش میں نہ آتی اور میں اس کا بیان نہ لے لیتا اس وقت تک کوئی حتمی بات کہنا ممکن نہیں تھا۔

ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی۔ ریلوے اسٹیشن کی جانب سے جھاڑیوں کی طرف آنے والے قدموں کے نشانات بڑے ہموار اور پہلو بہ پہلو تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ لڑکی اپنی مرضی سے اس مرد کے ساتھ جھاڑیوں میں پہنچی تھی لیکن جھاڑیوں کے اندر پہنچ کر قدموں کے نشانات میں بے ترتیبی اور افراتفری پائی جاتی تھی جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہاں جو کچھ بھی پیش آیا تھا وہ لڑکی کے لیے غیر متوقع تھا۔

میں نے جائے وقوعہ کا تفصیلی نقشہ تیار کیا۔ ضابطے کی ضروری کارروائی مکمل کرنے کے بعد میں نے اپنی ابتدائی تفتیش کا آغاز کر دیا۔ سب سے پہلے مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ لڑکی کون تھی اور کس علاقے سے یہاں پہنچی تھی۔ اس کا ساتھی مرد کون تھا اور ان جھاڑیوں میں اس کے ساتھ کیا حالات پیش آئے تھے۔ اب یہ بات تو واضح ہو چکی تھی کہ وہ دونوں اسٹیشن سے اس طرف آئے تھے۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ وہ دونوں کسی دوسرے شہر سے یہاں پہنچے ہوں گے۔

میں نے عظمت علی کو جانے کی اجازت دے دی۔ ساتھ ہی یہ بھی تاکید کر دی کہ وہ علاقہ چھوڑ کر کہیں نہ جائے اور ضروری کاموں سے نمٹ کر تھانے آ کر اپنا تفصیلی بیان ریکارڈ کر دے۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میری ہدایات پر عمل کرے گا۔

میں نے لڑکی کے دوپٹے اور سینڈل کو اپنے قبضے میں کیا اور اے ایس آئی کے ساتھ تھانے آ گیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ بعد از دوپہر اسپتال جاؤں گا۔ اگر اس وقت تک مذکورہ لڑکی بیان

دینے کے قابل نہ ہوئی تو ریلوے اسٹیشن سے باقاعدہ تفتیش کا آغاز کروں گا۔

☆☆☆

اس روز خلاف معمول میں تھانے میں اس قدر مصروف رہا کہ دوپہر میں اسپتال جانے کا وقت نہیں مل سکا۔ شام کو میں اسپتال پہنچا تو ایک اندوہ ناک خبر میری منتظر تھی۔ وہاں جا کر مجھے معلوم ہوا کہ صبح جس زخمی لڑکی کو وہاں لایا گیا تھا وہ زندگی کی بازی ہار گئی تھی۔ میرے استفسار پر ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے بتایا ”ملک صاحب! ہم نے اس کی جان بچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی مگر اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔“

میں نے پوچھا وہ لیڈی ڈاکٹر کہاں ہے جس نے صبح اس لڑکی کا طبی معائنہ کیا تھا؟“
”اس کی ڈیوٹی کا وقت ختم ہو چکا ہے۔“ اس نے جواب دیا ”اگر کوئی بہت ہی ضروری کام ہو تو اسے بلایا جاسکتا ہے۔ اس کی رہائش اسپتال سے زیادہ دور نہیں ہے۔“

میں نے کہا ”اے گئے کتنی دیر ہوئی ہے؟“
ڈاکٹر نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے جواب دیا ”میرے خیال میں وہ ایک گھنٹہ قبل اسپتال سے نکلی تھی۔“
”اس کے بعد سے آپ ڈیوٹی پر ہیں؟“
”جی ہاں وہ میرے آنے کے بعد ہی گئی تھی۔“

میں نے پوچھا ”جب سے آپ ڈیوٹی پر ہیں اس لڑکی نے کسی قسم کی کوئی بات کی تھی۔ اپنے بارے میں کوئی بات خود کو پیش آنے والے حالات کے بارے میں کوئی اشارہ یا اس سے ملتی جلتی کوئی بات؟“
”نہیں جناب۔“ ڈاکٹر نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا ”جب سے میں آیا ہوں یہ مسلسل بے ہوش تھی۔ کوئی آدھا گھنٹہ پہلے نرس نے مجھے بتایا کہ لڑکی کی نبض ڈوب رہی ہے۔ میں نے فوری طور پر اس کا معائنہ کیا لیکن میرے آنے سے پہلے ہی اس کی روح قفسِ عمری سے پرواز کر چکی تھی۔“

”اوہ!“ میرے سینے سے ایک تشویش ناک سانس خارج ہوئی ”یہ تو بہت برا ہوا۔“ میں نے اضطرابی لہجے میں کہا پھر پوچھا ”لیڈی ڈاکٹر نے آپ کو اس لڑکی کے بارے میں کچھ بتایا تھا۔ میرا مطلب ہے اس لڑکی نے اسپتال میں موجودگی کے دوران میں اپنے بارے میں کچھ بتایا ہو؟“

ڈاکٹر نے بتایا ”مجھے تو لیڈی ڈاکٹر نے ایسی کوئی خاص بات نہیں بتائی۔ ٹھہریں میں لیڈی ڈاکٹر کو اسپتال بلواتا ہوں۔ ممکن ہے اس سے مل کر آپ کا مسئلہ حل ہو جائے۔“

پھر وہ اسٹاف روم کی جانب بڑھ گیا تاکہ لیڈی ڈاکٹر کو بلوانے کے لیے کسی کو اس کے گھر بھیج سکے۔ میں نے اپنے ساتھ آنے والے کانشیلوں میں سے ایک کو بھیج کر سرکاری فونو گرافر کو بلوا لیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد مذکورہ لیڈی ڈاکٹر اسپتال میں موجود تھی۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا ”لڑکی بے ہوشی کے دوران میں دو تین مرتبہ کراہی تھی۔ پہلے تو میں بھی سمجھی کہ زخموں کی تکلیف کی وجہ سے کراہ رہی ہے۔ میں نے اسے ایک اور سکون آڈیو ریکارڈنگ لگا دیا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر کراہی میں نے محسوس کیا جیسے وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہی ہو۔“

مجھے یاد آیا کہ صبح عظمت علی نے بھی اس لڑکی کے کراہنے کا ذکر کیا تھا۔ جب اس نے ٹریکٹر ٹرائل سے لڑکی کا جائزہ لیا تھا تو وہ ایک دوسرے ہوئے ہوئے لڑکی تھی۔ میں نے لیڈی ڈاکٹر سے سوال کیا۔

آپ نے سننے کی کوشش کی لڑکی کیا کہنا چاہتی تھی؟“

اس نے اثبات میں جواب دیا ”میں نے اس کے کپکپاتے ہونٹوں کے نزدیک کان لگا کر سننے کی کوشش کی تھی۔ میں واضح طور پر تو کچھ سننے میں کامیاب نہیں ہو سکی تاہم اس کی نحیف و نزار آواز میں مجھے ایک نام کی تکرار محسوس ہوئی تھی۔“

”کیسا نام؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”شاید وہ میاں ظلیل کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔“

”میاں ظلیل!“ میں نے زیر لب دہرایا۔

”ہاں وہ کچھ اسی قسم کا لفظ تھا۔“ لیڈی ڈاکٹر نے بتایا ”شاید وہ کچھ اور کہنا چاہ رہی تھی۔ میں نے جو سمجھا وہ آپ کو بتا دیا ہے۔ میرا اندازہ ہے وہ میاں ظلیل ہی کہہ رہی تھی۔ آواز میں چونکہ بے انتہا تھکتی تھی۔ اس لیے اس کے ہونٹوں سے ”مائیں یاں خلیل“ جیسے الفاظ ادا ہو رہے تھے۔ میں نے پوری توجہ سے سننے کی کوشش کی تو میری سمجھ میں آیا ”شاید وہ ”میاں ظلیل“ کہنا چاہ رہی ہے۔“

میں نے لیڈی ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا اور اس نام کو اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا۔ اس وقت تک سرکاری فونو گرافر اسپتال پہنچ چکا تھا۔ میں فونو گرافر کے ساتھ اسپتال کے مردہ خانے کی طرف چلا گیا۔ لڑکی کی لاش کو ابھی تک سرد خانے میں منتقل نہیں کیا گیا تھا۔ وہ ایک چم کی کاؤچ پر سفید چادر کے نیچے ڈھکی ہوئی تھی۔ میرے ایما پر اسپتال کے عملے کے ایک فرد نے لاش کے اوپر سے

میں اس نامعلوم لڑکی کی لاش کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ انیس بیس سال کی ایک حسین و جمیل لڑکی تھی۔ اس نے سوتی کپڑے کا پھول دار جوڑا پہن رکھا تھا۔ اسپتال والوں نے اس کا لباس تبدیل کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔ اس کے کپڑوں پر خون کے دھبوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے جسم پر زخموں کے متعدد نشانات ہوں گے۔ اس کے دونوں ہاتھوں پر بھی زخموں کے نشانات واضح نظر آ رہے تھے جس کا مطلب تھا اس نے حملہ آور کے دار پچانے کی بھرپور کوشش کی ہوگی۔

میرے اشارے پر فونو گرافر نے مختلف زاویوں سے چند تصاویر بنا ڈالیں۔ وہ نامعلوم لڑکی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی مگر اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے گہری نیند سو رہی ہو۔ موت نے اس کے حسن و جمال کو متاثر نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے چہرے پر مہرے اور وضع قطع سے خالص دیہات لڑکی نظر آتی تھی۔ اس کے جسم پر واحد زیور سونے کی ایک تھنی تھی جو اس کی ناک کے ایک تھننے میں موجود تھی۔ اس تھنی میں دو سفید موتی بڑے خوب صورت دکھائی دیتے تھے۔

نامعلوم مصروف اور مظلومہ اب مقتولہ میں تبدیل ہو چکی تھی اس لیے مجھے مزید قانونی کارروائی کرنا پڑی۔ اس سلسلے میں لیڈی ڈاکٹر اور ڈیوٹی نرس کا بیان بھی شامل تھا۔ دوپہر میں مراد علی اور عظمت علی نے تھانے آ کر اپنا باقاعدہ بیان نوٹ کروا دیا تھا۔ ضروری کارروائی مکمل کرنے کے بعد میں نے لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال ہی میں چھوڑا اور اپنے ماتحت عملے کے ساتھ واپس تھانے آ گیا۔

☆☆☆

دوسرے روز میں نے نامعلوم مقتولہ کی ایک تصویر ایس آئی صار حسین کو دے کر اس پاس کے علاقوں میں اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے بھیج دیا۔ ایس آئی کے ساتھ میں نے دو کانشیلوں کو بھی روانہ کر دیا تھا۔ ان کے روانہ ہونے کے بعد میں نے اے ایس آئی اسلم ڈرائیج کو ساتھ لیا اور ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ اس وقت مقتولہ کی دو تین تصویریں میری جیب میں موجود تھیں۔ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ وہ ایک جھوٹا سا قصباتی ریلوے اسٹیشن تھا۔ چونکہ وہ مین لائن پر واقع نہیں تھا اس لیے وہاں ٹرینوں کی آمد و رفت زیادہ نہیں تھی۔ ایسے اسٹیشنوں پر عملہ بھی خاصا آرام طلب ہوتا ہے اور کسی ٹرین کی آمد پر ہی وہ اسٹیشن پر نظر آتے ہیں ورنہ کہیں نہ کہیں پڑے آرام فرما رہے ہوتے ہیں۔

میں نے پوچھ گچھ کا آغاز نچلے طبقے سے کیا۔ یعنی پلیٹ فارم پر موجود ٹھیلے والوں، پھیری

والوں اور قلیوں وغیرہ سے۔ وہ صبح کا وقت تھا اور اس وقت پلیٹ فارم پر اچھی خاصی چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ معلوم کرنے پر پتا چلا کہ ابھی ٹھوڑی دیر میں کوئی ٹرین آنے والی تھی۔ میں نے مختلف لوگوں کو نامعلوم مقتولہ کی تصویر دکھائی اور اس کے بارے میں استفسار کیا لیکن سب نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ میری تلاش مایوسی کی حدوں کو چھونے ہی والی تھی کہ امید کی ایک کرن دکھائی دی۔ ایک پھیری والے لڑکے نے تصویر کو دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں شناسائی کی جھلک دکھائی دی تھی۔ اس لڑکے کی عمر لگ بھگ بارہ سال ہوگی۔ وہ صورت ہی سے ایک غریب اور پس ماندہ لڑکا نظر آتا تھا۔ اس نے گلے میں ایک چھابڑی لٹکا رکھی تھی جس پر وہ بچوں کے کھانے کی چھوٹی موٹی چیزیں فروخت کرتا تھا۔

میرے استفسار پر اس نے بتایا ”میں نے کل شام اس گڑی کو ادھر دیکھا تو تھا جی۔“
”کیا تمہیں یقین ہے تم نے اسی لڑکی کو دیکھا تھا؟“ میں نے دوسری تصویر نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے لائی۔

وہ یقین سے بولا ”موجودہ کسی دھوکا نہیں ہوا جناب۔ مجھے جنگی طراں یقین ہے یہ اسی لڑکی کا فوٹو ہے۔ اس نے مجھ سے ٹافیاں بھی خریدی تھیں۔“
”موجودہ ہارا نام ہے؟“ میں پوچھا۔

اس نے بتایا ”نام تو مجب ہے جی پر لوگوں نے بگاڑ کر موجود بنا دیا ہے اور میرا خیال ہے یہ نام مجھ پر بڑا فٹ بیٹھتا ہے۔ میں ہوں ہی سن موچی۔“

میں نے پوچھا ”کا کا موجود یہ لڑکی اکیلی ہی تھی یا اس کے ساتھ کوئی مرد شرد بھی تھا؟“
وہ ایک لمحے سوچنے کے بعد بولا ”مرد تو کوئی نہیں تھا۔ میں نے تو اسے اسرا کیلے ہی بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔“

”ادھر کدھر؟“

اس نے ایک بیٹج کی جانب اشارہ کیا ”ادھر بیٹھی تھی۔“

میں نے پوچھا ”اس نے تم سے ٹافیاں خریدتے وقت کوئی بات بھی کی تھی؟“

”بڑی خاص بات کی تھی جناب۔“ موجود کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”کیا خاص بات؟“

اس سے پہلے کہ موجود میرے سوال کا جواب دیتا ایک ٹرین دسل بجاتے ہوئے پلیٹ فارم

میں داخل ہوئی۔

”لو جناب! میں تو چلا۔“ موجود نے تیز آواز میں کہا ”باقی گلاں باتاں بعد میں۔“

میرے روکنے کے باوجود بھی ٹرین کی جانب لپک پڑا۔ اس وقت اس کی زبان قہقہے کی طرح چل رہی تھی ”دال سویاں، نکیاں، ٹافیاں، خستہ پتیاں۔۔۔ ریوڑی، بسکٹ، کھٹی میٹھی املی، لو۔۔۔“

اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ہم اس کا انتظار کرنے پر مجبور تھے۔ میں نے اے ایس آئی اسلم ڈانچ کو ہدایت کی کہ وہ موجود پر نظر رکھے اور اسے آنکھوں سے ادھل نہ ہونے دے۔ اسلم نے موجود کے تعاقب میں قدم بڑھا دیے۔ میں پلیٹ فارم کی بیٹج پر بیٹھ کر گاڑی کے روانہ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

وہ ایک پنجر ٹرین تھی۔ رش زیادہ نہیں تھا۔ ٹھوڑی دیر کے بعد ٹرین حرکت میں آئی تو اے ایس آئی موجود کو لے کر میرے پاس آ گیا۔ میں نے چھوٹے ہی اس سے پوچھا۔

”ہاں بھئی کا کا موجود! اس لڑکی نے کون سی خاص بات تم سے کی تھی؟“

وہ تامل کرتے ہوئے بولا ”اس کے پاس ایک لفافہ تھا۔ اس نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ اگر میں وہ لفافہ اس کی ماں تک پہنچا دوں تو وہ مجھے پورا ایک روپیہ بطور انعام دے گی۔“

”پھر تم نے کیا کیا۔“ میں نے پوچھا ”کیا تم نے وہ لفافہ اس کی ماں تک پہنچا دیا تھا؟“
وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا ”نہ جی! میں اس طرح کے کام نہیں کرتا۔ میرے ابا نے سختی سے منع کر رکھا ہے۔“

”تو اس کا مطلب ہے تم نے اس لڑکی کو بھی انکار کر دیا تھا؟“

”آہ جی! میں نے چنا جواب دے دیا تھا۔“

”پھر اس نے کیا کہا؟“

”اس نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے دو روپے انعام دے گی لیکن میں نے پھر بھی اس کی بات نہیں مانی۔ وہ مایوس ہو گئی اور بیٹج سے اٹھ کر ادھر وینٹنگ روم میں چلی گئی تھی۔“

میں نے پوچھا ”کیا تم نے اس لڑکی سے پوچھا تھا کہ اس کی ماں کہاں رہتی ہے؟“

”او جناب! تھانے دار صاحب! جس پنڈ نہیں جانا اس کا راستہ کیا پوچھنا۔“

میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا ”موجود پہلوان! تم خاصے سمجھ دار لگتے ہو۔ کچھ پڑھے لکھے بھی ہو؟“

ان دنوں مغرب کی اذان لگ بھگ سو سات بجے شام کو ہوتی تھی اس کا مطلب یہی تھا کہ جب موجودہ اس نامعلوم لڑکی کو دیکھا تو ساڑھے سات کا وقت ہوگا۔ موجو کے بیان کے مطابق وہ اکیلی تھی اس کے ساتھ کوئی مرد نہیں تھا لیکن حالات و واقعات بتاتے تھے کہ دریا کے قریب جھاڑیوں میں اس کے ساتھ نہ صرف دست درازی کی گئی تھی بلکہ اسے تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد اس کی عزت سے بھی کھلیا گیا تھا یا اسے ہوس کا نشانہ بنانے کے بعد زرد کو بکایا گیا تھا۔ اس کی روح اور جسم پر اتنی کاری ضربات لگائی گئی تھیں کہ وہ اس جذباتی و روحانی صدمے کو جھیل نہیں سکتی تھی اور ہمیشہ کے لیے ہر دکہ تکلیف اور اذیت سے نجات پا گئی تھی۔ اس کے ساتھ پیش آمدہ حالات کا ذمہ دار کوئی مرد ہی ہو سکتا تھا۔ جو ریلوے اسٹیشن سے اس کے ساتھ ان جھاڑیوں میں پہنچا تھا۔

جھاڑیوں کی جانب آنے والے قدموں کے نشانات سے اندازہ ہوتا تھا کہ مقتولہ اس شخص کے ساتھ اپنی رضامندی سے آئی تھی جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ اس شخص کو اچھی طرح جانتی تھی یا یوں کہہ لیں کہ مذکورہ شخص اسے زبردستی اپنے ساتھ نہیں لایا تھا یا پھر ممکن ہے مقتولہ کی کوئی مجبوری کوئی کمزوری اسے جھاڑیوں تک لے آئی تھی لیکن جھاڑیوں کے اندر جو لڑہ خیز واقعہ پیش آیا تھا اس کی مقتولہ کو توقع نہیں ہوگی۔ اب تک کی تفتیش سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ مقتولہ کو ہوس کی بھیشت چڑھانے والا اس کا شناسا تھا اور ریلوے اسٹیشن سے اس کے ساتھ وہ جھاڑیوں میں پہنچی تھی۔

میں نے موجو سے ایک اہم سوال کیا ”کا کا! تم نے اس لڑکی کے پاس کوئی سامان وغیرہ بھی دیکھا تھا؟“

وہ تامل کرتے ہوئے بولا ”میرا خیال ہے اس کے پاس ایک چھوٹی سے گٹھری تھی جو اس نے اپنی گود میں اٹھا رکھی تھی۔“

”اس کے علاوہ اور کچھ؟“

”اور تو کچھ نہیں تھا جناب۔“

میں نے پوچھا ”موجو! تم نے بتایا ہے کہ جب تم نے اس لڑکی کا لٹافہ اس کی ماں تک پہنچانے سے انکار کر دیا تھا تو وہ مایوس ہو گئی تھی اور پلیٹ فارم کی بیچ سے اٹھ کر اندرونی ٹنگ روم میں چلی گئی تھی۔ پھر اس کے بعد کیا ہوا تھا؟“

”اس کے بعد کیا ہونا تھا جی۔“ وہ ہاتھ نہچاتے ہوئے بولا ”جب وہ بیٹنگ روم میں چلی گئی تو

”تین جماعتیں پاس ہوں جناب۔“ وہ فخریہ انداز میں سینہ پھلا کر بولا ”آگے پڑھنے کا شوق تو بہت تھا جناب لیکن ابانے کہا کہ پڑھنے میں کیا رکھا ہے کوئی کام کاج کرو تا کہ گھر میں خوش حالی آئے۔ پھر انہوں نے کسی ریلوے کے ملازم سے بات کر کے مجھے یہاں چھابڑی لگانے کی اجازت دلا دی۔ اس وقت سے یہیں کام کر رہا ہوں۔“

میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا ”موجو! تم نے بتایا ہے کہ وہ لڑکی اکیلی ہی پلیٹ فارم پر بیٹھی تھی لیکن ہماری معلومات کے مطابق اس کے ساتھ ایک مرد بھی تھا۔“

”جی! میں نے دیکھا نہیں۔“

”ابا یہ بتاؤ۔“ میں نے نرم لہجے میں پوچھا ”وہ کسی ٹرین سے اتری تھی یا کسی ٹرین کا انتظار کر رہی تھی؟“

ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا ”جناب! میرا خیال ہے وہ کسی ٹرین سے اتری ہی ہوگی کیونکہ تھوڑے ہی پہلے یہاں ایک ٹرین آئی تھی۔“

”جس وقت تم نے اسے دیکھا وہ ٹرین روانہ ہو چکی تھی یا پلیٹ فارم پر موجود تھی؟“

”آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں جناب۔“ وہ عجب سے لہجے میں بولا ”اگر ٹرین پلیٹ فارم پر موجود ہوتی تو میں بھلا اس کے پاس کیسے جا سکتا۔ ٹرین کے روانہ ہونے کے بعد جب میں پلیٹ فارم پر پھیری لگا رہا تھا تو اس نے اشارہ کر کے اپنے پاس بلایا تھا۔ پہلے مجھ سے ایک روپے کی ٹافیاں خریدیں پھر لٹافہ پہنچانے کی بات کی تھی۔“

”یہ بھی تو ممکن ہے وہ کسی دوسری ٹرین کا انتظار کر رہی ہو؟“

”ناممکن جناب۔“ وہ قطعیت سے بولا۔

”کیا مطلب؟“

”جناب! جس ٹرین کا میں نے آپ کو بتایا ہے نا وہ اس اسٹیشن پر آنے والی آخری ٹرین ہے۔ اس کے بعد صبح تک نہ کوئی ٹرین آتی ہے اور نہ ہی جاتی ہے۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ وہ ٹرین سے اتری ہی ہوگی۔“

میں نے پوچھا ”آخری ٹرین کتنے بجے اسٹیشن پر آتی ہے؟“

”قریب قریب شام کی اذان کے وقت۔“ اس نے جواب دیا۔

میں بھی اپنے گھر چلا گیا تھا۔ آخری گاڑی کے گزرنے کے بعد پلیٹ فارم ویران ہو جاتا ہے اس لیے میں کام ختم کر کے گھر چلا جاتا ہوں۔“

میں نے پوچھا ”تمہارا کیا خیال ہے موجودہ لڑکی رات ویٹنگ روم میں ہی رہی ہوگی یا کہیں چلی گئی ہوگی؟“

میں گھما پھرا کر ایسے سوال محض اس لیے کر رہا تھا کہ موجودہ لڑکی اہم بات جانتا تھا تو اس کے منہ سے وہ بات نکل جائے۔ اس نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”جناب تھانے دار صاحب! میں بھلا کیسے بتا سکتا ہوں وہ ویٹنگ روم میں ہی رہی تھی یا چلی گئی تھی۔ میں تو اپنے گھر چلا گیا تھا۔“

”درا سوچ کر تا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ”اس لڑکی سے بات کرنے کے بعد اور کمرہ بانے سے پہلے تم نے پلیٹ فارم پر کسی اور شخص سے کوئی بات کی تھی؟“ اس کے پاس پرالچھ کے آثار نمودار ہوئے بکھرے ہوئے لمبے میں بولا ”پتا نہیں جناب آپ کس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔“

اس کے انداز سے میں نے محسوس کیا جیسے وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا ”دیکھ موجودہ میں تھانے دار ہوا۔ ذرا دوسری قسم کا۔ دن رات جھوٹوں کے سرداروں سے میرا واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ میں جھوٹ بولنے والوں کے ساتھ بڑا سخت برتاؤ کرتا ہوں۔ تم میرے سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب دیتے ہو یا تھانے لے چکے؟“

اے ایس آئی اسلم ورائج نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا ”اسی تمہاری عمری کیا ہے بچو۔ تھانے کی مار بڑی خوف ناک ہوتی ہے۔ بڑے سے بڑے طرزم خانہ کا پیسہ بٹا ہوا جاتا ہے۔ تم تو ایک رات ہی میں جیس بول جاؤ گے۔“

وہ خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ”تھانے دار صاحب! میں۔۔ ابھی تک آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ مجھے معاف کر دیں جناب۔ میں نے کوئی قصور نہیں کیا۔ مجھے تھانے نہ لے کر جائیں۔ جو کچھ پوچھنا ہے یہیں پوچھ لیں۔“

”اگر تم تھانے کی مار سے بچنا چاہتے ہو تو ملک صاحب جو پوچھتے ہیں اس کا سولہ آنے صحیح جواب دو۔ اے ایس آئی نے سخت لہجے میں کہا ”تھانے جا کر تو تمہارا کچھ مر نکل جائے گا۔ ایک ہی رات میں ثانی دادی خواب میں آ جائے گی۔“

”پوچھیں ملک صاحب!“ وہ رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے لہجہ میں بولا ”میں سب کچھ سچ بتاؤں گا۔“

میں نے پوچھا ”تو پھر بتاؤ کل شام گھر جانے سے پہلے تم نے پلیٹ فارم پر کسی شخص سے بات کی تھی اور کیا بات کی تھی؟“

اس نے تھوک نگل کر حلق ترکیا اور پر خیال انداز میں بولا ”جب میں گھر جانے کے لیے اسٹیشن سے نکل رہا تھا تو باؤ فدا نے مجھے روک لیا تھا۔“

”یہ باؤ فدا کون ہے؟“

”فدا حسین نکٹ باؤ ہیں جناب۔“ موجودہ نے جواب دیا ”ادھر اسٹیشن پر نکٹ گھر کی کھڑکی سے نکٹ دیتے ہیں۔“

میں سمجھ گیا ”موجودہ نکٹ فدا حسین کا ذکر کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا ”نکٹ باؤ فدا حسین نے تمہیں کیوں روک لیا تھا؟“

وہ بولا ”فدا باؤ مجھ سے اس لڑکی کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔“

”کون سی لڑکی؟“ میں نے چونک کر سوال کیا۔

”یہی جناب جس کی تصویر آپ نے مجھے دکھائی ہے۔“ موجودہ نے جواب دیا ”اور جو کل رات بیچ سے اٹھ کر ویٹنگ روم میں چلی گئی تھی۔“

موجودہ کے جواب نے میرے اندر اُمید کی ایک کرن جگمگادی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اہم سراغ میرے ہاتھ لگنے والا ہے۔ میں نے دلچسپ نظروں سے موجودہ کو دیکھا اور ملائمت آمیز لہجے میں سوال کیا۔

”نکٹ باؤ فدا حسین تم سے اس لڑکی کے بارے میں کیا پوچھ رہا تھا موجودہ؟“

موجودہ نے جواب دیا ”باؤ فدا حسین نے مجھ سے پوچھا تھا کہ وہ لڑکی مجھ سے کیا کہہ رہی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ میرے ذریعے کوئی لفافہ اپنی ماں تک پہنچانا چاہتی ہے اور اس کا معاوضہ بھی دینے کو تیار رہے۔ میں نے باؤ کو جب یہ بتایا کہ میں نے اس لڑکی کا کام کرنے سے انکار کر دیا ہے اور وہ مایوس ہو کر ویٹنگ روم میں چلی گئی ہے تو باؤ فدا نے مجھے جھار پلائی اور کہا کہ میں جھلا ہوں۔ مجھے اس لڑکی کا کام کرنے سے انکار نہیں کرنا چاہیے تھا بلکہ باؤ فدا حسین نے اصرار کیا کہ میں اس لڑکی کے پاس جا کر اس سے مذکورہ لفافہ لے آؤں لیکن میں نے باؤ کے بعد اصرار

کے باوجود بھی جب اس کی بات نہیں مانی تو اس نے کہا "اچھا ایسا کرو۔ تم اس لڑکی کو بلا کر میرے پاس لے آؤ۔ میں اس کا لفظ اس کی ماں تک پہنچا دوں گا۔ مجھے اس کام میں کوئی خرابی نظر نہیں آئی اور میں نے باؤ فدا کا پیغام اس لڑکی تک پہنچا دیا۔"

وہ میرے جتس کو ہوا دے رہا تھا۔ میں نے جلدی سے پوچھا "اس کے بعد کیا ہوا؟"

"اس کے بعد کا مجھے پتا نہیں جناب۔"

اے ایس آئی نے اسے کار سے پکڑ کر ایک ہلکا سا جھٹکا دیا اور سخت لہجے میں پوچھا "سچ بچ؟"

"تمہارا پیغام سننے کے بعد وہ لڑکی نکت باؤ فدا حسین کے پاس آئی تھی؟"

"رونی عورت بنا کر بولا "دیکھیں تھانے دار صاحب! آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں سچ بولوں گا تو مجھے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ اب یہ سہاوی مجھے پکڑ کر مارنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اپنا وعدہ یاد رکھیں جناب۔"

"ہمیں اپنا وعدہ دے ہے۔" اے ایس آئی نے خوں خوار نظروں سے اسے گھورا "اگر تم ملک ہو راس کے سوال کا صحیح جواب دو گے تو تمہارا بال بھی بیک نہیں ہوگا۔ بتاؤ وہ لڑکی فدا حسین سے ملنے دینگ روم سے باہر نکلی تھی؟"

"سوہنے رب دی سوں" میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ "وہ گزر گزرنے لگا" مجھے کچھ پتا نہیں وہ لڑکی دینگ روم ہی میں بیٹھی رہی تھی یا باؤ فدا کے پاس لٹاؤ رہنے لگی تھی۔ اللہ پاک کی قسم میں تو باؤ فدا کا پیغام اس لڑکی کو دے کر سیدھا گھر چلا گیا تھا۔ آپ مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں میں نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔"

اس کے لہجے سے سچائی ٹھیک رہی تھی۔ میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا "ٹھیک ہے موجود" میں تمہاری بات پر یقین کر لیتا ہوں مگر یاد رکھا اگر بعد میں تمہارا بیان جھوٹ ثابت ہو تو میں بہت بری طرح پیش آؤں گا۔ پھر کوئی تمہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانے سے نہیں روک سکے گا۔"

"اگر میں جھوٹ بولوں تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔" وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔

میں نے کہا "بس ایک آخری سوال۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا "جب کل شام نکت باؤ فدا حسین سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی تو وہ کہاں کھڑا تھا۔ میرا مطلب ہے وہ نکت گھر کے اندر موجود تھا یا باہر پلیٹ فارم پر کہیں بیٹھا ہوا تھا؟"

موجود نے جواب دیا "باؤ فدا حسین اس وقت جی روم کے دروازے کے پاس کھڑا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے موجود کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا "یہ نہ سمجھنا موجود کہ میں آنکھیں بند کر کے تمہارے بیان پر یقین کر لوں گا۔ میں تمہاری باتوں کی تصدیق بھی کروں گا۔"

"آپ بے شک تصدیق کریں جناب۔" اس کا خوف قدرے کم ہو گیا تھا۔

اے ایس آئی نے کہا "اگر تمہاری ایک بھی بات غلط ثابت ہوئی تو تھانے میں لبا لٹا دوں گا اور وہ چھترول کروں گا کہ آنے والی سات نسلیں..... پیدا ہوں گی۔"

موجود سراسیمہ نظروں سے پہلے اے ایس آئی کو اور پھر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے سرزنش آمیز لہجے میں کہا "ان باتوں کا کسی سے ذکر نہیں کرنا خاص طور پر باؤ فدا حسین کو تو اس کی بھنک بھی نہیں ملنا چاہیے۔"

"آپ فکری نہ کریں جناب۔" موجود پر اعتماد لہجے میں بولا "سمجھ لیں کہ ہمارے درمیان کوئی بات ہوئی ہی نہیں۔ میں اپنی جیب (زبان) میں چندرا (تالا) لگا لوں گا۔"

میں نے موجود کو پلیٹ فارم پر ہی چھوڑا اور اے ایس آئی اسلم وڈا کچ کے ساتھ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

اسٹیشن ماسٹر اپنی سیٹ پر موجود تھا۔ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ مجھے اس علاقے میں تعینات ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنا تعارف کرایا۔

"میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔" میں نے اسٹیشن ماسٹر سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "میں اس علاقے کا نیا تھانے دار ہوں۔" پھر میں نے اے ایس آئی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا "یہ اے ایس آئی اسلم وڈا کچ ہے۔"

اسٹیشن ماسٹر نے پر جوش خیر مقدم کیا اور ہمیں بٹھانے کے بعد ٹھنڈا گرم پوچھنے لگا۔

میں نے کہا "کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے جناب۔ دراصل اس وقت ہم ڈیوٹی پر ہیں۔"

"جی فرمائیں" میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔" اسٹیشن ماسٹر نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنی آمد کی وضاحت کرتے ہوئے کہا "میں اس وقت ایک قتل کی تفتیش کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں۔ امید ہے آپ قانون سے پورا تعاون کریں گے۔"

"قتل..... قتل؟" اسٹیشن ماسٹر اپنی کرسی میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پھر پر تشویش لہجے میں بولا "کون قتل ہو گیا ہے؟"

”ایک نامعلوم پردیس۔“

”لیکن کسی قتل کی تفتیش سے میرا کیا تعلق ہے؟“ اسٹیشن ماسٹر نے پریشان کن لہجے میں سوال کیا۔
میں نے کہا ”جناب! آپ اسٹیشن ماسٹر ہیں۔ اس چھوٹے سے قصبائی ریلوے اسٹیشن کا سارا علم آپ کے نیچے کام کرتا ہے۔ ہم کسی پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے آپ کے علم میں لانا ضروری سمجھتے ہیں۔“
”میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا۔“ اس کی آنکھوں میں الجھن تیر رہی تھی ”ذرا وضاحت فرمائیں
آپ۔“ آخر کار اس نے کہا۔

میں نے مختصر ترین الفاظ میں اسٹیشن ماسٹر کو کل رات جھاڑیوں میں پیش آنے والے واقعے
اور دریا کے کنارے پائی جانے والی زخمی لڑکی کے بارے میں بتایا اور ازاں بعد نامعلوم لڑکی کی
موت کا افساف بھی کر دیا۔ پوری بات سننے کے بعد اسٹیشن ماسٹر نے سوال کیا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا اس پورے معاملے کا مجھ سے یا میرے عملے سے کیا تعلق ہے؟“
میں نے وضاحت آخر لہجے میں کہا ”جناب! ہمیں معلوم ہوا ہے کہ نامعلوم مقتول لڑکی کل
شام اس اسٹیشن پر کسی ٹرین سے اتر گئی اور ویننگ روم میں آپ کے بنگلہ کلرک فدا حسین نے
اس سے ملاقات کی تھی۔ پھر اسی رات بدقسمت لڑکی کو بری بے دردی سے بے آبرو کر کے موت
کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ہمیں آپ کے کلرک بابوند حسین رشک ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس لڑکی
کے قتل میں ملوث ہے۔ ہم درحقیقت فدا حسین سے پوچھنے کے لیے یہاں آئے ہیں۔“

”اوہ!“ اسٹیشن ماسٹر کے منہ سے گہری سانس خارج ہوئی ”بات ہے۔“ اس نے متاسفانہ
لہجے میں کہا ”اگر ایسا ہے تو میں ابھی فدا حسین کو یہاں بلواتا ہوں۔ آپ کو جو پوچھنا ہو چھ لیں۔“
میں نے کہا ”آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔“
اسٹیشن ماسٹر نے ایک چیرا سی صورت شخص کو کمرے میں بلا کر ہدایات جاری کیں کہ وہ فی
الفور کلرک بابوند حسین کو بلا لائے۔

چیرا سی کے جانے کے بعد میں نے پوچھا ”کیا فدا حسین اس وقت ڈیوٹی پر موجود ہے؟“
اس نے دیوار خیر کھاک پر نگاہ دوڑاتے ہوئے جواب دیا ”ہوتا تو چاہیے۔ اس کی ڈیوٹی
دن کی ہے۔“

میں نے پوچھا ”اس کی ڈیوٹی کتنے بجے ختم ہوتی ہے؟“

”شام چھ بجے۔“

”کیا کل بھی شام چھ بجے ہی اس نے ڈیوٹی ختم کی تھی؟“

اسٹیشن ماسٹر نے جواب دیا ”جی ہاں وہ روزانہ اسی وقت ڈیوٹی ختم کرتا ہے۔“
اسی وقت چیرا سی صورت شخص نے آ کر بتایا ”جناب فدا بابو تو آج صبح اپنے پنڈ پلے گئے ہیں۔“
”کیا مطلب!“ اسٹیشن ماسٹر نے برہمی سے کہا ”میرے علم میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔
تمہیں کس نے بتایا کہ وہ اپنے گاؤں چلا گیا ہے؟“

چیرا سی نے جواب دیا ”مطلوب صاحب بتا رہے ہیں۔“
”مطلوب کو میرے پاس بھیجو۔“ اسٹیشن ماسٹر نے تحکمانہ انداز میں کہا اور چیرا سی ”اچھا
سر جی“ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

”عجیب بے ہودہ لوگ ہیں۔“ اسٹیشن ماسٹر نے غصیلے لہجے میں تبصرہ کیا ”وہ مجھے بتائے بغیر
کس طرح گاؤں چلا گیا۔“

تھوڑی ہی دیر میں مطلوب علی نامی وہ شخص اسٹیشن ماسٹر کے سامنے حاضر تھا۔ وہ بھی بنگلہ
کلرک تھا اور فدا حسین کی جگہ ڈیوٹی دے رہا تھا۔ اسٹیشن ماسٹر نے چھوٹے ہی پوچھا۔
”فدا حسین کہاں گیا ہے؟“

مطلوب علی نے جواب دیا ”سر! اس کی والدہ کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی اس لیے وہ
اپنے گاؤں چلا گیا ہے۔ میں اسی کے ایما پر اس کی جگہ ڈیوٹی دے رہا ہوں۔“
”مجھے کیوں اطلاع نہیں دی گئی؟“ اسٹیشن ماسٹر نے پوچھا۔

”سر! فدا حسین علی الصباح یہاں سے روانہ ہو گیا تھا۔“ مطلوب علی نے بتایا ”آپ سے اجازت
لینے یا آپ کو اطلاع دینے کا وقت نہیں تھا۔ اس وقت آپ اپنے دفتر میں موجود بھی نہیں تھے۔“
”بعد میں مجھے کیوں نہیں بتایا گیا۔“ اسٹیشن ماسٹر نے غضب ناک ہو کر سوال کیا ”میں کتنی
دیر سے یہاں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا ہوں۔“

”سوری سر۔“ مطلوب علی نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا ”میں مصروفیت میں بھول گیا تھا۔“
”تم بہت مصروف رہنے لگے ہو مطلوب علی۔“ اسٹیشن ماسٹر نے طنزیہ لہجے میں کہا ”لگتا ہے
تمہاری ڈیوٹی لاہور جنکشن پر لگا دی گئی ہے!“

وہ معافی تلائی کر کے کمرے سے نکل گیا۔ میں نے اسٹیشن ماسٹر سے کہا ”جناب! میرا شک
یقین میں بدلتا جا رہا ہے۔ آپ کا کلرک بابو اس نامعلوم لڑکی کے قتل میں براہ راست ملوث ہے۔“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں ملک صاحب۔“ اسٹیشن ماسٹر کے لہجے میں بے بسی تھی ”اگر وہ یہاں ہوتا تو آپ کے سامنے ساری بات ہو جاتی ہے۔“

میں نے پوچھا ”اسٹیشن ماسٹر صاحب! یہ تو بتائیں! باوجود حسین کون سے گاؤں کا رہنے والا ہے؟“ اس نے جواب دیا ”موضع جھادریاں، تحصیل شاہ پور، ضلع سرگودھا۔“

”اوہ! پھر تو وہ دو چار روز بعد ہی واپس لوٹے گا۔“ میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا پھر پوچھا ”کیا پہلے بھی وہ آپ کو بتائے بغیر اس طرح غائب ہوا ہے؟“

”نہیں جناب! یہ پہلا واقعہ ہے۔“

میں نے پوچھا ”کیا فدا حسین شادی شدہ ہے؟“

اس نے ٹی ٹی میں جواب دیا ”میں نے اگلا سوال کیا ”یہاں پر فدا حسین کی رہائش کس جگہ ہے؟“ وہ سرکاری کوارٹر میں رہتا ہے۔“ اسٹیشن ماسٹر نے بتایا ”ادھر اسٹیشن کی عمارت کے پیچھے

کوئی نصف درجن رہائشی کوارٹر بنے ہوئے ہیں۔“

میں نے پوچھا ”کیا مطلوب علی بھی انہی کوارٹروں میں رہتا ہے؟“

”جی ہاں اس کی رہائش بھی ادھر ہی ہے۔“

”مطلوب علی بھی جھڑا چھانٹ ہے یا اس کی شادی ہو چکی ہے؟“ میں نے سرسری لہجے

میں سوال کیا۔

اسٹیشن ماسٹر نے بتایا ”مطلوب علی نہ صرف شادی شدہ ہے بلکہ اس کے تین بچے بھی ہیں۔“

میں نے پوچھا ”فدا حسین گاؤں جاتے ہوئے اپنے کوارٹر کی چابی مطلوب علی کو دے گیا

ہوگا۔ میں فدا حسین کے کوارٹر کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔ آپ اس سلسلے میں مجھ سے تعاون کریں

گے یا مجھے عدالت سے سرچ وارنٹ حاصل کرنا ہوں گے؟“

اسٹیشن ماسٹر نے مفاہنامہ لہجے میں کہا ”سرچ وارنٹ کی ضرورت نہیں ہے جناب! میں

مطلوب علی کو بلا کر چابی کے بارے میں پوچھتا ہوں۔ اگر چابی اس کے پاس ہے تو آپ میری

موجودگی میں بے دھرم فدا حسین کے کوارٹر کی تلاشی لے سکتے ہیں۔ بصورت دیگر آپ کو فدا

حسین کی واپسی کا انتظار کرنا پڑے گا۔“

”میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے اس کی واپسی کا انتظار نہیں کر سکتا۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا

”میں ابھی تھانے جا کر اپنے آدمیوں کو موضع جھادریاں ضلع سرگودھا روانہ کرتا ہوں۔ وہ فی الفور

اسے پکڑ کر یہاں لے آئیں گے۔ فی الحال تو آپ مطلوب علی کو بلائیں۔“

اسٹیشن ماسٹر نے بنگلہ کلرک مطلوب علی کو اپنے کمرے میں بلا کر فدا حسین کے کوارٹر کی چابی

کے بارے میں استفسار کیا۔ مطلوب علی نے تھوڑے سے پس و پیش کے بعد اقرار کر لیا کہ مذکورہ

چابی اس کے پاس موجود ہے۔ مجھے مطلوب کے رویے نے شک میں ڈال دیا۔ میرے ذہن میں

سوال ابھرا کہیں مطلوب علی بھی تو فدا حسین کے معاملے میں ملوث نہیں۔

میں نے سخت لہجے میں پوچھا ”کہاں ہے وہ چابی؟“

”وہ... وہ چابی ادھر میرے گھر میں پڑی ہوئی ہے۔“

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اسٹیشن ماسٹر سے کہا ”آئیں جناب! جو کچھ بھی ہوگا! آپ کی نگرانی

میں ہوگا۔“

ہم سب ریلوے اسٹیشن کی عمارت کے پچھواڑے بنے ہوئے سرکاری کوارٹروں کی جانب

آ گئے۔ وہ تمام کوارٹر چھوٹے چھوٹے دو کمروں پر مشتمل تھے۔ مطلوب علی نے اپنے کوارٹر کے

دروازے پر پہنچ کر کہا۔

”آپ ذرا یہاں رک کر انتظار کریں۔ میں اندر سے چابی لے کر آتا ہوں۔“

مطلوب علی گھر میں داخل ہو گیا تو میں نے اسٹیشن ماسٹر سے پوچھا ”فدا حسین کتنے عرصے

سے اس اسٹیشن پر نکتہ کلرک کر رہا ہے؟“

”کم و بیش چار سال ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اس دوران میں آپ نے کبھی اس کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات سنی؟“

اسٹیشن ماسٹر نے جواب دیا ”مجھے آج تک اس سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔“

”میرا مطلب ہے فدا حسین غیر شادی شدہ ہے اور کوارٹر میں تنہا رہتا ہے۔“ میں نے

ٹٹولنے والے انداز میں استفسار کیا ”کبھی اس سے متعلق کوئی گزبزدالی شکایت آپ تک پہنچی ہو؟“

وہ میری بات کی تہ میں اترتے ہوئے بولا ”نہیں جناب! فدا حسین اس قماش کا آدمی نہیں

ہے۔ میں نے اس کے بارے میں اس حوالے سے کوئی بات نہیں سنی۔“

وہ گویا فدا حسین کے اچھے کردار کی تصدیق کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا ”اس کے پاس مہمان

تو آتے ہوں گے؟“

وہ سوچتے ہوئے بولا ”چند ماہ قبل فدا حسین کی ماں اور چھوٹی بہن اس کے پاس رہنے آئے

”یہ دنیا ہے جناب۔“ میں نے زنا نہ بالوں کو بھی چوڑیوں والے رومال میں باندھتے ہوئے کہا ”یہاں سب کچھ ممکن ہے۔“

میں ان بالوں کو لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے بھیجنا چاہتا تھا تاکہ اس بات کی تصدیق ہو سکے کہ یہ بال نامعلوم مقتولہ ہی کے تھے۔ ابھی ہمارے درمیان گفتگو ہو رہی تھی کہ باہر سے اے ایس آئی کے آواز آئی۔ اس کی آواز اندرونی جوش سے معمور تھی۔

”ملک صاحب!“ وہ اندرونی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا ”دیکھیں یہ کیا ہے۔“ میں اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سے پوٹلی دیکھ کر چونک اٹھا۔ میرے ذہن میں سوچ کی ایک بات گونج اٹھی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ لڑکی اپنی گود میں ایک چھوٹی سی گھڑی سنبھالے بیٹھی تھی۔ میں نے اے ایس آئی سے سوال کیا۔

”تمہیں یہ گھڑی کہاں سے ملی ہے اسلم؟“

وہ گھڑی میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا ”ملک صاحب! یہ ادھر بیرونی کمرے میں ایک دو چھتی پر پڑی تھی۔ سامنے سے دیکھنے پر بالکل نظر نہ آتی۔ وہاں دو چھتی پر خاصا کاٹھ کباز جمع ہے۔ میں نے اوپر چڑھ کر جب کاٹھ کباز کو ہٹا کر دیکھا تو اس کے نیچے سے یہ برآمد ہوئی ہے۔ اب آپ خود ہی اسے کھول کر دیکھ لیں اندر کیا ہے۔“

میں نے گھڑی کو کھول کر دیکھا۔ اس کے اندر دو زنا نہ سوٹ، ایک پر عذر ریشمی رومال، ایک بند لٹافہ اور سستی قسم کی میک اپ کی چند اشیاء موجود تھیں۔ میری دلچسپی کا سامان وہ بند لٹافہ تھا جس پر محراب پور کا ایئر لیس لکھا ہوا تھا اور وہ لٹافہ کسی ظہور بی بی نامی عورت کے نام بھیجا جا رہا تھا۔ میں موجود کی زبانی اس بند لٹافے کا ذکر سن چکا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ لڑکی موجود کے ہاتھ کوئی لٹافہ اپنی ماں کو بھیجنا چاہتی تھی۔ اس لٹافے کو دیکھ کر یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ وہ لڑکی اپنی ماں ظہور بی بی کو کوئی پیغام بھیجنا چاہتی تھی اور ظہور بی بی محراب پور میں رہتی تھی۔

میں نے کھولے بغیر وہ لٹافہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ میں اسے اطمینان سے پڑھنا چاہتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اس لٹافے میں ہندو مت نامعلوم مقتولہ کے پس منظر پر بھرپور روشنی ڈالے گا۔ اس دوران میں نکٹ بابو مطلوب علی بھی اندرونی کمرے میں پہنچ چکا تھا۔ میں نے اسٹیشن ماسٹر اور نکٹ کلرک کی موجودگی میں فدا حسین کے کوارٹر سے برآمد ہونے والی تمام متعلقہ چیزوں کی فہرست تیار کی اور احتیاط کے طور پر اس پر اسٹیشن ماسٹر اور مطلوب علی کے دستخط کروا لیے تاکہ سند رہے اور یہ

تھے۔ قریب قریب وہ ایک ماہ اس کے پاس ٹھہرے تھے۔“

اسی دوران میں مطلوب علی فدا حسین کے کوارٹر کی چابی لے کر باہر آ گیا۔ ہم اس کی معیت میں فدا حسین کے کوارٹر پر پہنچے۔ مطلوب علی نے چابی لگا کر تالا کھول دیا۔ ہم کوارٹر کے اندر داخل ہو گئے۔ وہ چھوٹے چھوٹے دو کمروں پر مشتمل کوارٹر تھا۔ میں نے اے ایس آئی کو بیرونی کمرے کی تلاشی لینے کو کہا اور خود اندرونی کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ اسٹیشن ماسٹر سائے کی طرح میرے ساتھ ہوا تھا جب کہ نکٹ بابو مطلوب علی اے ایس آئی اسلم وڑاچ کے ساتھ تھا۔

کوارٹر کا حلیہ ویسا ہی تھا جیسا چھترے چھانٹ افراد کی رہائش گاہ کا ہوتا ہے۔ دیواروں پر اداکاراؤں کی تصویریں چسپاں تھیں اور کمرے میں موجود ہر چیز میں بے ترتیبی تھکتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کئی روز سے وہاں صفائی نہ کی گئی ہو۔ میلے کپڑے بستر پر بکھرے پڑے تھے۔ میں نے مختلف چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا لیکن کوئی کام کی بات معلوم نہ ہو سکی۔ میں نے بستر والی چارپائی کے نیچے جھانک کر دکھانے والی سائڈ پر مجھے چند ٹوٹی ہوئی چوڑیاں دکھائی دیں۔

اچانک مجھے اپنے وجود میں کسی ایک نہروڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایک چھترے چھانٹ شخص کے کمرے میں ٹوٹی ہوئی پیرا کی موجودگی جو کہانی سنار ہی تھی وہ کسی تعریف یا تعارف کی محتاج نہیں تھی۔ اسٹیشن ماسٹر بھی چوڑیوں کے ان کپڑوں کو دیکھ کر چونک اٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر استعجابی تاثرات جم کر رہ گئے تھے۔

میں نے با احتیاط ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑوں کو جمع کیا۔ انہیں ایک رومال میں باندھ لیا۔ اس کے بعد میں نے بستر کو الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ بستر کے اوپر ایک دروازہ چادر نیچھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے ہٹایا تو نیچے گدے پر مجھے کچھ زنا نہ بال دکھائی دیے۔ بالوں کی لمبائی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی عورت کے سر کے بال تھے۔ ایسے ہی لمبے لمبے بال کمرے کے ایک کونے سے بھی ملے۔ ٹوٹی ہوئی چوڑیوں اور زنا نہ بالوں کا پایا جانا خالی از علت نہیں تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اس کمرے میں کسی عورت یا لڑکی نے رات گزاری تھی اور اس کے ساتھ دست درازی بھی کی گئی تھی۔

میں نے معنی خیز لہجے میں اسٹیشن ماسٹر نے کہا ”دیکھ رہے ہیں جناب! اس شریف زادے کے کروتوت؟“

وہ حیرت زدہ لہجے میں بولا ”مجھے آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین نہیں آ رہا۔“

وقت ضرورت کام آئے۔

اس کارروائی کے بعد میں نے نکٹ کلرک مطلوب علی کو ہدایت کی کہ وہ اپنی ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد سیدھا تھانے آئے اور اپنا بیان نوٹ کروائے۔ اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور بولا۔

”جناب میرے بیان کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے کیا قصور کیا ہے؟“

”بیان لکھوانے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ کوئی قصور ہی کیا جائے گا۔“ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا ”تم فدا حسین کے ساتھ کام کرتے ہو قریب قریب اس کے پڑوسی بھی ہو۔ وہ تم پر اتنا اعتماد کرتا ہے کہ تمہیں اپنے کوارٹر کی چابی دے کر گیا ہے۔ اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ تم اس کے بہت سے بچے چیدہ اور پوشیدہ معاملات سے بھی واقف ہو گے۔ تمہارا بیان ہمارے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔“

وہ لجاجت آواز لہجے میں بولا ”آپ خواہ مخواہ مجھ پر شک کر رہے ہیں جناب۔ میں فدا حسین کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا۔“

”تم جس حد تک جانتے ہو وہی بتا دینا۔“ میں نے کہا ”اس میں اتنا گھبرانے کی کیا ضرورت ہے؟“

وہ امداد طلب نظروں سے اسٹیشن ماسٹر کی جانب دیکھتے ہوئے بولا ”سرجی! آپ ہی ملک صاحب کو کچھ سمجھائیں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ مجھے کورٹ پکچری کے چکر میں نہ ڈالیں۔“

”اوئے بندے دے پتر!“ اسٹیشن ماسٹر نے اسے ڈانٹ پلائی ”ملک صاحب تمہیں بیان کے لیے تھانے ہی بلارہے ہیں، کوئی پھانسی تو نہیں لگا رہے۔“

وہ قدرے مطمئن ہو گیا لیکن اس کا خوف پوری طرح زائل نہیں ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک تشویش کی چمک چھائیاں بلکورے لے رہی تھیں۔

میں نے فدا حسین کے کوارٹر سے باہر نکلتے ہوئے کہا ”مطلوب علی! تم اس کوارٹر کو دوبارہ تالا لگا دو۔“

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ وہ تالا لگا چکا تو میں نے کہا ”اب یہ چابی اسٹیشن ماسٹر صاحب کو دے دو۔“

اس نے بے چون و چرا وہ چابی اسٹیشن ماسٹر کی جانب بڑھا دی۔ میں نے اسٹیشن ماسٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”جناب! جب تک فدا حسین واپس نہیں آ جاتا اور اس کیس کے سلسلے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہوتی، اس وقت تک یہ چابی آپ کے پاس رہے گی۔ آپ کے پاس یہ قانون کی امانت ہے۔“

اسٹیشن ماسٹر نے تھوڑے بس و پیش کے بعد وہ چابی اپنی جیب میں رکھ لی۔ ہم واپس ریلوے اسٹیشن کی عمارت میں آئے۔ مطلوب علی تو نکٹ گھر کی جانب روانہ ہو گیا اور ہم اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے وہیں پر اسٹیشن ماسٹر کا ایک مختصر سا بیان نوٹ کر لیا۔ اس نے مجھے اس کیس کے سلسلے میں اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ تھوڑی دیر بعد میں اے ایس آئی اسلم وڑائچ کے ساتھ ریلوے اسٹیشن کی عمارت سے نکل کر اسپتال کی جانب جا رہا تھا۔ راستے میں اے ایس آئی نے پوچھا ”ملک صاحب! آپ نے مقتولہ کی گٹھری میں سے برآمد ہونے والا لٹاف کھول کر نہیں پڑھا؟“

میں نے کہا ”یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ وہ گٹھری مقتولہ ہی کی ہے؟“

اس نے الجھن آمیز نظروں سے مجھے دیکھا ”کیا اب بھی یہ ثابت ہونا باقی ہے؟“

”اب تک کیا ثابت ہوا ہے؟“ میرا لہجہ بنیدگی میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ گڑبڑا گیا، جلدی سے بولا ”اب تک یہ ثابت ہوا ہے کہ مقتولہ کو فدا حسین گھیر گھار کر اپنے کوارٹر میں لے گیا تھا۔ وہاں اس نے لڑکی سے دست درازی کی اور زیادتی کرنے کی کوشش کی۔ لڑکی کسی طرح اس کے ہاتھوں سے بچ نکلی اور دریا کے کناروں جھاڑیوں کی طرف آنکلی۔ فدا حسین نے اس کا تعاقب کیا۔ اسے قابو کرنے کے بعد اس پر تشدد کے پہاڑ توڑے پھر اسے بے بس کر کے اپنی ہوس کی آگ بجھائی۔ ازاں بعد اسے دریا کے کنارے ڈال کر دفن پکڑا دیا۔“

میں نے پوری توجہ سے اس کی تفصیلی بات سنی اور کہا ”مائی یگ اے ایس آئی! تمہارے تجزیے میں بہت سے جھول ہیں۔ ابھی تمہیں ایک طویل ٹریننگ کی ضرورت ہے۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولا ”اب آپ اس تھانے میں آ گئے ہیں تو انشاء اللہ میری ٹریننگ بھی مکمل ہو جائے گی۔“

اے ایس آئی اسلم وڑائچ میں یہ خوبی میں نے دیکھی تھی کہ اس میں سیکھنے کی بے انتہا صلاحیت تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں تکبر اور بے جا غور نامی کوئی چیز نہیں پائی جاتی تھی۔ مجھے

”یہ کام تو میں سب سے پہلے کرتا ہوں جناب۔“

کے ساتھ میری منگنی کر دی تھی لیکن میں ابا کی وفات کے بعد اپنی ماں کے ساتھ فرار ہوئی تھی۔ اس موقع پر عارف علی کا رویہ میرے لیے حیرت انگیز تھا۔ وہ میرے تحفظ میں میاں ظلیل سے ٹکرانے کے بجائے اس کے آگے گزرنے لگا۔ مجھے عارف علی پر شدید غصہ آیا لیکن میں بے بس تھی۔ بہر حال میاں ظلیل نے عارف علی کو صبح تک سوچنے کا موقع دیا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ صبح دوبارہ آئے گا۔ اگر عارف علی اس کی خواہش کے مطابق مجھے طلاق دینے پر تیار ہو گیا تو ٹھیک ہے ورنہ ہم روہ مصیبتیں نازل کر دے گا اور مجھے زبردستی چھین کر لے جائے گا۔

امی جان! آپ میری داستان المہنہ کی جتنی طور پر خون کے آنسو رو رہی ہوں گی لیکن میں اپنا دکھ آپ کے سامنے نہ روؤں تو یہ زخمی دلی چیر کر کے دکھاؤں۔ میاں ظلیل کے جانے کے بعد میں نے عارف علی پر اپنا غصہ اتارا۔

”تم کیسے مرد اور عارف۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا ”میاں ظلیل تمہاری غیرت پر ہاتھ ڈال رہا تھا اور تم اس کے سامنے گڑ گڑا رہے تھے۔“

وہ جڑ بڑھو کر بولا ”میں اسے کس کام لے رہا تھا شاداں! اگر میں میاں ظلیل کے سامنے زیادہ اڑ دکھاتا تو معاملہ خراب ہو جاتا۔ وہ اس گاؤں کا مستقبل کا چوہدری ہے۔ وہ زور زبردستی سے بھی تمہیں چھین سکتا ہے پھر ایک بات اور بھی ہے۔“

”وہ کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔
عارف علی نے بتایا ”دراصل یہ مکان میں نے میاں ظلیل سے خریدا ہے۔ رقم میں نے ادا کر دی ہے۔ بس لکھت پڑھت باقی ہے۔ اگر وہ مکان کا قبضہ دے دے انکاری ہوگا تو میری رقم ڈوب جائے گی۔“

”تو تمہیں اپنی عزت سے زیادہ اس رقم کے ڈوبنے کا خطرہ ہے جو تم اس مکان کی خریداری کے سلسلے میں میری جان کے دشمن اور میری عزت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑنے والے شخص کے لیے ہو چکے ہو؟“ میرے لہجے میں تلخی کھلی ہوئی تھی۔

”تم بدگمان نہ ہو شاداں!“ وہ لجاجت آمیز انداز میں بولا ”دراصل میں چاہتا ہوں کہ سانپ بھی مر جائے اور لالھی بھی نہ ٹوٹے۔ میں اپنی رقم بھی بچانا چاہتا ہوں اور میاں ظلیل سے پیچھا بھی چھڑانا چاہتا ہوں لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ تو کیا کروں۔“

”میری مانو تو رات کے اندھیرے میں ہم یہاں سے نکل چلتے ہیں“ میں نے تجویز پیش کی

”رقم ڈوبتی ہے تو ڈوب جائے عزت سے بڑی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ میں میاں ظلیل کو تم سے زیادہ اچھی طرح جانتی ہوں۔ تم طاقت میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ صبح آئے گا تو سب کچھ روند کر چلا جائے گا۔ ممکن ہے تمہاری رقم تو ڈوبنے سے بچ جائے لیکن وہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔ وہ ایک طویل عرصے سے میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اس پر مجھے حاصل کرنے کی ضد سوار ہے۔ اگر تم نے اس کے راستے میں رکاوٹ بننے کی کوشش کی تو وہ زبردستی مجھے چھین لے گا۔“

”ایسا کچھ نہیں ہوگا شاداں!“ عارف علی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”میں اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ تم صبح کا انتظار کرو۔ کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔“

میں نے کہا ”عارف! میاں ظلیل سمجھنے والی بوئی نہیں ہے۔ اگر اس پر کسی بات کا اثر ہوتا تو ہم یہ گاؤں چھوڑ کر کیوں چوروں کی طرح چھپتے پھرتے۔ ہماری جی جانی زندگی برباد ہوگئی۔“
”تم دل چھوٹا نہ کرو۔“ عارف علی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”میں سوچ رہا ہوں۔ میاں ظلیل سے پیچھا چھڑانے کی کوئی نہ کوئی سبیل نکل ہی آئے گی۔“

عارف علی کے لہجے کا کھوکھلا پن مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ میاں ظلیل کے سامنے چند لمحے بھی نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ میاں ظلیل اپنی بد معاشی اور دھونس دھاندلی کے زور پر عارف کو یا تو طلاق دینے پر مجبور کر دیتا یا پھر اسے قتل کر کے زبردستی مجھے اٹھا لے جاتا۔ اسے ایسا کرنے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا تھا۔ وہ نگلن دال کا زمینی خدا تھا۔ سب جانتے تھے کہ اس نے اپنے پالتو غنڈوں کے ذریعے لیاقت محمود کو موت کے گھاٹ اتارا تھا لیکن کوئی اس کے خلاف زبان کھولنے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد عارف علی تو اطمینان سے لمبی تان کے سو گیا لیکن میں بے قراری سے بستر پر کر دٹیں بد لے لگی۔ یہ ٹھیک ہے کہ عارف کو نیند بہت پیاری تھی اور وہ بہت جلدی سونے کا عادی تھا لیکن ہمیں جو حالات پیش تھے ان کے پیش نظر عارف علی کا مطمئن انداز میں سو جانا مجھے عجیب سا لگا۔

میں آدھی رات تک بے چین رہی اور میاں ظلیل کے بارے میں سوچتی رہی۔ میری بے قراری آسمان کو چھونے لگی تو میں نے اٹھ کر صحن میں نہلنا شروع کر دیا۔ عارف علی گھوڑے بچ کر بے خبر سو رہا تھا۔ اس کے خراٹے کمرے میں گونج رہے تھے۔ اس کی بے لگاری پر مجھے حیرت ہوئی۔ میں صحن میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی کہ بیرونی دروازے کے باہر مجھے دو آدمیوں کے

اور عارف علی مولانا کے سامنے گواہوں کی موجودگی میں مجھے طلاق دے دے گا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد مجھے میاں خلیل کے قبضے میں ہی جانا تھا۔

جب مجھے حالات کی سنگین کا احساس ہوا تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں صحن سے اندر کمرے میں آئی جہاں عارف علی خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔ مجھے تباہی کے گڑھے میں دھکیلنے والا شخص کتنی سکون بھری نیند سو رہا تھا۔ میرا دماغ سلگ اٹھا اور پورے وجود میں انگارے سے بھر گئے۔ میرے جی میں آئی کہ اس بے غیرت شخص کا گلا گونٹ دوں لیکن پھر میں نے اپنے جذبات پر قابو پایا اور پوری توجہ یہ سوچنے پر لگا دی کہ مجھے کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ میں صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے پہلے ان درندہ صفت انسانوں سے بہت دور چلی جانا چاہتی تھی۔

میں نے تمام حالات پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد اپنے استعمال کی چند ضروری چیزیں ایک گٹھری میں باندھیں اور دبے قدموں کمرے سے نکل آئی۔ صحن میں ایک دیوار کے ساتھ لکڑی کی سیڑھی رکھی ہوئی تھی۔ میں اس سیڑھی کے ذریعے چھت پر پہنچ گئی۔ مکان کی چھت زیادہ اونچی نہیں تھی اور اگر اونچی ہوتی بھی تو میں اس وقت کوئی پروانہ کرتی۔ وہ رات میری عزت پر بہت بھاری تھی۔ میں مکان کے پچھواڑے پر آہستگی کود گئی۔ میری خوش قسمتی تھی کہ وہاں سوکھے چارے کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع تھا اس لیے میں کسی قسم کی چوٹ سے محفوظ رہی۔ مکان کے کچھ حصے میں تاحیہ نگاہ کھیتوں کا وسیع سلسلہ پھیلا ہوا تھا، میں چونکا نظروں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے تیزی سے کھیتوں میں داخل ہو گئی۔ اس وقت کھیتوں میں قد آدم فصل کھڑی تھی اس لیے مجھے خود کو چھپانے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔

شاداں نے اپنے خط میں یہ تمام واقعات بے ربط اور انتہائی شکستہ انداز میں تحریر کئے تھے۔ میں نے آپ کی سہولت اور آسانی کے لیے انہیں کہانی کے رنگ میں آپ کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔ جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوئی، میں نے بعد میں معلوم ہونے والے حالات کی روشنی میں کمی و بیشی بھی کی ہے اس خط ہی سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ اس مقتول کا ہم شاداں تھا اور وہ ایک ستم نصیب لڑکی تھی۔ خط کے اختتامی حصے میں شاداں نے تحریر کیا تھا۔

”امی جان! میں کھیتوں کے اندر بے سمت سفر کر رہی تھی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کدھر جا رہی ہوں۔ بس میری پہلی اور آخری خواہش یہی تھی کہ میں میاں خلیل کی پہنچ سے جلد از جلد دور نکل جاؤں۔ ویسے مجھے ایک بات کا یقین تھا کہ صبح ہونے سے قبل میری گم شدگی کا راز فاش

باتیں کرنے کی آواز آئی۔ وہ دھیمی آواز میں بول رہے تھے۔ میں تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر دروازے کے پاس آئی اور کان لگا کر ان کی باتیں سننے لگی۔ موضوع گفتگو میں ہی تھی۔

ایک شخص اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا ”نیکے! اہم تو یہاں دروازے پر پہرہ دے رہے ہیں۔ کہیں یہ ہنسوں کا جوڑا کسی دوسرے راستے سے نہ نکل جائے۔ اگر یہ کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تو میاں جی ہماری ہڈیوں کا سرہ بنا ڈالیں گے۔“

”تو بھی بھلا ہے جھوڑے۔“ نیکے نامی شخص نے اپنے ساتھی سے کہا ”یہ کہیں نہیں جائیں گے۔ دیکھو ان کی اولاد اس وقت گہری نیند کے مزے لے رہا ہوگا۔“

عارف علی کا اپنا تاں لگا تھا اور وہ عارف کو چوان کے نام سے مشہور تھا۔ جھوڑے نے نیکے سے کہا ”یار تو سی کمال کی باتیں کرتا ہے۔ صبح میاں خلیل اس کی بیوی چھیننے والا ہے۔ وہ بھلا مزے کی نیند کس طرح سو سکتا ہے؟“

”یار لگتا ہے تم پر ای بات سے واقف نہیں ہو۔“ نیکے نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا ”یہ تو سب ڈراما ہے۔“

”کیسا ڈراما نیکے؟“

”نیکے نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا ”یار مک مل چکا ہے۔ صبح سین پارٹ ہو جائے گا۔“

”میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا نیکے؟“ جھوڑے کے لہجے سے انھیں بے عزت مزے تھے۔

نیکے نے کہا ”میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔“

پھر نیکے کی زبانی جو انکشاف ہوا اسے سن کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ساتواں آسمان ایک ساتھ مجھ پر آن گرے ہوں۔ میں ایک سوچی سمجھی سازش کا شکار ہوئی تھی۔ عارف علی مراں نیل کے ہاتھوں بک چکا تھا۔ درحقیقت عارف علی نے مجھے چار ہزار روپے میں میاں خلیل کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ دو ہزار وہ وصول کر چکا تھا اور دو ہزار میاں خلیل اسے اس وقت دیتا جب وہ مجھے طلاق دے دیتا۔ عارف علی نے میاں خلیل کے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے مجھ سے شادی کی تھی اور اسی کے ایما پر مجھے گھر گھار کر لگن وال لے آیا تھا۔ اب میری سمجھ میں یہ بات بھی آ گئی تھی کہ وہ اب تک مجھ سے گریز کیوں کرتا آیا تھا۔ واضح رہے کہ اب تک ہمارے درمیان ازدواجی تعلقات قائم نہیں ہوئے تھے۔ عارف علی میرا قانونی شوہر اور مجازی خدا تھا لیکن وہ میاں خلیل کے اشاروں پر تاج رہا تھا۔ نیکے کی زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ صبح میاں خلیل ایک مولانا کا ساتھ لے کر آئے گا

نہیں ہوگا۔ میں رات کے اندھیرے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔

صبح ہوئی، میں بھوکی پیاسی اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھی۔ تھکن سے میرا برا حال تھا لیکن میں قدم روکنا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے کھیتوں سے ذرا فاصلے پر ریلوے لائن نظر آئی اور میں اس لائن کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ دوپہر سے پہلے پہلے میں ایک چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن کے نزدیک پہنچ گئی۔ میں نے ایک دکان سے کاغذ لفافہ اور قلم خرید اور پلٹ فارم کی سکی بیچ کر آپ کو خط لکھنا شروع کر دیا۔ امی جان! میں نے اب تک خود کو پیش آنے والے حالات کی تفصیل لکھ دی ہے۔ مجھے جسم ہی موقع ملا، میں اس خط کو ڈاک کے حوالے کر دوں گی۔ میں نہیں جانتی آگے میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جو بھی ٹرین اس اسٹیشن پر آ کر رکے گی، میں اس میں سوار ہو جاؤں گی۔ جب مجھے یقین ہو جائے گا کہ کوئی میرے تعاقب میں نہیں ہے اور میں میاں ظلیل کی بیچ سے بہت دور نکل آئی ہوں تو آپ کو اپنے ٹھکانے سے آگاہ کر دوں گی۔ پھر آپ میرے پاس چلی آنا۔ آپ بھی سوچتی ہوں گی کہ میں نے ان مشکل حالات میں آپ کے پاس آنے کا فیصلہ کیوں نہیں کیا تو آپ کی تسلی کے لیے بتاتی چلوں کہ میں آپ کو کسی نئی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ میاں ظلیل کی خباثت اور شیطنت۔ ہم سب اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ محراب پور میں آپ کے ٹھکانے سے آگاہ ہے اور وہ میری اس بات میں سب سے پہلے وہیں آئے گے۔ اب میں اس خط کو بند کر رہی ہوں۔ زندگی رہی اور خدا کو منظور ہو، تو ہمیں نہ کہیں ملاقات ہو ہی جائے گی۔

آپ کی بد نصیب بیٹی۔ ”ناداں۔“

میں نے ایک گہری سانس لی اور خط کو تہ کر کے دوبارہ لفافے میں لپیٹ دیا۔ مقتولہ شاداں کے خط نے میرے لیے بہت آسانیاں پیدا کر دی تھیں لیکن بہت سی الجھنیں ابھی تسلیاتی تھیں۔ شاداں نے مذکورہ خط ایک چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن پر بیٹھ کر لکھا تھا اور گاڑی میں بیٹھنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ یہ ہمارے علاقے کا ریلوے اسٹیشن تو نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ وہ اس اسٹیشن پر شام کے وقت دکھائی دی تھی جب کہ یہ خط دوپہر میں لکھا گیا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ شاداں ٹرین کے ذریعے ہمارے علاقے میں پہنچی تھی۔ اور یہ بات بھی ثابت تھی کہ وہ اس دوران میں لفافہ پوسٹ نہیں کر سکی تھی۔ ہمارے علاقے کے ریلوے اسٹیشن پر اترنے کی کیا وجوہات تھیں؟ وہ خط کو ڈاک کے حوالے کرنے کے بجائے مارجو کے ہاتھ کیوں بھیجنا چاہتی تھی؟ اسے معلوم تھا کہ محراب

پور یہاں سے قریب ہی ہے؟ یہ تمام سوالات اور ان جیسے کئی دوسرے سوالات میرے ذہن میں سر اٹھارہ تھے جن کے جوابات درست میرے پاس نہیں تھے۔

بہر حال، تسلی بخش بات یہ تھی کہ میں شاداں کے پس منظر سے اچھی طرح آگاہ ہو چکا تھا۔ اب دریا کی نزدیکی جھاز یوں میں اس کے ساتھ جو اندوہ ناک واقعہ پیش آیا تھا اس کے مجرم کو پکڑنا اور کیفر کردار تک پہنچانا میری ذمہ داری تھی۔ جب تک صابر حسین، نکٹ بابو فدا حسین کو گرفتار کر کے نہ لے آتا، اس سلسلے میں پیش رفت ممکن نہیں تھی۔ فدا حسین میرا خصوصی ٹارگٹ تھا۔ البتہ ایک بات مجھے تذبذب میں ڈال رہی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ اسپتال میں شاداں نے کراہنے کے دوران میں ”میاں ظلیل“ کا نام پکارا تھا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ یا تو میاں ظلیل کی دہشت شاداں کے حواس کو پوری طرح اپنے شکنجے میں کے ہوئے تھی یا پھر اس کی عصمت کو تار تار کرنے میں میاں ظلیل پیش پیش رہا تھا۔ اگر اس تھوڑی پر سوچا جاتا تو پھر یہ بات واضح تھی کہ میاں ظلیل شاداں کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا تھا لیکن فدا حسین کے کوارٹر سے جو شاہد میں نے اکٹھے کیے تھے وہ کوئی اور کہانی سنار ہے تھے۔ معاملات بری طرح الجھ گئے تھے۔

جب کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئی تو میں نے فی الحال اس سلسلے میں زیادہ سرکھپانا مناسب نہ سمجھا اور اپنا دھیان بنانے کے لیے دوسرے کاموں میں خود کو مصروف کر لیا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور صابر حسین کی واپسی تک میں سوائے انتظار کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اگرچہ یہ انتظار میرے لیے خاصا تکلیف دہ تھا۔

☆☆☆

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میرے اندازوں کے عین مطابق تھی۔

مقتولہ شاداں کی موت کا سبب وہ ذہنی و جذباتی صدمہ تھا جو اس کی روح کو لہو لہان کر کے پہنچایا گیا تھا ورنہ اس کے جسم پر ایسی کوئی خطرناک چوٹ نہیں آئی تھی جو اس کی موت کی وجہ بن سکتی۔ جس شخص نے بھی اس پر جسی تشدد کیا تھا وہی درحقیقت اس کی موت کا ذمہ دار تھا۔ باب الفاظ دیگر اس کا قاتل تھا۔ شاداں کے طبی معائنے اور لیبارٹری ٹیسٹ کے مطابق اسے قتل کی رات بارہ اور ایک بجے کے درمیان بے آہود کیا گیا تھا اور اس گہرے صدمے سے غمگین ہو کر وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں شاداں کی موت کا وقت پانچ اور چھ بجے کے درمیان بتایا گیا تھا۔ بالوں کے کیمیائی تجزیے کے بعد یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ نکٹ بابو فدا حسین کے

کوارٹر سے ملنے والے زمانہ بال شاداں ہی کے تھے۔ ان شواہد کی روشنی میں فدا حسین کی ذات پوری طرح مشکوک ہو چکی تھی۔

ایک بات میرے ذہن کو ابھار رہی تھی اور وہ یہ کہ مقتولہ شاداں کو بے ہوشی کی حالت میں جھاڑیوں میں پایا جانا چاہیے تھا جب کہ وہ دریا کے کنارے پڑی ہوئی ملی تھی۔ اس سوال کا تسلی بخش جواب فدا حسین ہی دے سکتا تھا۔

مقتولہ کی ماں کا پتا مجھے معلوم ہو چکا تھا۔ میں نے اگلے روز حوالدار کرم داد کو موضع خراب پور روانہ کر دیا تا کہ وہ شاداں کی ماں کو اس سانحے کی اطلاع دے سکے اور لاش کی وصولی کے لیے وہ اس کے وارثوں میں سے کسی کو ساتھ لاسکے۔

اسی شام اے۔ بی۔ آئی صابر حسین ہمارے مطلوبہ مشکوک بندے کو اپنے ساتھ لے آیا۔ فدا حسین بہت بوکھلایا۔ اٹھا۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے چھبیس اور ستائیس سال کے درمیان لگایا۔ وہ ایک صحت مند اور خوب صورت جوان تھا۔ اس کے چہرے سے مکاری یا عیاری ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ مجموعی طور پر وہ ایک شریف انسان نظر آتا تھا لیکن میں اس وقت اسے کسی اور ہی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے خلاف میرے پاس اتنا مواد جمع ہو چکا تھا کہ میں اسے اس کے ظاہری تاثر کی بنیاد پر نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

وہ میرے سامنے کھڑا پریشان نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کہا ”فدا حسین! اگر تم میرے سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب دے گے تو میں بیٹھے نظر آؤ گے۔ یہ صورت دیگر پہلے میں تمہیں کھڑا کر دوں گا اور اس کے بعد چھت سے الٹا لٹکا دوں گا۔“

”میری سمجھ میں نہیں آرہا یہ سب ہو کیا رہا ہے؟“ وہ گنت آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے اسے اس کی گرفتاری کے پس منظر سے آگاہ کیا پھر پوچھا ”سچ بتاؤ اس واقعہ کی تاریخ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا جناب!“

میں نے فدا حسین کے پیچھے کھڑے ہوئے ایک نئے ہینڈ کینشیل کو اشارہ کیا۔ اس نے کارل سے کھینچ کر فدا حسین کو الف سیدھا کھڑا کر دیا۔

”تو اس کا مطلب ہے تمہیں عزت داس نہیں آئی“ میں نے کڑک کر کہا ”اب تمہارے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جس کے تم مستحق ہو۔“

وہ کپکپاتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں نے کیا جرم کیا ہے جو آپ مجھے گرفتار کر کے یہاں لے آئے ہیں؟“

ہینڈ کینشیل نے اس کی گردن پر ایک زوردار جھانپڑ رسید کرتے ہوئے کہا ”اوئے ملک صاحب سے سوال کرتا ہے۔ جانتا نہیں ہے وہ ڈے تھانے دار ہیں۔“

میں نے پوچھا ”فدا حسین! تم نے شاداں کو برباد کرنے کے بعد اسے کیوں قتل کیا۔ کیا دشمنی تھی تمہاری اس سے؟“

”میں نے کسی کو قتل نہیں کیا جناب!“ وہ روئی صورت بنا کر بولا۔ ”میں تو کسی شاداں کو جانتا بھی نہیں۔“

”اوئے بہن کے یاز تم شاداں کو نہیں جانتے“ ہینڈ کینشیل نے اس کی کمر پر ایک زوردار لات بجائی ”جس کو پلیٹ فارم سے گھیر کر لائے تھے وہ تمہاری کیا گنتی تھی؟“

فدا حسین نے خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھا لیکن بظاہر مضبوط لہجے میں بولا ”آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ کوئی لڑکی میرے کوارٹر میں آئی تھی۔ آپ کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔“

”اب تم ہمیں قانون سکھاؤ گے باگز بلے کی اولاد“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ”یہ ہے تمہاری ماں کا ختم ثبوت۔ نو دیکھو۔“

میں نے اس کے سامنے میز پر شاداں کی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں اور اس کی گٹھڑی سے برآمد ہونے والی اشیاء مع جھاڑیوں سے ملنے والا دوپٹا اور سینڈل رکھتے ہوئے خوں خوار لہجے میں استفسار کیا ”ان چیزوں کو پہچانتے ہو؟“

وہ لرزیدہ لہجے میں بولا ”آپ کو یہ سب کچھ کہاں ہے ملا؟“

”اوئے سور کے ختم“ پھر سوال کرتا ہے ”ہینڈ کینشیل نے اس کے منہ پر زانے دار تھپڑ

رسید کرتے ہوئے کہا ”میں نے یہ چیزیں تمہارے کوارٹر سے برآمد کی ہیں اور..... وہاں سے برآمد کی ہیں جہاں تو مقتولہ شاداں کی عزت خراب کر رہا تھا۔“

وہ تھر تھر کاپنے لگا ”جناب! آپ میری بات کا یقین کریں۔ میں نے نہ تو کسی کو قتل کیا ہے اور نہ ہی کسی کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ میں اپنی بے گناہی کے لیے بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ یقینی طور پر آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“

اس کی حالت خاصی دگرگوں ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے پھٹے ہوئے ہونٹ سے اپنے والے خون کو آستین سے صاف کیا اور شکستہ لہجے میں بولا "مائی باپ" مجھے معاف کر دیں۔ میری سات نسلوں کو توبہ اب میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔"

میں نے کہا "یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔"

اس نے تھوک نکل کر حلق تر کیا پھر بولا "آپ اپنے سپاہی کو باہر بھیج دیں۔ مجھے اس سے بہت ڈر لگ رہا ہے" اس نے دہشت ناک نظروں سے ہیڈ کانسٹیبل کی جانب دیکھا جس نے تھوڑی دیر پہلے اس کی اچھی خاصی دھنالی کی تھی۔

میں نے کہا "اگر تم نے سچ بولنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو پھر اس کی ضرورت نہیں پڑے گی" پھر میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو اشارہ کیا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے کمرے سے باہر چلا جائے۔ ہیڈ کانسٹیبل نے اک اچھتی سی نگاہ فدا حسین پر ڈالی اور لمبے ڈگ بھرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں فدا حسین کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"ہاں بھئی فدا حسین! تم شاداں کو اپنے کوارٹر میں کیوں لے کر آئے تھے؟"

وہ بولا "میں نے پھیری لگانے والے موجو کو شاداں سے بات چیت کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ شاداں کو دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ یا تو وہ گھر سے بھاگی ہوئی کوئی لڑکی ہے یا پھر اپنے ساتھی مسافر سے بچھڑ گئی ہے۔ میں نے موجو سے اس کے بارے میں پوچھا تو پتا چلا کہ وہ لڑکی موجو کے ہاتھ کوئی لفافہ کہیں بھجوانا چاہتی ہے۔"

"اور تم نے وہ لفافہ پہنچانے کا فیصلہ کر لیا؟" وہ سانس لینے کو رکا تو میں نے سوال داغ دیا۔

وہ تامل کرتے ہوئے بولا "آپ یقین کریں تھا نے دار صاحب! میری نیت میں کوئی کھوٹ

نہیں تھا میں واقعی اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔"

"اور پھر تم اس کے پاس ویننگ روم میں پہنچ گئے؟"

"جی ہاں" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "اور وہاں پہنچ کر مجھے اس لڑکی سے ہمدردی

پیدا ہو گئی۔"

"کیا پہلی ہی ملاقات میں اس نے تمہیں اپنے حالات سے آگاہ کر دیا تھا؟"

وہ بولا "میں اس کی صورت دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ کوئی مصیبت زدہ لڑکی ہے۔ میں نے

اسے تھوڑا سا کرید تو میرا اندازہ درست ثابت ہو۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ صبح اس کا لفافہ ڈاک

"اوئے غلط فہمی کے گھوڑے!" میں نے گرج دار آواز میں کہا۔ "شرافت سے اپنے جرم کا اقرار کر لو ورنہ ہمیں زبان کھلوانے کے ایک سو ایک طریقے آتے ہیں۔"

"ملک صاحب! آپ اس گورجو کو میرے حوالے کریں" ہیڈ کانسٹیبل نے فدا حسین کو کڑے تیوروں سے گھورا "میں دو منٹ میں اس کا باجا بجا دوں گا" پھر یہ کسی ریکارڈر کی طرح بجنے لگے گا۔"

"کیا خیال ہے فدا حسین؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "مجھ سے تعاون کرنے کو تیار ہو یا تمہیں ہیڈ کانسٹیبل کے حوالے کر دوں؟"

فدا حسین کی سمجھ میں یہ بات تو آ گئی تھی کہ اس کی جان چھوٹنا ممکن نہیں تھا۔ وہ باری باری ہیڈ کانسٹیبل کو سراپا یہ نظروں سے دیکھنے کے بعد بولا "جناب! اگر میں آپ کو سچ سب کچھ بتا دوں تو آپ مجھے معاف کر دیں گے نا؟"

"میں مجرموں سے ایسا وعدہ نہیں کرتا" میں نے سخت لہجے میں کہا "پہلے تم اپنا سچ اگلو۔ اس کو سننے کے بعد میں کوئی فیصلہ کروں گا۔"

"جناب! ایک بات کا تو آپ یقین کر لیں کہ میں نے شاداں کو قتل نہیں کیا۔ بس میں....."

"ہاں ہاں بولو....." میں نے کہا "میں تمہاری بات پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔ ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ میں جھوٹ نہیں سنوں گا۔ میں اس بات کی تصدیق کر چکا ہوں کہ ویننگ روم سے تم مقتولہ شاداں کو بہلا پھسلا کر اپنے کوارٹر میں لائے تھے۔"

"جی ہاں تھا نے دار صاحب!" وہ تعاون پر آمادہ نظر آنے لگا "بے شک مجھ سے یہ غلطی ہوئی تھی۔"

میں نے پوچھا "وہ کتنی دیر تمہارے کوارٹر میں رکی تھی؟"

"وہ تھوڑی دیر کے بعد چلی گئی تھی۔"

میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔ اس نے لاتوں اور گھونسوں سے فدا حسین کی ٹھکانی شروع کر دی۔ جب فدا حسین کا حال بے حال ہو گیا تو میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو ہاتھ روکنے کا اشارہ کیا۔ وہ رک گیا۔

فدا حسین بری طرح ہانپ رہا تھا اور اس کی ناک ومنہ سے خون بہنے لگا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے غضب ناک لہجے میں کہا۔

"میں نے کہا تھا نا اب میں جھوٹ نہیں سنوں گا؟"

میں ڈال دوں گا یا اگر وہ کہے گی تو خود جا کر محراب پور پہنچا دوں گا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں محراب پور یہاں سے کون سا زیادہ دور ہے۔ میں اپنی سائیکل پر آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ سکتا تھا۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ یوں رات کے وقت دیننگ روم میں بیٹھے رہنا اس کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ وہ کسی مجبوری کے تحت اس اسٹیشن پر اتر گئی تھی ورنہ اسے جانا تو آگے تھا۔ میں نے کہا 'اب تو کوئی ٹرین صبح ہی اس اسٹیشن پر آئے گی۔ اگر وہ چاہے تو میرے کوارٹر میں رات بسر کر لے۔ وہ میری تجویز پر پس و پیش کرنے لگی۔ میں نے قسم کھا کر اسے یقین دلایا کہ وہ میری چھوٹی بہن کی طرح ہے۔ اسے میرے کوارٹر میں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد وہ میرے ساتھ چلے پر رضامند ہو گئی۔ دلوں کے حال اللہ جانتا ہے۔

یہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے دل میں اس کے لیے کسی قسم کی کوئی برائی نہیں تھی۔"

فدا حسین کا طریق وضاحتی بیان ختم ہوا تو میں نے پوچھا "اس کے بعد تم شاداں کو اپنے کوارٹر میں لے آئے۔"

اس نے اثبات میں جواب دیا، میں نے سوال کیا "فدا حسین! تم چھڑے چھانٹ ہو۔ اپنے کوارٹر میں تنہا رہتے ہو۔ اس کے علاوہ وہ بھی تم ایک جوان اور نامحرم لڑکی کو رات گزارنے کے لیے اپنے کوارٹر میں لے آئے۔ کیا تم نے یہ نہیں سن رکھا کہ جس مرد اور عورت کہیں تنہا ہوں تو ان کے درمیان شیطان آ جاتا ہے جو انہیں بہکانے کی پوری کوشش کرتا ہے۔"

وہ ایک لٹھ سوچنے کے بعد بولا "سن تو رکھا تھا لیکن چونکہ اسے چھوٹی بہن بنا کر لایا تھا اس لیے اطمینان تھا کہ شیطان میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا لیکن۔"

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر سر جھکا دیا۔ میں سمجھا کہ اب وہ اپنے جرم کا اقرار کرنے والا ہے۔ یہ لمحات بڑے سنسنی خیز تھے۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد فدا حسین نے سر اٹھایا۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوا۔

"واقعی کسی نے سچ ہی کہا ہے نامحرم عورت اور مرد کو تنہائی میں اکٹھا نہیں رہنا چاہیے۔ ہمارے درمیان بھی اس رات شیطان آ گیا تھا مگر خدا کا شکر ہے اس نے میری عزت رکھ لی۔ اس سے پہلے کہ میں شیطان کا آلہ کار بن جاتا دروازے پر دستک ہونے لگی تھی۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر سوالیہ نظروں سے فدا حسین کی جانب دیکھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "میں نے شاداں کو اپنے کوارٹر کے اندر دینی کمرے میں

سونے کے لیے چھوڑ دیا تھا جب کہ میں خود بیرونی کمرے میں سونے کے لیے لیٹ گیا تھا لیکن اس رات میری آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ میں مسلسل جاگ رہا تھا اور بار بار کمرے میں بدل رہا تھا۔ کوئی ساڑھے گیارہ بجے رات مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں آپ سے باہر ہو گیا ہوں۔ مجھے چاروں جانب شاداں کا سراپا نظر آ رہا تھا اور دل میں ایک ہی خواہش چل رہی تھی کہ پہلی فرصت میں اسے حاصل کر لوں۔ چنانچہ میری ایسی حالت کیوں ہو گئی تھی۔ اب سوچتا ہوں تو سمجھ میں یہی آتا ہے کہ شیطان نے میرے حواس پر قبضہ جمالیا تھا۔ میں بار بار اپنے ذہن میں ابھرنے والے منفی خیالات کو جھٹکنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن مجھے ایسا کرنے میں کامیابی نہیں حاصل ہو رہی تھی۔ میں نے خود کو نعلت ملامت بھی کی کہ میں شاداں کو چھوٹی بہن بنا کر اپنے کوارٹر میں لایا ہوں اس لیے مجھ اس کے بارے میں ایسے بے ہودہ جذبات نہیں رکھنا چاہئیں لیکن میرا ذہن اس وقت کوئی دلیل کوئی نصیحت ماننے کو تیار نہیں تھا۔ شیطان میرے دل و دماغ پر قابض تھا اور چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ ہم صرف ایک عورت اور مرد ہیں۔ اس کے سوا ہمارے درمیان کوئی رشتہ نہیں۔ آخر کار میں شیطان کے ہاتھوں بے بس ہو کر اپنے بستر سے اٹھا اور اندرونی کمرے میں پہنچ گیا۔"

"اور تم نے شاداں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کی کوشش کی؟"

"ہاں" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "میں نے کوشش تو یہی کی تھی لیکن میرے خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس نے میری عزت رکھ لی۔"

میں نے پوچھا "تم نے دروازے پر کسی دستک کا ذکر کیا تھا؟"

"میں اسی طرف آ رہا ہوں" وہ سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا "میں نے اندرونی کمرے میں پہنچ کر بستر پر لیٹی ہوئی شاداں کو اپنی بانہوں میں دوچٹا چاہا۔ وہ اس وقت کچی نیند میں تھی ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی اور خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"بھائی!" اس کے ہونٹ لرز اٹھے "یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

اس وقت مجھے پر شیطان پوری طرح سوار تھا، میں نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اسے اپنی آغوش میں بھرنے کی کوشش کی تو وہ تڑپ کر بستر سے نیچے اتر آئی۔

ہوئی آگ کو بجھالوں۔ وہ اپنے آپ کو میری گرفت سے چھڑانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ اسی کوشش کے دوران میں وہ ایک مرتبہ کمرے کے فرش پر گر بھی گئی۔

یہی وقت تھا جب مجھے بیرونی دروازے پر دستک سنائی دی۔ میں خوف زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پھر مجھے ہوش آ گیا جیسے ہی میرے حواس بجا ہوئے، میں شاداں کو وہیں فرش پر چھوڑ کر بیرونی دروازے پر آیا اور سخت لہجے میں پوچھا۔

”کون ہے؟“

باہر سے آواز آئی ”میں شاداں کا گھر والا ہوں۔ وہ مجھ سے ناراض ہو کر گھر سے چلی آئی ہے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ وہ اس کوارٹر میں ہے۔ اسے باہر بھیج دیا مجھے اندر آنے دو۔ میں خود اسے منانے جاؤں گا۔“

میں نے پوچھا ”تہا رانا نام کیا ہے؟“

”میرا نام عارف علی ہے۔“

میں تذبذب میں مبتلا ہوا۔ میرے ذہن میں ایک خیال تو یہ آیا کہ میں شاداں کی وہاں موجودگی ہی سے انکار کر دوں۔ اس کے شوہر سے کہہ دوں کہ یہاں کوئی شاداں وادان نہیں ہے لیکن پھر مجھے میرے ضمیر نے ملامت کی۔ میں اپنے آپ بتا رہا تھا کہ باہر سے شاداں کے شوہر نے کہا۔

”بہتر ہوگا کہ تم مجھے اندر آنے دو۔ وہ مجھ سے بری طرح ناراض ہے اس لیے باہر نہیں آئے گی۔ میں خود اسے منانے کی کوشش کرتا ہوں۔“

میں نے کہا ”تم باہر ہی ٹھہرو۔ میں اسے بلاتا ہوں۔“

میں نے اندر آ کر شاداں سے اس کے شوہر کی آمد کا ذکر کیا۔ مارے انداز کے میں اس کی طرف پیٹھ پھیرے کھڑا تھا۔ اس نے صرف ایک سوال کیا اور وہ بھی سپاٹ لہجے میں۔

”کیا عارف علی اکیلا آیا ہے؟“

میں نے کہا ”میں نے دیکھا نہیں۔ وہ باہر گلی میں کھڑا ہے۔ تم خود معلوم کر لو۔“

اس نے جلدی جلدی اپنا حلیہ درست کیا اور بیرونی دروازے پر پہنچ کر باہر کھڑے ہوئے عارف علی سے باتیں کرنے لگی۔ مجھے اپنی حرکتوں پر اس قدر شرمندگی کا احساس ہوا رہا تھا کہ میں اندرونی کمرے کے دروازے پر ہی کھڑا رہا۔ اس وقت میں چونک پڑا جب شاداں دروازہ کھول کر

کوارٹر سے باہر نکل گئی۔

میں پتھر کا بت بنا کافی دیر تک وہیں کھڑا رہا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھے سکتے ہو گیا ہو۔ جب میں سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو میں نے اپنے حالات پر غور کیا۔ مجھ سے جو حرکت سرزد ہوئی تھی اس کے بارے میں سوچ سوچ کر میں زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ شاداں وہاں سے جا چکی تھی۔ وہ لڑکی جسے میں نے اپنی چھوٹی بہن بنایا تھا مجھ سے میری زیادتی کا گلہ شکوہ کئے بغیر اپنے شوہر کے ساتھ چلی گئی تھی۔

وہ پوری رات میں نے جاگتے ہوئے پشیمانی کے آنسو بہاتے ہوئے گزار دی۔ صبح ہونے سے پہلے ہی میں تیز بخار میں پھنک رہا تھا۔ میں نے اپنے ساتھی بنگلہ کلرک سے اپنی ماں کی خرابی طبیعت کا بہانہ کیا اور فی الفور اپنے گاؤں روانہ ہو گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں کچھ دیر اور یہاں رک گیا تو میرا دماغ پھٹ جائے گا۔“

فدا حسین اپنی صفائی پیش کر چکا تو اس کا چہرہ آنسوؤں سے دھل کر تروتازہ ہو چکا تھا۔ اس کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے اپنے بیان میں جھوٹ کی ملاوٹ نہیں کی ہوگی۔ میں اس کی طرف سے خاصی حد تک مطمئن ہو گیا تھا لیکن میں نے اپنا اطمینان اس پر ظاہر نہیں ہونے دیا اور پوچھا۔

”فدا حسین! کیا تم شاداں کے شوہر عارف علی کو دوبارہ دیکھو گے تو پہچان لو گے؟“

”نہیں جناب!“ اس نے نفی میں سر ہلایا ”میں نے تو اس کی صورت ہی نہیں دیکھی تھی۔“

”کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے“ میں نے سوال کیا ”شاداں نے عارف علی کے ساتھ جانے سے پہلے کسی قسم کی گفتگو کی تھی؟“

یہ سوال میں نے اس لیے کیا تھا کہ شاداں کے خط سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے شوہر کی اصلیت سے واقف ہو چکی تھی۔ ایسی صورت میں وہ ایک دلال شوہر کے ساتھ جانے کا فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا یا تو عارف علی نے اسے اپنی باتوں سے رام کر لیا تھا یا پھر وہ فدا حسین کے رویے کے باعث جلد از جلد اس کوارٹر سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔ اس کی ایک جانب کنواں تھا اور دوسری طرف کھائی۔ شاید اس نے کھائی میں گرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

فدا حسین نے جواب دیا ”جناب! اس وقت میری وہ حالت ہو رہی تھی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں نہیں جانتا ان دونوں میاں بیوی کے درمیان کیا باتیں ہوئی تھیں؟“

”کیا تم نے شاداں کے جانے کے بعد باہر نکل کر یہ دیکھنے کی کوشش کی تھی کہ وہ دونوں کس طرف گئے تھے؟“

”نہیں جناب!“ اس نے بتایا ”اس وقت میری سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کی ساری صلاحیتیں سلب ہو کر رہ گئی تھیں۔“

میں نے اسے شاداں کو جھاڑیوں میں پیش آنے والے واقع اور اس کی موت کے بارے میں بتایا اور کہا ”فدا حسین! اگرچہ تم نے میرے ساتھ بہت تعاون کیا ہے لیکن میں تمہارے بیان کی تصدیق کئے بغیر تمہیں چھوڑ نہیں سکتا۔ تمہیں کچھ روز تک ہمارا ”مہمان“ رہنا ہوگا۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے“ وہ مفاہانہ انداز میں بولا ”شاید اسی طرح میرے ضمیر میں بھی ہوئی پچاس نکل سکے۔ کچھ نہ کچھ سزا تو مجھے ملنا ہی چاہیے۔ میں بہ خوشی حوالات میں رہنے کو تیار ہوں۔“

اس وقت ایک کانٹیل نے آ کر اطلاع دی کہ حوالدار کرم داد محراب پور سے واپس آ گیا ہے۔ میں نے اسے فوراً طور پر اندر کمرے میں بلا لیا۔ کرم داد کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر عورت اور ایک ضعیف شخص بھی تھا۔ وہ ادھیڑ عمر عورت تھی طور پر مقتولہ شاداں کی ماں تھی جو اپنی بیٹی کی موت پر گریہ و زاری کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ آنے والا ضعیف شخص خاموش اور سنجیدہ تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس کا نام خدا بخش تھا اور وہ شاداں کا خالو تھا جب کہ شاداں کی ماں کا نام ظہور بی بی تھا۔

میں نے فدا حسین کو حوالدار کرم داد کے حوالے کیا اور خاص طور پر تاکید کر دی کہ اس کے آرام کا خیال رکھا جائے۔ حوالدار فدا حسین کو لے کر کمرے سے باہر نکل گیا تو میں مقتولہ شاداں کی ماں ظہور بی بی کی جانب متوجہ ہو گیا۔

شاداں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا تھا وہ میں نے مختصر طور پر ظہور بی بی اور خدا بخش کے گوش گزار کیا پھر میں نے شاداں کا خط پڑھ کر انہیں سنایا۔ پوری تفصیل سننے کے بعد ظہور بی بی دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اس نے زار و قطار روتے ہوئے ”آہوں“ سسکیوں اور پچپوں کے درمیان مجھے جو معلومات بہم پہنچائیں میں ان کا خلاصہ یہاں تحریر کر رہا ہوں۔ تاکہ آپ اس کیس کو بہ آسانی سمجھ سکیں۔

☆☆☆

شاداں کا تعلق نگن وال کے ایک غریب گھرانے سے تھا۔ اس کا باپ ماسٹر فیروز دین گاؤں کے اسکول میں پڑھاتا تھا۔ شاداں فیروز دین اور ظہور بی بی کی اکلوتی اولاد تھی لیکن وہ اس قدر خوب صورت و حسین و جمیل تھی کہ پورے گاؤں میں اس کے جمال کا چرچا تھا۔

شاداں نے جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو ماسٹر فیروز دین نے گاؤں ہی کے ایک گھروے جوان لیاقت محمود سے اس کا رشتہ طے کر دیا تاکہ دوسروں کے منہ بند ہو جائیں۔ شاداں خود بھی لیاقت محمود کو دل و جان سے پسند کرتی تھی۔ اس منگنی کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ گاؤں کے چوہدری دڈے میاں فضل حسین کے اکلوتے اوباش ”فرزند ارجمند“ میاں خلیل کی نظر شاداں پر پڑ گئی اور وہ اس کے حسن کا دیوانہ ہو گیا۔ دڈے میاں خود بھی کچھ کم نہیں تھا لیکن جب سے اسے فالج ہوا تھا میاں خلیل نے من مانی شروع کر دی تھی۔ وہ نگن وال کا مستقبل کا چوہدری تھا اور غیر نصابی سرگرمیوں میں اپنے باپ سے بھی دو چار ہاتھ آگے کی چیز تھا۔

شاداں کی ایک جھلک نے میاں خلیل کو بے خود کر دیا تھا۔ وہ ایک ہی گاؤں میں رہتے تھے۔ ممکن ہے میاں خلیل نے اسے پہلے بھی کئی بار دیکھا ہو بلکہ یقینی طور پر دیکھا ہوگا لیکن وہ کہتے ہیں نا ہر کام کو ایک کا خاص وقت مقرر ہوتا ہے۔ قصہ مختصر میاں خلیل ایک روز شاداں کے باپ فیروز دین سے ملا۔ فیروز دین اس وقت اسکول سے نکل کر گھر کی جانب آ رہا تھا۔

میاں خلیل نے ماسٹر فیروز دین کو سلام کیا اور کہا ”ماسٹر جی! آپ سے ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔ امید ہے آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔“

ماسٹر فیروز میاں خلیل کے کردار اور کرتوتوں سے اچھی طرح آگاہ تھا اور وہ اس کی چوہدرانہ قوت سے بھی واقف تھا لہذا نرم لہجے میں اس نے پوچھا۔

”چوہدری صاحب! آپ کو مجھ غریب سے ایسا کیا کام پڑ گیا ہے؟“

”ماسٹر جی!“ میاں خلیل نے اپنے مزاج کے خلاف معتدل لہجے میں کہا۔ ”دراصل مجھے

آپ کی بیٹی شاداں پسند آ گئی ہے۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

ماسٹر فیروز دین کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی بچھونے اسے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ میاں خلیل کی خود سری سے واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ پہلے سے شادی شدہ بھی تھا اور اس کے دو بچے بھی تھے۔

ماسٹر نے لہجے کو نرم رکھتے ہوئے کہا۔ ”میاں صاحب! آپ تو ماشاء اللہ خیر سے شادی شدہ ہیں اور

آپ کے دو بچے بھی ہیں۔“

”اسلام میں چار شادیوں کی گنجائش ہے۔“ میاں خلیل نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

میری تو صرف ایک ہی بیوی ہے۔“

”لیکن.....“ الفاظ ماسٹر فیروز دین کے حلق میں اٹک رہے تھے۔

”لیکن کیا ماسٹر جی! ذرا کھل کر بولیں۔“

”میں شاداں کا رشتہ طے کر چکا ہوں۔“ فیروز دین نے کہا۔

”رشتہ ٹوٹ بھی سکتا ہے۔“

”نہیں“ فیروز دین نے نفی میں گردن کو جھٹکا دیا ”میں زبان دے چکا ہوں۔ اب یہ رشتہ

نہیں ٹوٹے گا۔“

میاں خلیل کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھر آئے جیسے وہ اندرونی غصے کے ضبط کرنے

کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ پھنکارتے ہوئے بولا ”اچھی طرح سوچ لو ماسٹر جی۔ مجھے کوئی جلدی

نہیں ہے۔“

فیروز نے ہمت کر کے کہا ”چوہدری صاحب! آپ مجھ پر رحم کریں۔“

”میں تو آپ کا اپنا سر بنانے کی بات کر رہا ہوں“ میاں خلیل طنز پر لہجے میں بولا ”اور آپ

مجھ سے رحم کی بھیک مانگ رہے ہیں۔“

ماسٹر فیروز دین نے کہا ”آپ اب بھیک سمجھ کر ہی مجھے دے دیں۔ شاداں کا خیال دل

سے نکال دیں۔ اب وہ کسی اور سے منسوب ہو چکی ہے۔“

”جو چیز ہمارے دل میں سا جالی ہے ماسٹر، ہم اسے حاصل کر کے ہی چھوڑتے ہیں میاں

خلیل تمام لحاظ و مردت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے لو فرما انداز میں بولا۔

ماسٹر قدرے نرم لہجے میں بولا ”شاداں کوئی چیز نہیں ہے۔ ٹے چوہدری صاحب! وہ ایک

جیتا جاگتا انسان ہے اور اس کی ایک جیتے جاگتے انسان سے منگنی ہو چکی ہے۔“

”اور یہ منگنی ٹوٹ بھی نہیں سکتی؟“ میاں خلیل نے تسخیرانہ انداز میں کہا۔

”جی کچھ ایسی ہی صورت حال ہے۔“

”بس تو پھر ٹھیک ہے“ میاں خلیل نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ”اگر یہ منگنی ٹوٹ سکتی تو پھر

شاداں کے منگیتر کو ٹوٹنا پڑے گا۔“

میاں خلیل یہ دھمکی دے کر چلا گیا اور ماسٹر فیروز دین اپنے ذہن میں فکروں اور اندیشوں کو

بسا کر گھر آ گیا۔ وہ اتنا زیادہ پریشان ہو گیا تھا کہ رات بھر سو بھی نہ سکا۔ دوسری صبح اس کے ذہن

میں پلنے والے خدشات نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔ بیری والے کھوہ کے نزدیک لیاقت محمود کی

کئی پھٹی لاش پائی گئی تھی۔ اسے کلہاڑیوں کے وار کر کے بڑی بے دردی سے ہلاک کیا گیا تھا۔

ماسٹر بخوبی جانتا تھا کہ اس قتل کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا۔

شاداں رخصتی سے پہلے ہی اجڑ کر رہ گئی تھی۔

چند روز بعد میاں خلیل بہ نفس نفیس ماسٹر فیروز دین کے گھر آیا اور افساناک لہجے میں بولا

ماسٹر جی! مجھے لیاقت کی موت کا بڑا دکھ ہے لیکن شاید قدرت کو یہی منظور تھا۔“

وہ بظاہر ماسٹر فیروز دین کے پاس تعزیت کے لیے آیا تھا لیکن درحقیقت وہ اس کے زخموں

پر نمک پاشی کر رہا تھا۔ ماسٹر فیروز دین نے دل شکستہ لہجے میں کہا ”ہاں چوہدری صاحب شاید خدا کو

یوں ہی منظور تھا۔“

میاں خلیل فی الفور مطلب پر آ گیا۔ ”اب کیا ارادہ ہے ماسٹر جی؟“

ماسٹر فیروز دین نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا ”میاں خلیل نے بھوٹے انداز

میں مسکراتے ہوئے کہا ”اب تو شاداں کی نسبت ختم ہو گئی ہے۔ آپ کے پاس کوئی اور اعتراض تو

نہیں ہوگا۔“

ماسٹر فیروز دین نے فی الحال اس سے الجھنا مناسب نہ سمجھا اور کہا ”میں سوچ کر جواب دوں

گا۔“

درحقیقت اس نے میاں خلیل کو قہری طور پر ٹال دیا تھا۔

میاں خلیل چلا گیا تو ماسٹر کی بیوی ظہور بی بی اس کے پیچھے پڑ گئی کہ چوہدری ان کے گھر

کیوں آیا تھا۔ شاداں اس وقت گھر میں موجود نہیں تھی۔ ماسٹر فیروز دین نے اپنی بیوی کو صورت

حال سے آگاہ کر دیا۔ پوری بات سن کر وہ بھی پریشان ہو گئی۔

”اب کیا ہوگا شاداں کے ابا! وہ فکر مندی سے بولی۔

”جو خدا کو منظور ہوگا وہی ہوگا۔“ ماسٹر فیروز دین نے آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا

”یہ مجھے چھوٹے چوہدری کے ارادے ٹھیک دکھائی نہیں دیتے“ رب خیر کرے۔“

دونوں میاں بیوی دیر تک سر جوڑے اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش میں مصروف

رہے لیکن امید کی کوئی کرن دکھائی نہ دی۔

اب میاں خلیل نے آئے روز ماسٹر فیروز دین کے گھر کے پھیرے بھرنا شروع کر دیے۔

ایک دن ماسٹر کی ہمت جواب دے گئی اور اس نے صاف صاف کہہ دیا ”میاں جی! میں کسی بھی

صورت شاداں کا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں نہیں دے سکتا۔ آپ یہ روز کی آمد و رفت بند کر دیں۔“

☆☆☆

میاں خلیل بھاری تن و توش کا مالک ایک بدمعاش صورت شخص تھا۔ اس نے بڑی بڑی موچیں رکھ چھوڑی تھیں اور روایتی چوہدریوں کی طرح خاصا رعب داب دلا لگتا تھا۔ وہ ایک آوارہ صورت اور مغرور انسان دکھائی دیتا تھا۔ اس نے عارف علی کو تسلی دی کہ وہ کسی قسم کی فکر نہ کرے۔

ظہور بی بی درحقیقت کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھی اور جیسے ہی اسے موقع ملا وہ شاداں کو ساتھ لے کر اپنی بہن فضیلت بیگم کے پاس محراب پور چلی آئی۔ خدا بخش اور فضیلت بیگم کو جب

اگر اسکے ساتھ کوئی زیادتی کی گئی تو وہ عدالت سے رجوع کرے گا۔

میں عارف علی کو لے کر دوسرے روز تھانے پہنچا اور اسے حوالات میں ڈال دیا۔ اس وقت رات ہو چکی تھی۔ میں دوسری صبح اس سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا۔

دوسری صبح میں تھانے پہنچا تو عارف علی کو اپنی گرفتاری کی وجہ معلوم ہو چکی تھی۔ میں نے اسے اپنے کمرے میں بلایا تو وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ میں نے اسے نظروں میں تولتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔

”بھگت سنگھ، اولاد! ہمیں تمہارے سارے کرتوتوں کا پتا چل گیا ہے۔ اب تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ اپنی زبان سے اپنے ہر جرم کا اقرار کر لو۔“

وہ انہیں باتیں سن کر نہ لگا۔ میں نے ایک خوفناک صورت خولدار کو اپنے کمرے میں بلایا اور اسے حکم دیا ”اس ماں کے یار نے منہ میں گھنگھنیاں ڈال رکھی ہیں۔ میں چاہتا ہوں یہ بولے اور فر فر بولے۔ اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔“

”آپ فکر ہی نہ کریں ملک صاحب!“ خوالدار نے عارف علی کو یوں دیکھا جیسے قسائی بکرے کو دیکھتا ہے ”میرے علاج سے تو گونگے بھی بولنے لگتے ہیں۔ اس کی ساری گھنگھنیاں تو میں دمنٹ میں نکال دوں گا۔“

تھوڑی دیر بعد ٹرائل روم کی طرف سے عارف کے بلانے کی آوازیں آنے لگیں پھر اس نے چیخا چلانا شروع کر دیا۔ ہم پولیس والے بے جانتہ د کے لیے خاصے بنام ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم عام طور پر بجا سختی کرتے ہیں۔ صبح و شام ہمارا مجرموں سے واسطہ رہتا ہے اور یہ لوگ سیدھے سادے شریف انسان نہیں ہوتے کہ ہم جو پوچھیں اس کا فوری طور پر ٹھیک ٹھیک جواب دے دیں۔ ان کی زبان کھلوانے کے لیے ہمیشہ ان کی تھوڑی بہت ”خاطر تواضع“ کرتا ہوتا ہے۔ ایک گھنٹے کے بعد عارف علی جلا و صورت خوالدار کی زیر نگرانی میرے کمرے میں آ گیا۔ پہلی ہی نظر میں میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ اندر سے ٹوٹ چکا تھا۔ خوالدار کے چہرے پر بھی دبا دبا جوش صاف نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”میں ملک صاحب بندہ تعاون کے لیے تیار ہے۔“

میں نے پوچھا ”کیا تم نے اس کے منہ کی گھنگھنیاں نکال دیں؟“

”بالکل جناب!“ وہ عجیب سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا ”میں تو اس کا اور بھی بہت

کچھ نکالنے والا تھا لیکن یہ جلد ہی راہ راست پر آ گیا۔ اب آپ پوچھ لیں جو پوچھنا ہے۔“ میں نے خوالدار کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور عارف علی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ اچانک میرے قدموں میں گر کر گر گڑا نے لگا ”تھانے دار صاحب! میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میں بالکل ہی بے قصور ہوں لیکن آپ اتنا یقین کر لیں کہ میں نے شاداں کو قتل نہیں کیا۔“

”بھڑا داں کا قاتل کون ہے۔“

”میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔“ وہ منت آمیز لہجے میں بولا۔ ”لیکن آپ وعدہ کریں کہ مجھے جیل جانے سے بچا لیں گے۔“

”میں مجرموں سے اس قسم کے وعدے نہیں کرتا۔“

میں نے سخت لہجے میں کہا ”اگر تم نے کوئی خطا کی ہے تو تمہیں اس کی سزا بھی ضرور ملے گی۔ البتہ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم نے تمام واقعات کی تفصیل مجھے ٹھیک ٹھیک بتادی تو میں تم پر ہلکی دفعہ لگاؤں گا اور تمہاری سزا کو کم سے کم کروانے کی کوشش کروں گا۔“

”یعنی آپ مجھے وعدہ معاف گواہ بنالیں گے؟“

”اگر تمہاری گواہی اس کیس میں مفید ثابت ہوئی تو میں اس سلسلے میں سوچوں گا۔“ میں نے کہا ”لیکن اس سے پہلے ضروری ہے کہ تم شاداں کو پیش آمدہ حالات کی وضاحت کرو۔“

چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے اپنے اور میاں ظلیل کا سارا کپا چٹھا کھول کر بیان کر دیا۔ عارف علی نے جو طویل بیان دیا، میں اس میں سے نہایت اہم واقعات کا یہاں ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

عارف علی جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، محراب پور کا رہنے والا تھا اور شاداں کے خالو خدا بخش کا پر دوسی بھی تھا۔ اس کا کوئی آگے پیچھے نہیں تھا اور وہ گھر میں تنہا ہی رہتا تھا۔ عارف علی دن بھر لاری اڈے سے سواریاں اٹھاتا اور محراب پور اور گردونواح کے دوسرے گاؤں تک پہنچا دیتا۔ تاہنگا بانی ہی اس کا ذریعہ روزگار تھا۔

کچھ عرصہ قبل وہ لاری اڈے پر واقع ایک دکان سے سگریٹ خرید رہا تھا کہ دو اجنبی اشخاص اس کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ سگریٹ کا پیکٹ لے کر اپنے تانگے کی جانب بڑھنے لگا تو ان میں سے ایک شخص نے پوچھا۔

”عارف علی تمہارا ہی نام ہے؟“

عارف علی نے کہا ”جی بندے کو ہی عارف علی کہتے ہیں۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“
 ”تم ہمیں کیسے پہچان سکتے ہو؟“ دوسرے شخص نے کہا ”ہم ادھر پہلی مرتبہ آئے ہیں۔“
 ”آئیں تا نگے میں بیٹھیں“ عارف علی نے خوش دالی سے کہا ”آپ جہاں کہیں گے میں
 چھوڑ دوں گا۔“

ان میں سے ایک نے کہا ”دراصل ہم تم سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں پتا
 چاہیے کہ تم اس اڈے پر اکیلے تا نگے والے ہو اس لیے سوچا پہلے تم ہی سے پوچھ لیا جائے۔“
 ”آپ کس قسم کی باتیں پوچھنا ہیں“ عارف علی نے سوالیہ نظروں سے اجنبی افراد کی طرف
 دیکھا۔ اس وقت تک وہ باتیں کرتے ہوئے عارف علی کے تا نگے کے قریب پہنچ چکے تھے۔
 ”ہم دو عورتوں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں“ ان میں سے دراز قامت شخص سے کہا
 ایک ادھیر عورت سے اور دوسری اس کے ساتھ انیس بیس سال کی ایک جوان لڑکی ہے۔ دراصل
 ہمیں انکی تلاش ہے۔ ہو سکتا ہے وہ تمہارے تا نگے میں بیٹھ کر کہیں گئی ہوں۔ ہم نے پکا پتا چلا لیا
 ہے وہ اسی لاری اڈے پر بس سے اتری تھیں۔“

عارف علی کا دھیان فی الفور اپنے پڑوسی خدا بخش کے مہمانوں کی طرف چلا گیا۔ ان اجنبی
 افراد نے ان عورتوں کا جو حلیہ بیان کیا تھا خدا بخش کی مہمان عورتیں اس طے پرفٹ بیٹھتی تھیں لیکن
 سر دست عارف نے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔

”کیوں کچھ یاد آ رہا ہے؟“ عارف علی کو خاموش دیکھتے ہی شخص نے پوچھا۔
 ”نہیں... عارف علی نے لکنت زدہ لہجے میں غیر ارادی طور پر انکار کر دیا اور پھر پوچھا
 ”آپ لوگ ان عورتوں کو کیوں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں؟“

دراز قامت شخص عارف علی کی ہچکچاہٹ سے شبک میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے کہا ”بہ بڑی
 خطرناک عورتیں ہیں۔ انہوں نے ہمارے چوہدری صاحب کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ہم انہیں
 واپس لنگن وال لے کر جائیں گے بس ایک بار وہ ہمیں نظر آ جائیں۔“

لنگن وال کے ذکر پر عارف علی کو یقین ہو گیا کہ ان افراد کو انہی عورتوں کی تلاش ہے جو خدا
 بخش کے گھر میں ٹھہری ہوئی تھیں کیونکہ خدا بخش نے ایک بار رواروی میں اسے بتایا تھا کہ اس کے
 گھر لنگن وال سے کچھ رشتے دار آئے ہوئے ہیں۔

عارف علی کو سوچ میں ڈوبا دیکھ کر ان افراد کا شک پختہ ہونے لگا۔ دراز قامت شخص نے کہا

”ہمارے چوہدری صاحب ادھر ہی ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ جو شخص ان عورتوں کے
 بارے میں کوئی اطلاع دے گا اسے اچھا خاصا انعام بھی دیا جائے گا۔“

عارف علی کے دل میں لالچ نے سر ابھارا اس نے جلدی سے پوچھا ”آپ کے چوہدری
 صاحب کس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں؟“

عارف علی کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے ان افراد کو یقین ہو گیا کہ وہ ان عورتوں کے بارے میں
 ضرور کچھ جانتا ہوگا۔ وہ اسے اپنے ساتھ میاں ظلیل کے پاس لے گئے جولاری اڈے پر ایک ہوٹل
 میں موجود تھا۔ اس کے بعد کا کام میاں ظلیل کے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ عارف علی نے اسے
 سب کچھ بتا دیا۔ میاں ظلیل نے عارف علی سے وعدہ کیا کہ اگر وہ شاداں کو یہاں سے نکال کر کسی
 طرح لنگن وال پہنچا دے تو وہ اسے چار ہزار روپے اور لنگن وال میں ایک مکان رہنے کو دے گا۔

عارف علی نے پوچھا ”اور شاداں کی ماں کا کیا ہوگا؟“

”وہ یہیں رہے گی“ میاں ظلیل نے کہا ”ساتھ لے جا کر ہم نے اس کا کیا اچار ڈالنا ہے۔ مجھے
 صرف شاداں کی ضرورت ہے۔ بولو تو میرا کام کرنے کو تیار ہو یا میں کسی اور شخص کا انتظام کر دوں؟“

اس کے ساتھ ہی میاں ظلیل نے دو ہزار کے نوٹ گن کر عارف علی کے سامنے پھینک دیے اور بولا
 ”یہ ایڈوانس رکھ لو۔ باقی کے دو ہزار لنگن وال پہنچ کر ملیں گے“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا
 ”اور لنگن وال میں ایک مکان بھی تمہارا منتظر ہے۔ اگر سودا منظور ہو تو یہ رقم اٹھا لو ورنہ میں کچھ اور سوچوں۔“

اس زمانے میں دو ہزار روپے اچھی خاصی رقم ہوتی تھی۔ عارف علی دن بھر تا نگے کی مزدوری
 سے بہ مشکل پانچ چھ روپے کما پاتا تھا۔ اسے تو یہ یک وقت ایک سال کی مزدوری مل رہی تھی اور اتنی
 ہی رقم کام کی تکمیل پر ملنا تھی۔ لنگن وال والا مکان اس کے علاوہ تھا۔ عارف علی لالچ میں آ گیا اور
 اس نے میاں ظلیل کا کام کرنے کی ہامی بھر لی تاہم اس کام کے لیے اس نے کچھ مہلت مانگی
 جو میاں ظلیل نے اسے فراہم کر دی۔ عارف علی کے ذہن میں شاداں سے جتنی شادی رچانے کا
 خیال آیا۔ اس طرح وہ بہ آسانی اسے محراب پور سے نکال کر کہیں بھی لے جا سکتا تھا۔ میاں ظلیل
 نے اس کے منصوبے کی تعریف کی اور تاکید کر دی کہ وہ اس کی ”امانت“ میں ”خیانت“ نہیں کرے
 گا۔ اس دوران میں عارف علی نے ایک چکر لنگن وال کا لگایا اور وہ مکان دیکھ آیا جو میاں ظلیل نے
 اسے دینے کا وعدہ کیا تھا۔

معاملات طے پاتے ہی عارف علی نے شاداں سے شادی کی عملی کوشش شروع کر دی۔

نے اسے بتایا کہ اس کا تانگا ادھر دریا کے قریب کھڑا ہے۔ وہ اسے ساتھ لے کر جھاڑیوں کی طرف آ گیا۔ میاں خلیل تھوڑا فاصلہ رکھ کر ان کا تعاقب کرتا رہا اور جھاڑیوں میں پہنچ کر وہ کھل کر سامنے آ گیا۔

میاں خلیل کو اپنے سامنے دیکھ کر شاداں کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ ایک بار پھر اپنے شوہر کی سازش کا شکار ہو گئی تھی۔ اس نے جان بچانے کے لیے جھاڑیوں میں دوڑنا شروع کر دیا لیکن وہ ان دونوں کے مقابلے میں زیادہ دور تک نہ جاسکی۔ میاں خلیل نے عارف علی کی مدد سے اسے دبوچ لیا۔ شاداں نے نفرت سے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ شاداں کی اس حرکت نے میاں خلیل کے حواس گم کر دیے اور وہ بے دروغی اسے مارنے لگا۔ شاداں پٹ رہی تھی اور چیخا چلاتا چاہتی تھی لیکن میاں خلیل نے ایک ہاتھ سے اس کا منہ دبا رکھا تھا پھر عارف علی بھی شاداں کو قابو کرنے میں اس کی مدد کر رہا تھا۔ شاداں جیسی نرم و نازک لڑکی میاں خلیل جیسے گیندے کی قوت کے سامنے زیادہ دیر نہ ٹھہر سکی اور جلد ہی اس نے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے۔

عارف علی نے گھبراہٹ آمیز لہجے میں کہا ”کہیں یہ مروت نہیں گئی؟“
میاں خلیل پر ایک جنون طاری تھا۔ اس نے ہوس ناک انداز میں کہا ”مگر یہ مروت بھی گئی ہے تو میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔“

”ایک مردے کا کیا کریں گے، میاں جی!“

”میں نے اس کو حاصل کرنے کے لیے اپنا بہت سا راز وقت اور پیسا خرچ کیا ہے“ میاں خلیل نے زمین پر بے سدھ پڑی ہوئی شاداں کو گھورتے ہوئے کہا ”میں ایک ایک پائی اس سے وصول کروں گا۔ میں اس کو مرے نہیں دوں گا۔“

پھر وہ جھک کر شاداں کی نبض ٹٹولنے لگا اور جنونی انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے بولا ”میں نے کہا تھا نا، یہ نہیں مرے گی۔ نہیں مرے گی۔ جب تک کہ میں اپنے ارمان پورے نہیں کر لوں گا۔ آج میں اس کو بتاؤں گا کہ میاں خلیل سے دور بھاگنے کا کیا انجام ہوتا ہے!“

اس کے بعد وہ کسی بھوکے بھیڑیے کی طرح شاداں پر ٹوٹ پڑا۔ اس رات میاں خلیل نے شاداں کے ساتھ جو کچھ بھی کیا، تہذیب اس کے بیان کی اجازت نہیں دیتی۔ جب میاں خلیل کے ذہن سے جنس کا بھوت اترتا تو اجڑی پجڑی شاداں تصویر عبرت بنی جھاڑیوں میں فرش زمین پر نیم

دوسری جانب ظہور بی بی بھی یہی چاہتی تھی کہ شاداں جلد از جلد کسی محفوظ پناہ گاہ میں چلی جائے چنانچہ نہایت سادگی سے ان کی شادی ہو گئی۔

اس کے بعد پیش آنے والے واقعات شاداں کے خط میں بالتفصیل درج تھے۔ عارف علی نے مزید بتایا کہ شاداں کے فرار کے بعد میاں خلیل نے عارف علی کے ساتھ اس کو ڈھونڈنے کی کوشش کی اور پوچھتے پوچھتے وہ آخر کار اس اسٹیشن پر آن پہنچے یہاں سے شاداں ٹرین میں سوار ہوئی تھی۔ میاں خلیل کو معلوم تھا کہ وہ ٹرین کس کس اسٹیشن پر رکتی ہوئی آخر کار کہاں تک جائے گی۔ انہوں نے بذریعہ بس سفر کیا اور راستے میں آنے والے ہر اسٹیشن پر پہنچ کر وہ شاداں کے بارے میں معلومات حاصل کرتے۔ آخر ان کی کوشش کامیاب ہوئی اور ہمارے علاقے کے ریلوے اسٹیشن سے انہیں پتا چل گیا کہ شاداں وہاں اتری تھی۔ اس وقت رات خاصی گزر چکی تھی۔ بار بار بسیں بدلتے ہوئے انہوں نے یہاں پہنچنے میں خاصا وقت لگا دیا تھا۔

اب عارف علی نے میاں خلیل کے منصوبے پر عمل کیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ عارف علی شاداں کو پھسلا بہلا کر فدا حسین کے کوارٹر سے باہر نکالے گا۔ اس دوران میں میاں خلیل ایک طرف اندھیرے میں کھڑا رہے گا۔ اتفاق سے اسٹیشن پر مطلوب ملے گا۔ اس کی ملاقات ہو گئی تھی جو کسی کام سے باہر نکلا ہوا تھا۔ اسی کی زبانی انہیں معلوم ہوا کہ شاداں فدا حسین کے کوارٹر میں ہے۔ انہوں نے مطلوب علی کو بتایا تھا کہ شاداں عارف علی کی بیوی ہے جو کھڑے روٹھ کر چلی آئی تھی اور وہ اسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں پہنچے تھے۔

اس کا مطلب یہی تھا کہ مطلوب علی شاداں کے معاملے سے تھوڑی بہت واقف رکھتا تھا اسی لیے وہ میرے سوالوں سے ہلکلا گیا تھا اور تھانے آ کر بیان لکھوانے سے گریز نظر آ رہا تھا۔ تاہم بتانا چلوں کہ اس نے جو بیان دیا تھا اس میں ایسا کوئی ذکر نہیں تھا۔

عارف علی نے فدا حسین کے کوارٹر پر دستک دی۔ شاداں دروازے پر آئی تو عارف علی نے اسے بتایا کہ وہ اس کے اچانک چلے آنے سے بہت پریشان ہو گیا تھا اور اسے تلاش کرتا ہوا یہاں تک پہنچ گیا تھا۔ شاداں نے میاں خلیل کے حوالے سے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا تو عارف علی نے کہا کہ وہ میاں خلیل پر لعنت بھیج کر واپس آ گیا ہے اور اب اسے ساتھ لے کر واپس مخراب پور جائے گا۔ شاداں تھوڑی دیر پہلے جن حالات سے گزر چکی تھی ان کے پیش نظر وہ ایک لمحہ بھی اس کوارٹر میں رکنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ تن بہ تقدیر عارف علی کے ساتھ ہوئی۔ عارف علی

میں نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا اور حوالدار کو بلا کر اسے ہدایت کی وہ عارف علی کو لے جا کر حوالات میں بند کر دے۔

وہ جانے لگا تو میں نے کہا ”اور سنو“ وہ رک گیا، میں نے کہا ”فدا حسین نکٹ ہابو کو میرے کمرے میں بھیج دو۔“

تھوڑی دیر کے بعد فدا حسین میرے سامنے حاضر تھا۔ میں نے اسے سخت تنبیہ کے بعد جانے کی اجازت دے دی اور ساتھ یہ بھی تاکید کر دی کہ وہ علاقے سے باہر جانے سے قبل تھانے میں ضرور اطلاع کرے۔ وہ میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے چلا گیا۔

دوسرے روز میں نے عدالت میں جا کر میاں ظلیل کے وارنٹ گرفتاری حاصل کئے اور پولیس کی بھاری جمیعت کے ساتھ نگن وال روانہ ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ میاں ظلیل بہ آسانی گرفتاری نہیں دے گا لیکن میں تھانے سے یہ فیصلہ کر کے نکلا تھا کہ اسے ہتھکڑی لگا کر ہی واپس لوٹوں گا۔

میری توقع کے مطابق میاں ظلیل نے گرفتاری دینے میں کافی پس و پیش کیا۔ پہلے تو وہ مجھے رشوت پیش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے مجھے ایک لاکھ روپے تک دینے کی کوشش کی۔ اس زمانے میں ایک لاکھ روپے بہت بڑی رقم ہوتی تھی۔ جب میں نوٹوں کی جھلک دیکھ کر بھی نہ پھسلا تو اس نے مجھے اپنے تعلقات کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں لیکن میں نے کسی دھونس دھمکی کی پروا کئے بغیر میاں ظلیل کو حوالات کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا۔

تیسرے روز میں نے چالان تیار کر کے میاں ظلیل اور عارف علی کو عدالت میں پیش کر دیا۔ عارف علی وعدہ معاف گواہ کے طور پر عدالت میں حاضر ہوا تھا۔

عارف علی کا جرم اتنا چھوٹا نہیں تھا کہ اسے سزا کے بغیر چھوڑ دیا جاتا لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ واقعی اندر سے بدل گیا تھا اس لیے میں نے اسے سلطانی گواہ بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کوئی دو سال تک سیشن کورٹ میں میاں ظلیل کا مقدمہ چلتا رہا اور آخر کار اسے سزائے موت سنائی گئی۔ اس نے سیشن کورٹ کے فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کی لیکن میں نے کس اتنا مضبوط بنایا تھا کہ اس کی پخت کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا تھا۔ ہائی کورٹ نے سیشن کورٹ کے فیصلے کی توثیق کر دی۔

کچھ عرصے کے بعد میاں ظلیل کو پھانسی ہو گئی۔

خس کم جہاں پاک..... میاں ظلیل نے اپنی زندگی میں جو کچھ بویا تھا اس کا پھل اسے مل

جاں پڑی تھی..... اور اسے برباد کرنے والا شیطان اپنے ساتھی کے ہمراہ جا چکا تھا۔

☆☆☆

عارف علی نے اپنا بیان ختم کیا تو میں غصے سے بے قابو ہو گیا اور بے اختیار میں نے ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر رسید کیا ”حرام زادے کتے کے بچے“ نطفہ ناقصدیق! اس بے غیرتی کے ظاہرے سے پہلے تمہیں موت کیوں نہ آگئی؟“

وہ تھڑکھڑکاپنے لگا ”آپ نے تو وعدہ کیا تھا مجھ سے نری کا برتاؤ کریں گے“ وہ ہلکیا یا۔

”نری کا برتاؤ!“ میں نے اس کے دوسرے گال پر طمانچہ رسید کرتے ہوئے کہا ”تم میرے نزدیک سب سے سزا کے مستحق ہو۔ میرا بس چلے تو میں تمہیں.....“

میں نے دانستہ بلکہ ادھورا جھوڑ دیا۔ عارف علی آنسوؤں سے روتے ہوئے منت سماجت کرنے لگا ”ملک صاحب! مجھے معاف کر دیں۔ اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ میں نادانستی میں میاں ظلیل کا آگے بڑھ گیا تھا۔ اصل قصور وار وہی ہے۔ مجھ سے غلطی ہوئی جو میں نے اس کی بات مان لی۔ اب میں کبھی ایسی حرکت نہیں کروں گا۔ آپ جیسا کہیں گے میں عدالت میں وہی بیان دوں گا۔ میں کورٹ میں میاں ظلیل کے ایک ایک ظلم کی داستان سناؤں گا۔“

میں نے اس کی جانب حقارت سے دیکھا ”بچو یہ تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا۔ وہ تمہاری ماں کا خصم میاں ظلیل تو سیدھا پھانسی کے تختے پر پہنچے گا اور بچ تم بھی نہیں سو گے۔“

وہ میرے قدموں میں گر پڑا اور میری ٹانگوں کو تھامتے ہوئے ”ملک صاحب! میں واقعی اندر سے بدل گیا ہوں۔ آپ آزما کر دیکھ لیں۔ شاداں تو واپس نہیں آتی لیکن میں سلطانی گواہ بن کر اس کی عزت کے لئیرے اور اس کے قاتل کو قمار واقعی سزا دلوائے میں قانون کی مدد کر سکتا ہوں۔ میں خود بھی میاں ظلیل کو عبرت ناک انجام سے دوچار ہونے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”چل اٹھ کر سیدھا کھڑا ہوجا“ میں نے پاؤں جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے بارے میں میں بعد میں فیصلہ کروں گا۔“

وہ کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ باندھتے ہوئے التجا آمیز لہجے میں بولا ”ملک صاحب! اگر آپ نے مجھے سدھرنے کا ایک موقع دے دیا تو میں تمام عمر آپ کا یہ احسان یاد رکھوں گا۔“

گیا لیکن آج تک ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ شاداں کو آخر کن گناہوں کی سزا ملی تھی۔
شاید وہ جہنم جہنم کی ستم نصیب لڑکی تھی یا اس میں قدرت کی کوئی مصلحت پوشیدہ تھی۔

ایک اور بات کافی عرصے تک میرے ذہن کو الجھاتی رہی۔ شاداں جھاڑیوں کے بیچ میں
سے دریا کے کنارے تک کیسے پہنچی تھی۔ وہ خود اپنے قدموں سے چل کر وہاں تک آئی تھی یا یہ بھی
قدرت کا کوئی سربستہ راز تھا۔

میرا خیال ہے اس سارے معاملے میں دستِ قدرت پوری طرح کارفرما رہا تھا۔ قدرت کی
سلطنتوں کو سمجھنا انسانی عقل کے بس کی بات نہیں ہے۔



اردو ڈاٹ کام